حصہ اول

# بابری مسجد

## شہادت سے قبل

ترتیب و ادارۃ : محمد عارف اقبال

# بابری مسجد

شہادت سے قبل ــــ شہادت کے بعد

## ایک تاریخی دستاویز

حصّہ اوّل

شہادت سے قبل

مرتب

محمد عارف اقبال

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
NEW DELHI-110002

نام کتاب

# بابری مسجد

شہادت سے قبل......شہادت کے بعد
ایک تاریخی دستاویز

حصہ اوّل بابری مسجد: شہادت سے قبل

مرتب: محمد عارف اقبال

کمپوزنگ: عبدالتواب

صفحات: ۲۰+۳۸۲ قیمت:۔/۱۰۰ روپئے

طبع اوّل: مارچ ۲۰۰۴ء

باہتمام
محمد ناصر خان

Name of the book
**BABRI MASJID**
*(Shahadat se Qabl... Shahadat ke Baad)*
Part I: *Shahadat se Qabl*
Compiled by: **Muhammad Arif Iqbal**

Ist Edition: **March, 2004**
Pages: 382 + 20 Size: 23x36/16
**Price: Rs. 100/-**

## ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دینی و دیگر علمی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور طباعت سے قبل کوشش کی جاتی ہے کہ نشاندہی کی جانے والی جملہ غلطیوں کی بروقت تصحیح کر دی جائے۔ اس کے باوجود غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔

لہٰذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ علمی غلطیوں کی نشاندہی کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں تعاون کرنا صدقہ جاریہ کے مترادف ہے۔ (ادارہ)

ناشر

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

**FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.**

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House Darya Ganj, N. Delhi-2
Phones: 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-6

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# پیغامِ ربّانی

□□ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا
جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے
اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے؟
ایسے لوگ تو اس قابل ہیں کہ
ان میں قدم ہی نہ رکھیں اور ان میں داخل بھی ہوں
تو ڈرتے ہوئے
ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور
آخرت میں عذابِ عظیم۔ (سورہ البقرہ: 114)

□□ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

(سورہ الحج: 78)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# عرضِ ناشر

مسلمانانِ ہند کو تقسیمِ ہند 1947ء کے بعد جس بڑے سانحہ سے گزرنا پڑا وہ سانحہ شہید بابری مسجد ہے جس کی شہادت تخریب پسند ہندوؤں کے ہاتھوں 6ر دسمبر 1992ء کو ہوئی۔

ملک کی موجودہ نازک صورت حال میں ''رام مندر'' بنانے کی تیاری آر. ایس. ایس. اور اس کی ذیلی دہشت پسند تنظیموں کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ خدشہ ہے کہ کہیں پورے ملک میں گجرات سانحہ کا اعادہ نہ کر دیا جائے۔ ایسے پر تشدد ماحول میں نئی نسل ایک دوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اب نام نہاد قیادت بھی بے بسی، اضطراب اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ نئی نسل کو جہاں اسلام کی تاریخ نہیں معلوم ہے وہاں خود اس ملک مین بابری مسجد کی شہادت اور اس کی تاریخ سے بھی نئی نسل تقریباً نابلد ہے۔ لہٰذا اس کے خام ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات جنم لے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ بابری مسجد تنازع کے تاریخی پس منظر اور اس مسئلہ کے تناظر میں رونما ہونے والے خونریز واقعات اور حالات پر مشتمل ایسی کتاب ہو جس کے مطالعہ سے ایک نشست میں مسئلہ کے تاریخی پس منظر اور نوعیت سے ہر شخص واقف ہو سکے۔ نیز ہندتو کے عزائم بھی ان پر آشکارہ ہو جائیں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس موضوع پر کتاب کی دو جلدیں آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ عصرِ حاضر کے اس سلگتے ہوئے موضوع پر اس انتخاب میں آپ کو اس مسئلہ کے ہر پہلو پر مفید معلومات حاصل ہوں گی۔ تمام معلومات مستند ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے کتاب کی دونوں جلدیں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں کتاب کے مرتب کے لئے خصوصی طور پر دعاء گو ہوں جن کی انتھک محنت سے ''شہید بابری مسجد'' کے موضوع پر دونوں جلدیں شائع کی جا سکیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین

—— محمد ناصر خان

# ترتیب

## بابری مسجد: شہادت سے قبل — شہادت کے بعد

باب: 2 ہندتو: حقیقت، تاریخ، عزائم



باب: 3 بابری مسجد کی تاریخی حیثیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ مرتب

ہمارے ملک کے دستور میں ہندوستان کو ایک سیکولر ملک قرار دیا گیا ہے اور سیکولرزم کی تعریف میں ہمارے قانون داں اور دانشور جس مفہوم کو بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے، اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ملک میں ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ملک میں سیکڑوں مساجد ایسی ہیں جن میں مکمل طور پر مسلمانوں کو عبادت کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ اس کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ مساجد تاریخی ہیں، لہٰذا ان کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ چونکہ یہاں موضوعِ بحث سیکولرزم نہیں ہے، لہٰذا فی الحال اس سے گریز کرتے ہوئے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں تاریخ کے نام پر جن مساجد کو حکومت اپنی تحویل میں رکھتی ہے، اسی ملک میں تاریخ کا یہ افسوسناک اور المناک سانحہ بھی وقوع پذیر ہوا کہ اجودھیا میں 6 دسمبر 1992ء کو 1528ء کی تعمیر شدہ بابری مسجد کو ہندو احیاء پرست دہشت پسندوں کے ہاتھوں سیکوریٹی فورسز اور انتظامیہ کی نگرانی میں اس طرح شہید کر دیا گیا کہ اب وہاں مسجد کی زمین کے علاوہ مسجد کی عمارت کا نشان تک نہیں پایا جاتا اور بڑی دیدہ دلیری سے اس جگہ پر رام کے بت کو نصب کر دیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت بابری مسجد کو شہید کیا جا رہا تھا اس وقت کیا کچھ دیر کے لئے دستور سے 'سیکولرزم' کی شق کو خارج کر دیا گیا تھا۔ یقینی طور پر ایسا نہیں تھا بلکہ ملک میں ہندتو کی دہشت گردی کی آگ کو ہوا دینے والی تحریک اور تنظیموں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا، اتر پردیش میں آر.ایس.ایس. کی سیاسی تنظیم بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی اور وہاں کے وزیر اعلیٰ آر.ایس.ایس. کی اہم شخصیت کلیان سنگھ تھے۔ البتہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی اور اس وقت وزیر اعظم پی.وی. نرسمہا راؤ تھے۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ساری دنیا میں شدید احتجاج کیا گیا اور ہمارے ملک پر ہر طرف سے تھو تھو کی بوچھار کی گئی۔ کچھ دیر کے لئے پارلیمنٹ میں مسلم ممبران کے احتجاج پر ہنگامہ ضرور ہوا لیکن رفتہ رفتہ بابری مسجد کی شہادت کو فراموش کر دیا گیا۔ مسلم ممبران پارلیمنٹ کا احتجاج برائے نام تھا حتیٰ کہ کسی نے یہ بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ احتجاج میں اپنا استعفیٰ ہی پیش کر دیں۔ دوسری طرف زمینی سطح پر ہندتو وادی تنظیموں نے "رام مندر" کی تعمیر کی تحریک شروع کر دی۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اب تک ہزاروں مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور اربوں کھربوں کی املاک تباہ ہو چکی ہے۔ حالیہ گجرات فساد نے تو مسلمانوں کی کمر ہی توڑ دی ہے۔

فی الوقت ملک میں مسلمان جن نازک حالات سے گزر رہے ہیں اس کا اندازہ کم و بیش سبھی کو ہے۔ لیکن اس المیہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ملک میں "قیادت" کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور مسلمانوں کی صورت حال بھیڑ کے اس ریوڑ کی طرح ہے کہ جب چاہے بھیڑیا اس کا شکار کر لے۔

رام مندر کی تحریک اپنے شباب پر پہنچ چکی ہے۔ اور منافق مسلمانوں کا اس تحریک کو بھرپور تعاون حاصل ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ، بابری مسجد کی کمیٹیاں اور مسلم مجلس مشاورت کے رہنما اپنی حد تک احتجاجی داؤ پیچ سے کام لے

رہے ہیں۔ لیکن بابری مسجد کے مسئلہ کی ڈور جوں جوں سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، مزید اُلجھ جاتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کو اب جبکہ تقریباً 12 سال ہونے کو ہیں، ہر طرف خون کی ہولی کھیلنے کی زبردست تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ مسلم قائدین "جمہوریت اور سیکولرزم" کی بقا اور عدلیہ کی دہائی تو دے رہے ہیں لیکن قوم کی حقیقی قیادت کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ ایسی صورتحال میں قوم کی وہ نوجوان نسل جو بالخصوص 25-20 سال کی عمر کے درمیان ہے، حیران و پریشان ہے کہ بابری مسجد کا اصل معاملہ کیا ہے؟ اس نسل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بابری مسجد کی اصل تاریخ کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک مسجد کی کیا حیثیت ہے؟ رام مندر کے پس پردہ کون سے عوامل کارفر ہیں؟ جو کچھ بتایا جا رہا ہے وہی درست ہے یا کچھ اور بھی حقیقت ہے۔ بعض اوقات نوجوانوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "ملاؤں نے اپنا پیٹ پالنے کے لئے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے" کسی طرف سے یہ آواز بھی آتی ہے کہ اب تو مسجد منہدم ہوگئی۔ پھر رام مندر بنانے کے لیے جگہ کیوں نہیں دی جاتی۔ بعض نوجوانوں کے مسموم ذہنوں سے یہ بھی اگلوایا جاتا ہے کہ وہاں مسجد ویران تھی، کوئی نمازی جاتا ہی نہیں تھا لہٰذا اگر توڑ دی گئی تو کیا ہوا، دوسری جگہ مسجد بنالی جائے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

"بابری مسجد: شہادت سے قبل ــــ شہادت کے بعد" کتاب کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ اس موضوع پر بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کیا جائے اور تمام نقطۂ نظر پر مشتمل ایک ایسا انتخاب ہو جس کے مطالعہ سے بابری مسجد کی تاریخ، اس کی شہادت اور تاحال صورت حال سے لوگ واقف ہو سکیں۔ اگر چہ انتخاب کے وقت اس موضوع پر اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ اسے کتابی صورت دینے میں دقت بھی محسوس ہوئی۔ تاہم تکرار سے گریز کرتے ہوئے کوشش کی گئی کہ اس موضوع کا کماحقہٗ احاطہ کیا جا سکے۔ اس کے باوجود اس کی ضخامت بڑھتی ہی گئی۔ لہٰذا سہولت کے پیش نظر اس انتخاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی جلد "شہادت سے قبل" اور دوسری جلد "شہادت کے بعد" پر مشتمل ہے۔ لیکن دونوں جلدیں اپنی جگہ منفرد اور مکمل ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ شہید بابری مسجد کے موضوع پر یہ دونوں جلدیں اپنے مواد کے لحاظ سے ہر طرح مکمل اور اس مسئلہ کو گہرائی سے سمجھنے میں معاون ہوں گی۔ اس انتخاب کے لیے جن متعدد کتب، رسائل و اخبارات کے تراشوں اور مضامین کا مطالعہ کیا گیا ان میں مولانا صباح الدین عبدالرحمنؒ کی تصنیف "بابری مسجد: تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں" ماہنامہ افکار ملی نئی دہلی کا بابری مسجد نمبر، کانپور کا ڈائجسٹ استقامت (شہید بابری مسجد نمبر)، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی اور انگریزی جریدہ فرنٹ لائن سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ میں ذاتی طور پر تمام کتب کے مصنفین اور رسائل و اخبارات کے مدیران کا ممنون ہوں۔ اس انتخاب کی ترتیب میں جن اصحاب نے جس درجہ میں تعاون و مشورے سے نوازا ان کا بھی بے پایاں ممنون ہوں۔

دعاء ہے کہ "بابری مسجد: شہادت سے قبل ــــ شہادت کے بعد" کی دونوں جلدیں ملک اور مسلمانِ ہند کے لیے باعث خیر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں درست فیصلے تک پہنچنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ نیز ادارہ 'فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹیڈ' کے ڈائریکٹر محمد ناصر خان صاحب کا بھی متشکر ہوں کہ ان کی تحریک اور تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو!

ــــ محمد عارف اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

فیض آباد مسلمانوں کا شہر سمجھا جاتا تھا، کیونکہ یہ نوابانِ اودھ کا دارالسلطنت کچھ دنوں تک رہا، اسی کا ایک حصہ اجودھیا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کا عقیدت مندانہ لگاؤ رہا، کیونکہ ان کی روایت کے مطابق یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے لڑکے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر ہے۔ جس کے بڑے احاطہ میں بہت سے بزرگانِ دین بھی مدفون ہیں، اس کی بھی شہرت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہند بن نوح اور حضرت ایوب علیہ السلام کی بھی قبریں ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔ یہاں بخشی باباؒ، حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ، جنگی شہیدؒ، الٰہی بخش مجذوبؒ، علم بخشؒ، شاہ بدارؒ، سید جلال الدین خراسانیؒ، شاہ ثمن فریادرسؒ، حضرت جمال الدینؒ، شاہ ابراہیمؒ، شاہ چپؒ، قاضی قدوہؒ، حضرت سلطان موسیٰ عاشقانؒ، حضرت شاہ علی اکبر میر کشادیؒ، بہادر شاہ مکن شاہؒ، قطب شاہ بدیع الدینؒ، حضرت جلال الدینؒ اور حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے شہید مجاہدین کی بھی قبریں ہیں، جن کی دیکھ بھال یہاں کے مسلمان بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں، یہاں اچھی اچھی مسجدیں بھی ہیں، مسجد سرگدادری تو اتنی اونچی ہے کہ کوسوں دور سے نظر آتی ہے، یہاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ، کے مشہور خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ اودھی ثم دہلویؒ کا خاندان بھی آباد ہوا۔ 1881ء کے امپیریل گزیٹیر میں ڈبلو۔ڈبلو۔ہنٹر (W.W.Hunter) نے اجودھیا کے ذکر میں لکھا تھا کہ یہاں 36 مسجدیں ہیں۔

یہ شہر بودھ مت کا بھی بڑا مرکز رہا، ایک روایت کے مطابق گوتم بدھ نے یہاں نو (9) یا انیس (19) برس گزارے، ایک زمانے میں یہاں بودھ مت کے بیس (20) مندر تھے، اور تین ہزار بھکشو رہا کرتے تھے، اب یہ شہر بودھ مت کے آثار سے خالی ہوگیا ہے۔

یہ جین مت کے پانچ پیشواؤں کا بھی مولد اور مسکن رہا، اور یہاں ان کے مندر بھی رہے، ہندو تو خاص طور پر اس کو پوتر سمجھتے ہیں کہ ان کی روایت کے مطابق یہیں رام چندر جی پیدا ہوئے، حکومت کی، اور مرنے پر جلائے گئے۔

اجودھیا کی سرزمین میں شاید یہ کشش ہے کہ تمام مذاہب کے پیشوا یہاں کھنچ کر آتے رہے، اس کی اس اہمیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کی مذہبی تاریخیت قائم رہنی چاہیے، اس کو صرف ایک مذہب سے وابستہ کر کے اس کی خصوصی عظمت کو ختم کرنا مناسب نہیں۔

اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر یہاں جہاں اور مسجدیں تھیں وہاں بابری مسجد کا بھی اضافہ ہوا، جس کو انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اپنے سیاسی مفاد کی خاطر متنازع بنا دیا، اس کا قضیہ دبا ہوا تھا، مگر فروری 1986ء میں یکا یک پھر اُٹھ کھڑا ہوا، راقم نے اس سلسلہ میں معارف کی پانچ اشاعتوں پر اس پر شذرات لکھے، جو پورے ہندوستان میں بہت دلچسپی سے پڑھے گئے۔

1947ء سے پہلے پاکستان کی تحریک کے حامیوں نے یہ اثر ڈالا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو علحدہ علحدہ قومیں ہیں، دونوں ایک قوم نہیں ہیں، اسی بنا پر ملک کی تقسیم ہوگئی، 1947ء کے بعد قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور متحدہ قومیت کا درس زور وشور سے پڑھایا گیا اور یہ مؤثر بھی ہوتا نظر آیا، 1947ء سے اب تک بکثرت ہندو مسلمان کے درمیان خوں ریز اور تباہ کن بلوے ہوتے رہے، لیکن ملکی پیمانے پر ان کے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہوئے، شاید مسلمانوں کی تحقیر اور تذلیل کی خاطر کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن پاک کی طباعت و اشاعت کو ممنوع قرار دینے کی ایک درخواست بھی ایک انتہا پسند ہندو کی طرف سے پڑی، مگر ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی غیر معمولی ہمدردی اور قانونی چارہ جوئی سے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس سے مسلمان دونوں حکومتوں کے ممنون ہوئے، پھر شاہ بانو کیس کے سلسلے میں سپریم کورٹ میں مسلمان مطلقہ عورت کے نان نفقہ سے متعلق قرآنی احکام کے خلاف جو فیصلہ دیا گیا اس سے مسلمانوں میں غیر معمولی اشتعال پیدا ہوا، لیکن پارلیمنٹ نے خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبہ میں مسلمان مطلقہ عورت کا جو بل منظور کر لیا تو اس سے عام طور سے مسلمان خوش ہوئے، لیکن فروری 1986ء میں بابری مسجد کو مندر میں منتقل کر دینے کے عدالتی فیصلہ پر ہندو مسلمان میں جو غیر معمولی تناؤ پیدا ہو گیا ہے اس سے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا جو درس دونوں کو دیا گیا تھا وہ بالکل بھلا دیا گیا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ بعض ہندو اہلِ قلم اور دانشوروں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے قضیہ پر مفید مضامین لکھ کر انتہا پسند ہندوؤں کو اس کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنے کی دعوت دی ہے، خود اتر پردیش کے وزیر پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے اخبار میں جو ایک لمبا بیان دیا ہے، اس کے

بعض حصے سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا یہ بیان قابل توجہ ہے کہ جہاں تک میری معلومات ہیں اجودھیا کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، تلسی داس کی راماین میں بتایا گیا ہے کہ اجودھیا سرجو ندی میں ڈوب گئی تھا، آج کا اجودھیا اودھ کے نوابوں کا آباد کیا ہوا ہے، پنڈت لوک پتی ترپاٹھی نے یہ بھی کہا کہ رام جنم بھومی کی تحریک امریکہ میں شروع ہوئی، اس تحریک کے نتیجے میں رتھ یاترا نکالی گئی، مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑنے کے لیے سی.آئی.اے اجودھیا میں شرارت کر رہی ہے، ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہر قسم کے اشتعال اور جارحیت کے باوجود ہندوستانی مسلمان نہایت ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے مکمل طور پر پُر امن رہے، لیکن وہ طاقتیں جو ہندو فرقہ پرستی کا جواز پیدا کرنا چاہتی ہیں اور ہندو مسلم ٹکراؤ کو گاؤں گاؤں محلّہ محلّہ پھیلانا چاہتی ہیں، وہ مسلمانوں میں سرگرم ہو گئی ہیں۔ پٹنہ کے ایک ہندی ویکلی وچار بودھ میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اودھ کے ہندو مسلمان کو لڑانے کے لیے انگریزوں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازعہ کو جنم دیا، اسی مضمون میں بابر کے اس وصیت نامہ کا ذکر ہے جو اس نے ہمایوں کو دیا تھا، اس کو ہم نقل کر چکے ہیں، مضمون نگار نے لکھا ہے کہ اس کی نقل قومی یادگار کے تحفظ کے محکمہ میں محفوظ ہے، اسی مضمون نگار نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہمایوں نے باپ کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے بنارس کے جگن ناتھ مٹھ کو ضلع مرزاپور میں تیرہ سو ایکڑ اراضی معافی میں دے دی، اس کا یہ حکم نامہ آج بھی جگن ناتھ مٹھ میں محفوظ ہے۔

پھر دہلی کے ڈاکٹر آر.ایل.شکلا اور السٹریٹیڈ ویکلی کے مضمون نگار چیتا نند داس گپتا نے اس سلسلہ میں مضامین لکھے، پھر کچھ ہندو مسلمان دانشوروں کا ایک اجتماع انڈیا انٹرنیشنل سنٹر نئی دہلی میں 7/جون 1986ء کو ہوا، اس میں بابری مسجد کے تنازعہ پر غور و خوض کیا گیا اور اس میں یہ طے کیا گیا کہ سماج کے تمام طبقات تشدد سے احتراز کریں، جذبات و احساسات میں بلندی پیدا کریں۔ ہوش مندی سے کام لیں اور یہ عہد کریں کہ ملک میں ایک سچا سیکولر اور ایسا جمہوری سیاسی ڈھانچہ مضبوط رہے جس میں سماج کا کوئی طبقہ اپنے آپ کو غیر محفوظ یا عدم توجہی کا شکار محسوس نہ کرے، اور جہاں صحیح معنوں میں مساوات کا دور دورہ ہو۔

اس اپیل پر جن ہندوؤں نے دستخط کیے ان کے نام یہ ہیں: اندر کمار گجرال، راجندر سچر، ہرکشن سنگھ سرجیت، اوم پرکاش سریواستو، دیوان بیرندر ناتھ، ایر کموڈور اے.ایل.سہگل، لفٹیننٹ جنرل ایس

اورورا، راجندر پوری، چندر شیکھر، بھائی ویدیہ، اے.ڈی گرگ، اندر موہن، اننت رام جیسوال، گوند نارائن، سی.راجیشور راؤ، دھرم ویر سنہا، یشونت سنہا وغیرہ۔

ہم بھی مسلمانوں کی طرف سے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ بابری مسجد، رام جنم بھومی توڑ کر اس کی جگہ پر بنائی گئی تو ایسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر جو مسجد بنائی گئی وہ مسمار کر دیے جانے کے لائق ہے، اس میں نماز پڑھنے کا فتویٰ کوئی فقیہ اور عالم نہیں دے سکتا، مگر یہ ثابت کرنے کے لیے مستند، معتبر اور معاصر ماخذوں کے حوالے چاہئیں۔ انگریزوں کے زمانے کے لکھے ہوئے گزیٹیروں یا آثار قدیمہ کی رپورٹوں، یا سنی سنائی روایتوں کے حوالے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے، ایسے مسلمان مصنفوں کی تحریریں بھی قابلِ توجہ نہیں جو نفرت، جنگ وجدل اور اشتعال بھری فضا میں لکھی گئیں،، یا انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے بعد قلم بند ہوتی رہیں، انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے بار بار اس پر زور دیا کہ وہ تو جہاں جاتے ہیں، دوسروں کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیتے ہیں، یہی ان کا مذہبی اصول رہا ہے، ان انگریزوں کو لکھتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ عیسائیت کی تاریخ دوسروں اور خصوصاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو برباد اور مسمار کرنے سے بھری پڑی ہے۔ سسلی میں مسلمانوں کی حکومت تقریباً دو سو (200) سال رہی، لیکن عیسائیوں کا اقتدار وہاں ہوا تو خود ایک عیسائی مورخ ایس.پی.اسکاٹ بڑے دکھ اور درد کے ساتھ لکھتا ہے کہ ''سسلی میں مسلمانوں کے ہزاروں محل اور مسجدیں تھیں، ان کی خوبصورتی، موزونیت اور شان مسلمانوں کے شہروں کے لیے مایۂ ناز تھیں، اب ایک بھی وہاں باقی نہیں، ان کو یا تو عوام کالانعام نے پامال کر ڈالا، یا وہ کلیسا کے تعصب کی نذر ہو گئیں''۔ (اخبار الاندلس جلد 2، صفحہ 75)

اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو برس تک حکومت کی، اس کو خوبصورت مسجدوں سے آراستہ کیا، قرطبہ اور الحمراء کی شاندار مسجدیں دنیا میں فن تعمیرات کے لحاظ سے بہترین نمونے سمجھی جاتی ہیں، مگر عیسائیوں نے اسپین کی ہزاروں مسجدوں کو مسمار کر دیا، ان کی جگہوں پر کلیسا، یا مکانات بنا لئے، صلیبی جنگ کے زمانہ میں یروشلم کی مسجدوں کو صلیبیوں نے جس طرح منہدم کیا اس کی بڑی طویل المناک داستان ہے، اٹھارویں صدی کے وسط میں روسیوں نے ترکوں کے خلاف کریمیا میں جنگ کی تو ایک یورپین مورخ ایڈورڈ کریسی کا بیان ہے کہ روسی فخر کرتے تھے، کہ اس حملہ میں انہوں نے چھ ہزار مکانات اور اڑتیس مسجدیں جلا دیں۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فاتحوں اور لشکریوں نے کسی مندر کو بھی نقصان نہیں پہنچایا، ان کے ہاتھوں سے بعض مندر ضرور منہدم ہوئے ،ان کا انہدام کس طرح ہوا، ذرا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ان کو تین قسم کے ہندوؤں سے سابقہ پڑا۔ (1) حربی، (2) نیم حربی و نیم وفادار اور (3) وفادار اور اطاعت گذار۔ حربی تو وہ ہندو تھے جو مسلمانوں سے زیادہ تر علاقائی حکومت کی خاطر برابر لڑتے رہے، اور ان کو ملک بدر کرنے کی فکر میں رہے، جنگ و جدل میں ایسے حربی ہندوؤں کے علاقہ میں بعض مندر ضرور مسمار کیے گئے، ان کے مسمار کرنے میں کوئی مذہبی جذبہ نہ تھا، بلکہ اس میں جنگجویانہ جذبہ کارفرما رہتا تھا، ایسی مثالیں بھی ہیں کہ حربی ہندو غالب آئے تو مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو منہدم کرنے میں دریغ نہ کیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں بھیم سنگھ نے گجرات میں سو(100) مسجدوں کو جلا دیا، نیم حربی اور نیم وفادار ہندو وہ تھے جو لڑائی میں ہارنے کے بعد صلح کا معاہدہ کر لیتے، اور اطاعت گذار بن جاتے، مگر جب مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوتی تو اپنی علاقائی حکومت قائم کرنے کے لئے لڑائی اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور بعض اوقات مندروں کو اپنی سرکشی اور بغاوت کا اڈا بنا لیتے، مسلمان لشکری ان کی سرکشی کو دبانے میں ان کی ان عبادت گاہوں کو بھی نقصان پہنچا دیتے، یہ بات اب آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب امرتسر میں سکھوں کے سورن مندر (یعنی گولڈن ٹمپل) میں حکومت کی فوج کشی ہوئی، اور اس میں اکال تخت کو بالکل مسمار کر دیا گیا، حکومت ہند کی فوج کشی کی ضرورت یوں ہوئی کہ یہ دہشت پسندوں، شرانگیزوں اور حکومت ہند کے خلاف باغیوں کا مرکز بن گیا تھا اور وہاں بہت بڑی تعداد میں مہلک اسلحے جمع کر لیے گئے تھے، ان کی دہشت پسندی و شرانگیزی کو دبانے کے لیے فوج کشی لازم تھی، اسی طرح کی کارروائی مسلمان حکمراں بھی اپنے زمانہ میں باغیوں کے خلاف کرتے رہے، اگر سکھ یہ کہیں کہ حکومت ہند نے اپنی مذہبی تعصب اور عداوت میں اکال تخت کو مسمار کیا تو کیا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ بالکل نہیں، مندروں کے خلاف اورنگ زیب کے فوجی اور سیاسی اقدام کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ہندوؤں کی تیسری قسم اُن لوگوں کی تھی جو وفادار اور اطاعت گذار ہوئے تو ان کی عبادت گاہیں محفوظ رکھی گئیں، یہی وجہ ہے کہ آگرہ اور دہلی کے وفادار اور امن پسند ہندوؤں کے مندروں کے انہدام کا ذکر نہیں ملتا، بعض مندر ایسے بھی تھے جو فحاشی کے اڈے بن گئے تھے، خود ہندوؤں کے ایماء سے ایسے مندر منہدم کیے گئے۔

خود ہمارے برادرانِ وطن کو بھی سوچنا ہے کہ سیکڑوں برس کی گئی گذری باتوں کے انتقام کی آگ میں ملک کو جھلسا کر رکھ دینا کہاں تک وطن دوستی کا ثبوت دینا ہوگا، اگر یہاں کے لوگوں میں یہی انتقامی جذبہ پیدا ہوتا رہا تو پھر وہ صرف اسی کا جائزہ لیتے رہیں گے کہ وشنو مندر کے پجاریوں نے کتنے شیو مندروں کو منہدم کیا، اور شیو مندروں کے حامیوں نے کتنے وشنو مندروں کو ڈھایا، یا ہندو مت کے پیروؤں نے بودھ مت کی کتنی عبادت گاہوں اور خانقاہوں کو مسمار کیا، یا بودھ مت والوں نے ہندوؤں کے کتنے مندروں کو برباد کیا، یا جین مت کے حامیوں نے ہندوؤں اور بودھوں کی کتنی پوتر جگہوں کو تہس نہس کیا اور خود ہندوؤں اور بودھوں نے جین مت کے کتنے مقدس مقامات کو برباد کیا، اگر ان کی تفصیلات قلمبند کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی، یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں نے ان مندروں کی فہرست تیار کر رکھی ہے جن کو مسلمانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں توڑ پھوڑ کر ختم کر دیا لیکن مسلمانوں کی مستند کتابوں میں بھی یہ تفصیل موجود ہے کہ ہندوؤں نے خود مسلمانوں کے دورِ عروج میں کتنی مسجدیں شہید کیں، 1947ء کے بعد تو سرکاری رپورٹ کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ بے شمار مسجدوں سے مسلمان بے دخل کر دیے گئے، اگر ملک میں اقتصادی، صنعتی اور تجارتی اسکیموں کے ماسٹر پلان بنانے کے بجائے ان ہی کی تفصیلات لکھی گئیں، اور ان سے انتقامی جذبات اُبھرے، تو پھر بھارت ورش میں انتقامی غیض وغضب کی آگ کا صرف دریا ہی بہتا رہے گا، پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ یہ ملک دوستی یا ملک دشمنی ہوگی، وطن دوستی تو اس میں ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دلوں کو جوڑا جائے، نہ کہ باہمی نفرت، عداوت اور خصومت کے شعلے فروزاں کیے جائیں۔

ع جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

بابری مسجد کے کتبات ہی سے ظاہر ہوگا کہ یہ مسجد محض عبادت کرنے کے لیے بنائی گئی، رام جنم بھومی مندر سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور 1528ء سے 1855ء تک یہ مسجد ہی رہی، پھر 1885ء کے مقدمہ میں بھی یہ مسجد تسلیم کی گئی، اس کا باضابطہ رجسٹریشن بھی مسجد ہی کی طرح ہوتا رہا، مگر جو اس کے قائل ہوتے گئے کہ اجودھیا صرف ہندوؤں ہی کی جگہ بن کر رہے، اور ملک میں جس کی اکثریت ہے، اسی کی مرضی ہر معاملہ میں تسلیم کی جائے، وہی اس مسجد کو مندر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر

تاریخ میں بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جن سے غلطی کرنے والی قوم بے خبر رہتی ہے، لیکن ان کے مضرت رساں اثرات صدیوں تک قائم رہتے ہیں۔

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰنؒ
دارالمصنفین، اعظم گڑھ، (یو. پی)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پیش لفظ

ہمارے ملک ہندوستان کے ایک اہم مقام اجودھیا، ضلع فیض آباد، اتر پردیش میں ایک مسجد 'بابری مسجد' کے نام سے تقریباً پانچ سو (500) سال پہلے تعمیر کی گئی تھی، تاریخ تعمیر 1528ء سے 22 دسمبر 1949ء تک اس مسجد میں نماز باجماعت مسلمان ادا کرتے رہے۔ 22 اور 23/دسمبر 1949ء کی درمیانی شب میں چوری سے مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد معاملہ پولس میں گیا اور آخرکار عدالت کے حکم سے مسجد مقفل کر دی گئی، اور وہاں ایک پجاری کو بٹھا دیا گیا اور معاملہ جوں کا توں کم وبیش 46 سال تک باقی رہا، اس کے بعد یکم فروری 1986ء کو کچھ سیاستدانوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت عدالت کے حکم سے تالا کھلوا دیا، اور عام ہندوؤں کے لئے پوجا پاٹ کا موقع فراہم کیا گیا۔

دوسری طرف 1949ء سے الہ آباد ہائی کورٹ میں مسجد کی ملکیت کی بابت مقدمہ چل رہا ہے اور آج پچاس سال میں بھی عدالت کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ بلکہ اُلٹے عدالت کے ذریعہ ہی ہندوؤں کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ بزور مسجد کو منہدم کر دیں اور مسجد کی جگہ مندر کا نیا عارضی ڈھانچہ تیار کر لیں۔ یہ سارا عمل دن دہاڑے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ تیسری طرف مسجد کے رکھوالے یعنی ہندوستانی مسلمان ملک کی عدالت اور انتظامیہ پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے۔ البتہ مسجد کے انہدام کے بعد پورے ملک میں سینکڑوں جوشیلے نوجوانوں نے اپنے غم وغصہ کا جب اظہار کیا تو پولس نے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور ان گنت مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ان ہنگاموں کے دوران جو واقعات پیش آئے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں کو اس طرح مرعوب کر دینا چاہتی ہے کہ وہ آہ بھی نہ کر سکیں، اور حکومت اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ذہنی اور فکری طور پر پسپا ہو چکا ہے جس میں مذہبی اور غیر مذہبی علماء اور جدید دانشور سب ہی شامل ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بتوں کو منہدم کرنے پر طالبان کو خوب خوب ملامت کی، لیکن مسجد کے گرانے والوں کو کچھ نہ کہہ سکے۔ بلکہ اُلٹے مسجد سے دستبرداری ہی کو باعث خیر ثابت کرنے پر زور لگایا۔ اس بات کے ثبوت میں ہم چار باتیں کہہ سکتے ہیں۔

1. گذشتہ پچاس سال میں فسادات کا مسئلہ ہو یا بابری مسجد میں تالا لگنے یا تالا کھلنے، شیلانیاس ہونے یا پھر مسجد کا انہدام اور انہدام کے بعد دوبارہ مندر بننے کا ہو، یہ سب کچھ سیکولر اقتدار کے سایہ تلے ہوا ہے۔ مگر پھر بھی اونچی سطح کے کچھ لوگ اپنے لئے آخری پناہ گاہ سیکولر اقتدار ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ہندوستان میں زندہ رہنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔
2. بابری مسجد کا مسئلہ دینی مسئلہ ہے، لیکن اس مسئلہ کو عام طور پر دینی مسئلہ قرار نہ دے کر سیکولرزم اور جمہوریت کی بقا اور علامت کا مسئلہ قرار دیا گیا۔
3. مسلمانوں کی کسی قابل ذکر شخصیت اور تنظیم نے بابری مسجد کے تئیں اپنے کسی عزم کا اظہار نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ جو کیا وہ بس یہ کہ مسجد کی برقراری کا اقرار کیا۔
4. چوتھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے بلا ضرورت یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم عدالت کے فیصلے کو تسلیم کریں گے جب کہ دوسرا فریق صاف صاف کہہ رہا ہے کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے، اس میں ہم عدالت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ عدالت کے فیصلہ کو نہ ماننے کا مسلمانوں کی جانب سے کہاں سے اندیشہ ہو سکتا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان عدالت کے کسی فیصلہ کو رد کر دینے کے موقف میں ہیں؟ خواہی نہ خواہی انہیں عدالت کا فیصلہ تو ماننا ہی ہے۔ اس کے اعلان کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

یہ کتاب دراصل پسپائی قبول کرنے والوں کو ذہنی اور فکری پسپائی سے نکالنے کے لئے ایک کوشش کے طور پر تیار کی گئی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بضاعت مزجات کو قبول کرے اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور بابری مسجد کی بازیابی کا اسے ذریعہ بنائے۔ آمین

## مسئلہ کی نوعیت

مسجد سے متعلق جو مسئلہ ہمارے سامنے درپیش ہے وہ بابری مسجد کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ مختلف اسباب کی بناء پر اتنی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ ہندوستان کا کوئی لیڈر جب خطاب کرتا ہے یا کوئی مقالہ نگار یا تجزیہ نگار ملکی حالات پر قلم اُٹھاتا ہے تو کسی نہ کسی نوعیت سے بابری مسجد کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ ملکی سیاست پر اس مسئلہ کے گہرے اثرات ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ جہاں ایک طرف

بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنے خاص طرزِ عمل کی بناء پر ہندوستان کی سب سے مضبوط اور سب سے قدیم پارٹی کانگریس کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا، وہیں بی۔جے۔پی اپنے خاص طرزِ عمل اور رویہ کے ذریعہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوگئی، تیسری طرف ایک عام تاثر یہ ہے کہ 6 دسمبر 1992ء کو واقع ہونے والے سانحہ کی بنا پر مسلم نوجوانوں میں ایک خاص قسم کی بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پرانی مسلم قیادت کو اس سانحہ نے مزید بے حوصلہ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ چند سطروں پہلے اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، چنانچہ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے دعوتی مقاصد تباہ ہو جائیں گے، کوئی بڑے ہی دانشورانہ اور علمی انداز میں بولتا ہے کہ اس مسئلہ کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی میں خلل ہوگا۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ہم اقلیت میں ہیں، کسی اقلیت کا اکثریت سے ٹکرانے کا مطلب ''آ بیل مجھ کو مار'' ہے۔ اس مسئلہ میں پڑنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ کوئی صاحب بڑے حقیقت پسندانہ لب ولہجہ میں فرماتے ہیں کہ ایک مسجد کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بے شمار مسجدیں موجود ہیں اور مزید کئی نئی مسجدیں بنائی جاسکتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پر دعوتِ دین کی اہم ذمہ داری بحیثیت خیر امت کے اللہ کی جانب سے ڈالی گئی ہے، لہٰذا ہمیں دعوتی مواقع تلاش کرتے رہنا چاہئے اور میسّر مواقع کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر قیمت پر؟ کیا دعوتی مواقع کی بقاء کے لئے اپنے ذمہ عائد ہونے والے فرائض اور ذمہ داریوں سے صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے؟...... کیا نماز کو اس غرض کے لئے چھوڑ سکتے ہیں؟...... اور اگر نماز کو چھوڑ نہیں سکتے تو مسجد کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟؟...... اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد دعوتی حکمت عملی کے تحت مشرکین مکہ کی کتنی رعایت کی؟...... کیا اس سلسلہ میں دو چار مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ آپؐ نے اور آپؐ کے اصحابؓ نے ایسی ذمہ داریوں کو ادا کرنا چھوڑ دیا ہو جو شریعت کی جانب سے ان پر ڈالی گئی ہوں تاکہ دعوت کے لئے فضا اور ماحول پرسکون رہے؟...... مکّی دور میں جو اذیت ناک حالات تھے، ان کا آج ہم تصوّر بھی نہیں کرسکتے مگر ماحول کو ہم آہنگ اور پرسکون رکھنے کے لئے کوئی کوشش اس انداز کی نبی کریمؐ کی طرف سے نہیں کی گئی کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی ہدایت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہو۔ جبکہ حالات کے دباؤ اور دعوتی حکمت عملی کے تحت اس طرح کی سوچ پیدا ہوسکتی تھی، یا ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے اندر پیدا

ہوئی ہو، یا پیدا ہونے کا امکان ہو، غالباً اسی پس منظر میں مسلمانوں کو نبی کریمؐ کے توسط سے بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، اپنے موقف پر قائم رہو اور استقامت کا مظاہرہ کرو، ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکو۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ یعنی "اُن کی خواہش ہے کہ آپؐ تھوڑا نرم ہوں تو وہ بھی نرم ہو جائیں گے"۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ مکہ میں نبی اکرم ﷺ کو ذرا نرم کرنے کے لئے مشرکین نے بار بار مختلف تجویزیں پیش کیں، اس کے برخلاف کوئی ایک ایسا واقعہ نہیں ہے کہ آپؐ ان کے پاس کوئی تجویز لے کر گئے ہوں کہ کشمکش ختم ہو یا کم ہو جائے، اسی طرح ہجرت کے بعد مدینہ پہنچتے ہی سرایا بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دو سال کے اندر ہی غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس طرح کی ساری سرگرمیاں بظاہر دعوتی مواقع کو برباد کرنے والی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟...اس کا ایک ہی جواب ہے کہ یہ سرگرمیاں دراصل دین و ایمان کا تقاضہ تھیں۔ یعنی دعوت دینا تو ضرور ہے لیکن دینی فرائض اور دینی تقاضوں سے صرف نظر کر کے نہیں۔ فرائض کی عدم ادائیگی کی صورت میں ہم تقویٰ اور خشیت الٰہی کی صفت سے خالی ہو جائیں گے جو ایک داعی کی بنیادی صفت ہے۔ غرض یہ کہ دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دعوت کی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے، اس لئے اصل چیز جو ہمیں سوچنے اور دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کے تئیں ہمارا فرض کیا بنتا ہے؟...اگر مسجد کی حفاظت کے ضمن میں ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا تو کوئی حرج نہیں جو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ لیکن اگر فرض بنتا ہے تو اس کو پورا کرنا چاہئے بقیہ باتیں اللہ کے حوالہ ہوں گی۔ یہی وہ موقع ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ اے نبیؐ! آپؐ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے، ہدایت کی ذمہ داری آپؐ پر نہیں ہے، ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔ گویا بہت ساری ذمہ داریوں میں سے ایک بڑی ذمہ داری دعوت پہنچانا ہے، اس لحاظ سے یہ بات کوئی معنیٰ نہیں رکھتی کہ ایک فرض کو ادا کرنے کے لئے دوسرے فرض کو چھوڑ دیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ مسجد کو آباد کرنا، اس کی حفاظت کرنا، اس پر کفار و مشرکین کے قبضہ کو ختم کرنا اور منہدم کردہ مسجد کو از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کرنا ہماری شرعی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے فرار دنیا اور آخرت دونوں جگہ اللہ کے غضب کا سبب بنے گا، اس لئے اس مسئلہ کو سرسری انداز سے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔

بابری مسجد کے مسئلہ پر لڑائی جاری رکھنے کی وجہ سے معاشی اور تعلیمی نقصان ہو سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں، لیکن اس نقصان کو ہمیں برداشت کرنا چاہیے، اسی کا نام قربانی ہے۔ اس طرح کی قربانی دیے بغیر نہ دنیا میں سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں۔ یہی وہ چیز ہے جسے اپنا کر ایک گروہ ہمیشہ کامراں و کامیاب ہوتا رہا ہے اور اسی سے بھاگنے والے خسران اور ناکامی سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔

اقلیت اور اکثریت کا جہاں تک مسئلہ ہے، اس سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن بتایئے اہلِ حق کب اکثریت میں رہے ہیں، اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کا کھڑا ہونا ہی تو سبب ہے بلندئ درجات کا:

لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ (الحدید:10)

ترجمہ: ”تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہو سکتا جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ لوگ درجہ میں ان سے بڑھ کر ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کی اور اللہ نے ہر ایک سے اچھائی کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔“ (الحدید/10)

محض اقلیت میں ہونے کی بناء پر اللہ کی راہ میں جدو جہد نہ کرنے کی ذہنیت ایک بڑے مرض کی علامت ہے، قرآن نے بنی اسرائیل کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے جب کہ انہیں جالوت سے لڑنے کا حکم دیا گیا تھا، ایک نے کہا:

لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ

یعنی انہوں نے کہا آج ہمارے اندر جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا:

قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِیْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً کَثِیْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (البقرہ:249)

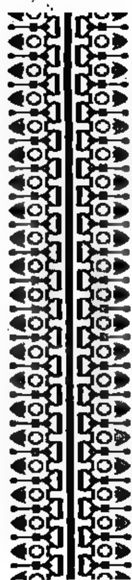
یعنی جنہیں اللہ سے ملنے کا یقین تھا، انہوں نے کہا کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب ہو گئے اللہ کے اذن سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہاں جس واقعہ کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے، اس کو اپنے سامنے رکھئے اور یہ فیصلہ کیجئے کہ ہم کس گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

یہ بات کہ ایک مسجد کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سوال پر یہ ایک سوال اُٹھتا ہے کہ کیا بات ہے کہ پوری تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں کسی باوقار ملک کی فوج نے یہ کہا ہو کہ ایک چوکی کے چلے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے چند گز زمین کا مسئلہ ہے دشمن کو لے جانے دو۔

بایں وجوہ بابری مسجد کے مسئلہ سے صرف نظر کرنا اور اس سے اپنے کو دور رکھنا اور بچانا نہ صرف یہ کہ ایک دینی ذمہ داری کو ادا کرنے سے کترانا ہے اور آخرت کا سودا کرنے کے بجائے دنیا کے حقیر مفادات کی محبت میں گرفتار ہونا ہے نیز اوپر اُٹھنے کے بجائے پستی کی جانب گرنا ہے۔ بلکہ اس بات پر اپنی آمادگی اور رضا کا واضح طور پر اعلان ہے کہ بس ہماری جان بخش دی جائے ہم نمبر دو اور تین کے شہری بن کر رہنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پہلو سے بابری مسجد کا مسئلہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، بلکہ اسی ایک مسئلہ میں سارے مسائل ضم ہو گئے ہیں، مسلمانوں کے ان گنت مسائل اگر حل ہوں گے تو اسی مسئلہ کے حل ہونے کی صورت میں حل ہوں گے۔ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا تو آئندہ بھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا جیسے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا ہے بلکہ لاینحل مسائل میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قدرت کی مہربانی کہ اس نے ہمارے سارے مسائل کو ایک مسئلہ میں سمیٹ دیا ہے جیسے کسی فوج کو درجنوں محاذوں پر لڑنے کے بجائے قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہوں کہ وہ ایک ہی محاذ پر قوت آزمائی کرے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر فتح مند ہو جائے یا اپنے نکمے پن کا ثبوت دے کر پسپا ہو جائے۔ □ □ □

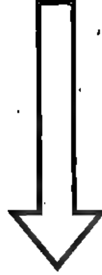
(مولانا) عبدالعلیم اصلاحی، حیدرآباد






# بابری مسجد کی دینی اور شرعی حیثیت





"جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لیے علامات اور نشاناتِ خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی مت کرو، ان میں حرم محترم بیت اللہ شریف، جَمرات، صفا و مروہ، ھدیٰ، احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں۔"

از: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
بحوالہ سورۃ المائدہ:2
ترجمہ: حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ

# دین میں مسجد کی اہمیت

از: مولانا عبدالعلیم اصلاحی

اسلام میں مساجد کا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں دل کا ہے۔ دل کی حرکت سے زندگی شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح مسجد سے ایمانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ دل کی حرکت بند ہونے کے بعد زندگی کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح بمشکل ہی کسی ایسی مسلم آبادی کا تصوّر کیا جا سکتا ہے، جہاں مسجد نہ ہو۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں آیت اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ کے تحت لکھا ہے کہ مسجد کی آبادکاری ایمان کی دلیل ہے، بلکہ لفظ ''اِنَّمَا'' سے اشارہ ہو رہا ہے کہ ایمان صرف انہیں لوگوں میں ہوگا، جن کے اندر مسجد کو آباد کرنے کی صفت پائی جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آنے کے بعد سب سے پہلے مسجد بنائی۔ اس کے بعد ازواجِ مطہرات کے حجرے بنائے گئے۔ کعبۃ اللہ بھی ایک مسجد ہے، اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔ دنیا کی تمام مسجدیں اسی مرکزی مسجد کی شاخیں ہیں۔ اسی طرح دنیا کی کسی مسجد کی بے حرمتی کعبۃ اللہ کی بے حرمتی کے ہم معنیٰ ہے، اور کسی بھی مسجد کی خدمت اور آبادکاری کعبۃ اللہ کی خدمت اور آبادی سے ملتی جلتی چیز ہے۔ اِقَامَتِ الصَّلٰوۃِ کا حکم ایمان باللہ کے بعد پہلا حکم ہے اور ایمان کا ایک اہم ترین تقاضہ ہے۔ اس حکم کی تعمیل کے لئے مسجد ایک لازمی چیز ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی مَسَاجِدُھَا | اللہ کے نزدیک زمین پر سب سے محبوب جگہ مساجد ہیں، |
| وَاَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ اَسْوَاقُھَا۔ | اور اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ مقام بازار ہے۔ |

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے ایک دوسری روایت ہے:

مَنْ تَطَهَّرَ فِيْ بَيْتِهٖ ثُمَّ مَشٰى اِلٰى بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَقْضِيْ فَرِيْضَةً مِّنْ فَرَائِضِ اللّٰهِ كَانَتْ خَطْوَاتُهٗ اِحْدَاهَا تَحُطُّ خَطِيْئَتَهٗ وَالْاُخْرٰى تَرْفَعُ دَرَجَتَهٗ. (رواہ مسلم)

جس نے اپنے گھر میں وضو کیا، پھر کسی مسجد کی طرف چلا تا کہ کوئی فرض نماز ادا کرے تو اس کا ایک قدم اس کی خطا کو مٹاتا ہے اور دوسرا اُس کے درجہ کو بڑھاتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا رَاَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِيْمَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... الخ

جب کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ مسجد کو آتا جاتا ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بَشِّرِ الْمَشَّائِيْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

خوشخبری دے دو ان کو جو اندھیرے میں مسجد کی طرف پیدل جاتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن کامل نور عطا ہوگا۔

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں اور اللہ پر یہ حق ہے کہ اللہ ان کی عزّت کرے جو اللہ کے گھر میں اللہ سے ملنے کے لئے آئیں۔ (بحوالہ تفسیر کبیر)

ایک مشہور حدیث ہے:

مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِداً بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ.

جو کوئی اللہ کے لئے مسجد بنائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنا دیں گے۔

یہ کتنی عظیم بشارت ہے اس کا اندازہ اور اس کی قدر وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق اور عنایتِ خاص سے جنت کا شوق پیدا کر دیا ہو۔ اسی بنا پر ہر دور میں مسلمانوں کے اندر مسجد بنانے اور مسجد کی خدمت کا بے پایاں ذوق وشوق پایا گیا ہے۔

## مسجد اللہ کی ملکیت ہوتی ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (سورۃ الجن:18) اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی ہیں لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔

سلسلہ بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم علیہ ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپؐ کہہ دیجئے کہ میری طرف جن باتوں کی وحی کی گئی ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مسجدیں اللہ کے لئے خاص ہوتی ہیں۔

تفسیر کبیر میں اس آیت کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے: اَیْ فَلاَ تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا فِیْ الْمَسَاجِدَ لِاَنَّھَا لِلّٰہِ خَاصَّۃٌ ۔ پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مسجدوں میں نہ پکارو، اس لئے کہ مساجد اللہ کے لئے خاص ہیں۔

قرآن مجید میں کم از کم 19 جگہ ''مسجد'' اور 6 جگہ ''مساجد'' کا لفظ آیا ہے۔ ان سارے مقامات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اور مساجد سے مراد وہ جگہ ہے جو عبادت کے لئے مخصوص کی گئی ہو۔ اس کے باوجود بعض بزرگوں نے سات اعضاء، دونوں ہاتھ، دونوں قدم، دونوں گھٹنے اور پیشانی کو مراد لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے اطلاق سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ان اعضاء پر اللہ کے سوا کسی اور کے لئے سجدہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس آیت اور حدیث ''میرے لئے پوری زمین مسجد بنادی گئی ہے'' سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زمین پر اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو۔ بہر صورت مسجد اور مساجد سے مراد عبادت کے لئے مخصوص طور پر بنائی ہوئی جگہ ہے۔

آیت کے نزول کے وقت روئے زمین پر صرف دو مسجدیں تھیں، ایک کعبۃ اللہ مکہ معظمہ میں اور دوسرے مسجد اقصیٰ فلسطین میں، اس کے باوجود جمع کا لفظ 'مساجد' آیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حکم رہتی دنیا تک زمین پر تعمیر ہونے والی تمام مساجدوں کے بارے میں دیا گیا ہے۔

مشرکین مکہ خانۂ کعبہ میں اور یہود و نصاریٰ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں اللہ کے ساتھ کئی خداؤں کی پوجا کرتے تھے، اور کئی بتوں کے سامنے سجدہ کرتے تھے، اس پس منظر میں حکم دیا گیا کہ مساجد میں صرف اللہ کو پکارو، اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، یعنی کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور اس کی وجہ یہ

بتائی گئی کہ مساجد اللہ کے واسطے مختص ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی ملکیت میں ہوتی ہیں۔ 'للہ' میں لام ملکیت کو بتاتا ہے جیسے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ''بلا شبہ زمین اللہ کی ہے''۔..... اِنَّا لِلّٰهِ ''ہم اللہ کے ہیں''۔

## ایک اہم نکتہ

یہاں شرعی، فقہی اور قانونی لحاظ سے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی مسجد کا صرف اللہ کی عبادت کے لئے مختص ہونا اور کسی مسجد کا اللہ کی ملکیت ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو اجتہاد اور استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ حکم ہر مسجد کے لئے نص صریح سے ثابت ہے۔ یہ مسئلہ اجتہاد کے دائرے سے باہر ہے اسی بناء پر کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی مسجد کو غیر اللہ کی عبادت کے لئے دے دے یا اس کی ملکیت میں تبدیلی پیدا کر دے۔ مسجد کی ملکیت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک واقعہ کا ذکر کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ ہمارے معتبر واعظین بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم صبح تک میری حدود سلطنت سے باہر چلی جاؤ ورنہ تم پر طلاق ہے۔ اس کے بعد سب کو پریشانی لاحق ہوگئی کہ صبح تک حدود سلطنت سے نکل جانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لئے طلاق واقع ہو جائے گی، عام علماء اور مفتیان کے نزدیک اس کے علاوہ کہنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن ایک بڑے فقیہہ نے کہا کہ طلاق سے بچنے کی ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ بیگم صاحبہ صبح سے پہلے کسی مسجد میں چلی جائیں، مسجد اللہ کی ملکیت ہوتی ہے، کسی بھی بادشاہ کی سلطنت سے باہر ہوتی ہے۔

## سب مسجدیں یکساں قابلِ احترام ہیں

اس آیت کا اطلاق جس طرح کعبۃ اللہ اور مسجد اقصیٰ پر ہوتا ہے اسی طرح دنیا کی ہر مسجد پر ہوگا اور جس طرح یہ دونوں مسجدیں محترم ہیں اور ان پر غیر شرعی طور پر کوئی تصرف نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح دنیا کی کسی مسجد پر شرعی دلیل کے بغیر کوئی تصرف کرنے کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔ کعبۃ اللہ میں ایک نماز، ایک لاکھ اور مسجد نبوی میں ایک نماز پچاس ہزار کے برابر ہے، اس فرق مراتب سے قطع نظر مطلق احترام اور ملکیت کے اعتبار سے ہر مسجد برابر ہے۔ جس طرح کعبۃ اللہ اور مسجد نبویؐ کی حفاظت، آبادکاری اور خدمت امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے اسی طرح ہر مسجد کی حفاظت، آبادکاری اور خدمت مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہے۔ زمین کے کسی کونے میں کوئی مسجد ہو اور اس کی

بے حرمتی ہوتی ہے تو روئے زمین پر بسنے والا کوئی مسلمان اپنے کو قطعا بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ مسجد تو مسجد ہے دارالاسلام کی زمین کے چھوٹے سے چھوٹے علاقہ پر اگر کفار اور مشرکین قابض ہو جائیں تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس علاقہ کو کفار کے قبضہ سے نکالیں۔

تمام مساجد یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں جیسے جان سب کی سب قابلِ احترام ہیں۔ ایک جان کو قتل کرنا سب جانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے لیکن کسی مرد صالح اور عالم کو قتل کرنا اور بڑا جرم ہے پھر کسی نبیؑ کو قتل کرنا اتنا بڑا جرم ہے جس کا تصوّر کرنا بھی محال ہے۔

اَنَّہٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ...... (سورۃ المائدہ:32)

جس نے کسی ایک انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا اس نے گویا تمام انسانوں کو بچایا۔

اسی طرح جس نے ایک قابل احترام مسجد کو ڈھایا، اس نے گویا تمام مساجد کو ڈھایا اور جس نے ایک مسجد کو بچایا، گویا اس نے تمام مساجد کو بچایا۔

انسانوں میں جس طرح مراتب کے لحاظ سے فرق کیا جا سکتا ہے لیکن مطلق احترام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح مساجد میں فرق ہوسکتا ہے لیکن بلحاظ احترام بحیثیت مجموعی فرق نہیں ہے سب یکساں ہیں۔ کعبۃ اللہ، مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی انتہا درجہ جرم اور گناہ ہے اور اس کو برداشت کرنا انتہائی درجہ کی بے غیرتی اور بے ایمانی ہے۔ ایسے ہی کسی بھی مسجد کی بے حرمتی کو گوارہ کر لینا بھی نسبتاً کم درجہ کی سہی بے ایمانی اور بے غیرتی کی ہی بات ہوگی اور ایمان سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوسکتا۔ چھوٹی سے چھوٹی مسجد کی بے حرمتی کو جیتے جی برداشت کر لینا دعویٰ ایمان سے میل کھانے والی چیز نہیں ہوسکتی چاہے اس کی مصلحت خواہ کتنے ہی معصومانہ انداز سے بیان کی جائے اور یہ بیان خواہ کتنے ہی مقدس اسٹیج اور مسند ارشاد و افتاء سے جاری ہو، یہ اس دور کا المیہ ہے کہ کھلی ہوئی بے غیرتی اور ضعف ایمانی کو دینداری کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ذرا غور کیجئے مسجد کو مسجد، اور اللہ کا گھر سمجھنے اور کہنے کے باوجود اس کی بے حرمتی، اور مسماری کو آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود نہ کانوں پر جوں رینگے اور نہ آنکھوں سے خون ٹپکے، نہ دل دھڑکے، نہ ہاتھ اُٹھیں، نہ قدم آگے بڑھیں، نہ دل روئے، نہ ہمارے عیش و عشرت میں

خلل پڑے تو کہاں ہے ہمارا ایمان؟ اور کیسی ہے اللہ اور اس کے رسول سے ہماری محبت؟ اور کیا معنی رکھتی ہے دعوت و تبلیغ کی ہماری چیخ و پکار؟ ایسی زبان سے جس کے پیچھے محبت حق غیرت ایمانی اور سوز دل نہ ہو۔

جان خواہ کسی کی ہو کسی لکڑہارے کی ہو، کسی چرواہے کی ہو اس کو قتل کرنا تمام انسانوں کے قتل کے مترادف ہے اور اس کو بچانا تمام انسانوں کو بچانے کے برابر ہے کوئی مسجد خواہ کتنی ہی چھوٹی سی ہو، وہ محترم ہے اس کو منہدم کرنا تمام مساجد کو منہدم کر دینے کے ہم معنیٰ ہے اور اس کو بچانا تمام مساجد کو بچانے کے برابر ہے۔

## ہمارا جرم

جن لوگوں نے ایک بابری مسجد کو ڈھایا ہے انہوں نے گویا دنیا کی تمام مسجدوں پر وار کیا ہے اور جن لوگوں نے ایک مسجد کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور خاموش رہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے وہ بھی جرم میں شریک ہیں، وہ جنھوں نے اللہ کے ایک گھر پر پھاوڑا اور سبّل چلا کر تمام مساجد اللہ کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے ان کے جرم اور ظلم میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے لیکن کیا ہم جیسوں کا جرم بھی کچھ کم ہے؟

جو کہتے ہیں کہ بابری مسجد تا قیامت مسجد رہے گی جبکہ اس مسجد میں پتھر کی بے جان مورتیاں پوجی جا رہی ہیں اور مورتیوں کو ہٹانے کے لئے ذرا ہلنے اور جنبش کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں اور نہ اس کے لئے آمادہ ہیں کہ سڑک پر نکلیں اور پیروں میں گرد لگے، اور شیروانی، کرتے پائجامے پر شکن پڑے، اور استری ٹوٹ جائے۔ جیل جانا، پتھر کھانا، لاٹھی چارج کا سامنا کرنا تو دور کی بات ہے ساری دوڑ دھوپ کی انتہا پوری احتیاط کے ساتھ زبان و قلم کا استعمال ہے اور بس۔ حالانکہ زبان و قلم کا استعمال معقول لوگوں کے لئے کارآمد ہوتا ہے جن کے پاس کوئی کردار ہو، صحیح اور غلط کی جن کو تمیز نہیں، جنھیں شرم و حیا ہو۔

## ظالموں سے بات کرنا مفید نہیں

لیکن جو انسانیت اور معقولیت کی ساری حد پار کر چکے ہوں، جو اپنی طاقت اور قوت کے نشے میں چور ہوں۔ ظلم اور بے انصافی اور جور و جفا جن کا شیوہ بن چکا ہو اور جنھوں نے ملک بھر سے

لاکھوں افراد کو جمع کیا اور مسجد توڑ ڈالی، لیکن جب کمیشن کے سامنے بیان دینے کا وقت آیا تو پوری بے شرمی کے ساتھ کہہ دیا کہ ہم تو مسجد کو بچانے کے لئے گئے تھے جو اتنا سفید جھوٹ بول سکتے ہوں ان سے کسی معقولیت کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ جو اتنے بے شرم ہوں، ان سے کسی بھی بھلی بات کو تسلیم کرنے کی اُمید کون کرسکتا ہے؟ جن کے نزدیک نہ ہی اپنے ملکی قانون کا پاس ولحاظ ہے اور نہ بین الاقوامی اخلاق اور ضابطہ کی کوئی حیثیت ہے۔ ان کے سامنے کسی کی شیریں زبان اور پُراثر مدلل تحریر کیا معنی رکھتی ہے؟

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اور پھر

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت　　نہیں کام آتی دلیل اور حجت

وَلاَ تُجَادِلُوْآ اَهْلَ الْكِتَابِ اِلاَّ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﷺ اِلاَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ...... (سورۂ عنکبوت:46)

اہل کتاب سے مباحثہ نہ کرو مگر اچھے طریقہ سے، سوا ان لوگوں سے جو ان میں ظالم ہیں۔

اس آیت میں جہاں بحث ومباحثہ عمدہ طریقہ سے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے وہیں ظالموں سے مباحثہ کرنے سے صاف طور پر منع کیا گیا ہے اس لئے کہ مباحثہ سمجھنے سمجھانے کے لئے ہوتا ہے لیکن جو لوگ معقولیت سے عاری ہوں، اور ظلم پر کمر بستہ ہو چکے ہوں وہ بات کیا سمجھیں گے، وہ تو معقولیت کے ساتھ بات چیت کو کمزوری و بے بسی اور مسکنت پر محمول کریں گے، اسلام اہلِ حق کو شائستگی، شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی اور مسکینی نہیں سکھاتا کہ ظالم لوگ ان کو نرم چارہ سمجھ بیٹھیں۔ چنانچہ کھلے لفظوں میں مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ ظالم دشمنوں کو مرعوب اور ہیبت زدہ رکھنے کے لئے ہر طرح تیاری رکھو۔

## مسلمانوں کو ہدایت

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لاَ تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ

(سورۃ الانفال:60)

اور جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔

یہ مستقل جنگی تیاری رکھنے کی بات اسی لئے کہی گئی ہے کہ بہرصورت ہر زمانہ میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو افہام و تفہیم سے صحیح بات ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اور جن کو شر انگیزی سے روکنے کے لئے طاقت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے ورنہ حمایت حق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ نیز جو گروہ ساز و سامان اور فوجی طاقت کے لحاظ سے کمزور سمجھا جاتا ہے اس پر کوئی بھی دست درازی کرنے پر تل جاتا ہے اور اس کے برخلاف اگر کوئی دبدبہ والا ہو تو اس کی جان و مال اور اس کے قابلِ احترام تہذیبی مظاہر اور شعائر پر ہاتھ کیا انگلی اُٹھانے کی ہمت نہیں کرتا، اسی لئے ایک دوسرے مقام پر اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ ظالموں اور جباروں کے لئے نرم نوالہ نہیں ہوتے اور ان کی شرافت کا تقاضہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب وہ غالب ہوتے ہیں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیتے ہیں لیکن کوئی طاقتور اپنی طاقت و قوت کے زعم میں ان پر دست درازی کرتا ہے تو وہ عاجزی اور منت و سماجت نہیں کرتے بلکہ ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ان کے دانت کھٹے کر دیتے ہیں مومن کی شان یہ نہیں کہ وہ ظالم سے دب جائے اور متکبر کے سامنے سر جھکا دے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ (سورۂ شوریٰ:39-37)

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں اور جب انہیں غصہ آجاتا ہے تو درگزر کر جاتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے حکم پر لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات آپسی مشورے سے ہوتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ظلم و زیادتی کرنے والوں کا مقابلہ کرنا اور ان سے بدلہ لینا دینداری اور شانِ بندگی کے خلاف نہیں ہے۔

## دعوت اور محاذ آرائی

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ دعوتی حکمت عملی کا تقاضہ ہے کہ ظلم اور فسطائیت کو گوارا کر لیا جائے اور مقابلہ کے لئے سامنے نہ آیا جائے، ورنہ مقابلہ آرائی کی صورت میں دعوت کے مواقع ختم

ہو جائیں گے یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ دنیاوی اور مادی مفادات کے لئے کشمکش اور محاذ آرائی سے گریز کرنا چاہئے، لیکن جہاں تک باطل کے مقابلہ میں حق کے لئے کشمکش کرنے، شعائر اللہ کی حفاظت اور صیانت کرنے اور دین و ملت کی عزت اور شوکت کو باقی رکھنے کے لئے محاذ آرائی کا سوال ہے تو وہ مقصود و مطلوب ہے، اور اس سے بچنے کو دورِ اوّل میں نفاق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ معرکۂ حق و باطل میں جان و مال کی قربانی پیش کرنا اس وقت حقیقی اور سچے ایمان کی پہچان ہے۔

معلوم نہیں یہ غلط خیال کہاں سے لوگوں کے ذہنوں میں آ گیا ہے کہ محاذ آرائی کے ساتھ دعوت کا کام نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ۔ دعوت کی پوری تاریخ کشمکش اور محاذ آرائی کی تاریخ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوتی سرگرمیوں کی داستان دیکھ لیجئے، پھر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کوہِ صفا والی پہلی تقریر سے لے کر فتح مکہ تک کے واقعات اپنے سامنے رکھیئے۔ کتنے لمحے ہم آہنگی اور سکون کے گذارے ہیں؟ مکی دور میں جبکہ جہاد کا حکم نہیں آیا تھا۔ گھر گھر اور گلی گلی کیسی کشمکش اور کیسی منافرت کا دور دورہ تھا، شعب ابی طالب میں تین سال تک محرومی اور بائیکاٹ کشمکش کی بڑی مثال ہے۔ ہجرت حبشہ اور آخر میں ہجرت مدینہ کی آخر کیوں نوبت آئی؟ حالانکہ اس وقت اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام طور سے طاقت کا استعمال نہیں کر رہے تھے۔ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ انبیائی دعوت حق کو اہل کفر نے ٹھنڈے پیٹوں نہ کبھی برداشت کیا ہے اور نہ آئندہ کبھی کریں گے۔ اس لئے ہم آہنگی اور ماحول کو پرسکون بنانے کے لئے کھلے ہوئے دینی اور ایمانی تقاضوں کو پس پشت ڈالنا صحیح حکمت عملی نہیں ہو سکتی۔ پھر اس سوال پر غور کیجئے کہ مدینہ میں جب حکم جہاد آیا تو پورے دس سالہ مدنی دور میں کیا دعوت متروک ہو گئی تھی؟ جبکہ کم از کم ہر چالیس دن میں کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی جنگی مہم میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ضرور نکلے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی ایک ہی ہے کہ ناموس رسول، ناموس قرآن اور ناموس امت اسلامیہ کو بچانے اور کفر اور اہل کفر کو دبانے، مٹانے کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دعوت کا کام بھی جاری تھا۔ دورِ نبویؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے دور میں جنگوں اور فتوحات کے لمبے سلسلے کے ساتھ ساتھ دعوت کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ اس لئے یہ سوچنا اور کہنا کہ دعوت حق اور حمایت حق دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے، ایک ایسی فاش غلطی ہے جس

پر پوری دعوت وعزیمت کی تاریخ شاہد ہے۔ایک دوسرے پہلو سے سوچئے کہ حمایت حق کا جذبہ کسی بھی مصلحت کی خاطر کسی کے دل سے نکل جائے تو وہ دعوت کیا دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ حمایت حق کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضہ دعوت ہے۔ جب اصول نہیں ہوگا تو تقاضہ کا کیا سوال؟ تیسرے رخ سے مسئلہ کو دیکھئے۔ایک مرعوب اور مغلوب ذہن کی دعوت بھی بے جان دعوت ہوگی جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی، اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان میں دی جانی والی دعوتوں کا آج حال دیکھ لیجئے۔

انبیاء علیہم السلام اور صلحائے امت کی کوئی مثال ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس سے معلوم ہو کہ داعی نے ظلم اور بربریت کے سامنے سپر ڈال دی ہو اور دعوت کو بچانے کے نام پر حمایت حق کو چھوڑ کر ظالم کے سامنے سرنگوں ہو گیا ہو۔

دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ ایک داعی کے نزدیک دعوت کا حاصل اور اس کی منزل کیا ہے؟۔ اس کا جواب ایک لحاظ سے سادہ لفظوں میں یہ دیا جا سکتا ہے کہ دعوت کی منزل پوری زمین کو صحیح معنیٰ میں مسجد بنانا اور عدل وقسط سے زمین کو بھر دینا ہے۔تو جو داعی پوری زمین پر مسجد بنانے کی منزل تک پہنچنے کی آرزو رکھتا ہو، وہ ایک بنی بنائی ہوئی مسجد کو منہدم ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اور وہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ نہ کرے اور کہے کہ میں محاذ آرائی سے دعوتی مصلحت کی خاطر بچنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جو شخص پوری دنیا کو کلمہ پڑھانا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کلمہ پڑھنے والوں کو مرتد بنایا جارہا ہو اور وہ خاموش بیٹھا رہے۔اور کلمہ گو امت کو ارتداد سے بچانے کے لئے جدوجہد نہ کرے۔

پوری دنیا کو مسجد بنانے کا دعوی کرنے والا بنی بنائی مسجد کے تحفظ کی نہ سوچے، پوری دنیا کو کلمہ پڑھانے کا عزم رکھنے والا پہلے سے موجود کلمہ گو گروہ کی حفاظت نہ کرے، یہ کیسی تعجب انگیز بات ہوگی! ایسا تو نہیں کہ اندر سے سوچ وفکر میں کوئی بیماری لگ گئی ہو، دل میں تقویٰ اور خوف الٰہی کی جگہ نفاق کا سایہ پڑ رہا ہو؟

## شعائر اسلامی کی تعظیم

قرآن نے کہا:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○ (سورۃ الحج:32)　　اور جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

## شعائر کیا ہیں؟

شعائر جمع ہے ''شعرۃ'' کی۔ جس کے معنی علامت کے ہیں۔ شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔　　(معارف القرآن، سورۂ بقرہ:148)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان symbol ہو، اصطلاحِ دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے بطور ایک نشان اور علامت مقرر کئے گئے ہیں۔

(تدبر قرآن، سورۂ بقرہ:158)

مزید تشریح کے لئے دیکھئے.............

''ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدہ یا طرزِ فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعار کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لئے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور اپنے محکوموں سے بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی، زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیش، کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہیں۔ سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہیں۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی

شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے اگر وہ توہین کرنے والا، اسی نظام سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنیٰ ہے۔" (مولانا مودودیؒ)

مسجدیں اللہ کے شعائر ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر مسجدوں کو ویران کرنے والوں کو دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم کی وعید سنائی گئی ہے اور مسجد بنانے والے کو جنت میں اللہ گھر دے گا، اس کی خوش خبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی دی گئی ہے، اور قرآن میں مسجد کی آباد کاری اور تعمیر کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ مساجد کے احترام کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسجد سے متعلق جو چیز ہوگی وہ محترم بن گئی۔ مسجد میں جو سامان استعمال ہو گیا، خواہ وہ لکڑی کی جنس سے ہو یا کپڑے کی جنس سے، حتیٰ کہ مسجد کے کوڑا کرکٹ کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ مسجد، کعبۃ اللہ کا غلاف، کعبۃ اللہ کی جانب جانے والا قربانی کا جانور، بلکہ اس کے گلے کا پٹہ بھی محترم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰۤمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ......الخ (سورۃ المائدہ:2)

اے ایمان والو بے حرمتی نہ کرو۔ خدا تعالیٰ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینوں کی، اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی، اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں۔

اس آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام بھی لیا گیا۔ اب بتایئے مسجد جیسے شعائر اللہ کی نہ صرف حرمت پامال کی جائے بلکہ جڑ بنیاد سے اُکھاڑ پھینک دیا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی جگہ کو بت خانہ بنا دیا جائے اور دعویٰ ایمان کرنے والوں پر جوں بھی نہ رینگے۔ ان کے ایمان کی چنگاری بھڑکے تک نہیں بلکہ دبی کی دبی رہے تو ایمان اور تقویٰ کی کھوج کہاں کی جائے، اور ایسی حالت میں ایمان کی ہماری، خود ساختہ علامتوں کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟

کسی بھی نظام میں شعائر کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ موجودہ دور کی حکومتوں کو دیکھئے اپنے شعائر مثلاً اپنے جھنڈوں کا کتنا احترام کرتی ہیں، اور اس معاملہ میں کتنی حساسیت کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔

اگر اس میں شبہ ہو تو کسی ملک کے جھنڈے کو صرف پیروں تلے ڈال کر دیکھئے۔ سکھ قوم کے شعائر ٹمپل کی بے حرمتی کرنے والوں کو غیرت مند سکھوں نے برداشت نہیں کیا اور بے حرمتی کرنے والے لوگوں کو انہوں نے کیسا مزہ چکھایا۔ اگر ان کا ٹمپل ڈھا دیا گیا ہوتا تو نہیں معلوم ہندوستان میں وہ کیا قیامت برپا کر دیتے۔

## مسلمانوں کی بے غیرتی

غرض شعائر کی صرف اسلام ہی میں نہیں بلکہ ہر دین و مذہب میں بڑی اہمیت ہے۔ لیکن کچھ مسلمان اپنی بے غیرتی کو چھپانے کیلئے کہتے ہیں کہ ایک مسجد گئی تو گئی ہم کئی دوسری مسجدیں بنالیں گے۔ کبھی کہتے ہیں ہم عدالت کے فیصلہ کو مانیں گے۔ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ عدالتوں کو طاغوت کہتے رہتے ہیں، وہ بھی یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہم عدالت کا فیصلہ تسلیم کریں گے جو مفتیانِ کرام نکاح وطلاق کے مسئلہ میں موجودہ عدالتوں کا فیصلہ نہیں مانتے وہ بھی مسجد کے مسئلہ میں عدالت کا فیصلہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اعلان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کون ہے جو ملک کی عدالت کا فیصلہ نہ مانے گا، ہاں عدالت کے فیصلہ کو ماننے اور نہ ماننے کا سوال ان کے بارے میں ہو سکتا تھا جو اکثریت میں ہیں اور بابری مسجد توڑ کر جنہوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر دکھایا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ عدالتوں کے فیصلوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے بلکہ عدالتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کے فیصلہ کی تائید میں فیصلہ کریں۔ بہرصورت اس پورے پس منظر میں قرآن پاک کی آیات پر کم از کم غور تو کرنا چاہیئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝

(سورۂ محمد: 25-26)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہونے کے بعد مرتد ہو گئے ان کے لئے شیطان نے اس روش کو آسان بنا دیا اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لئے دراز کر دیا گیا ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ جن عدالتوں کے فیصلہ کو ہم برضا و رغبت تسلیم کرنے کا اعلان

کرتے ہیں وہ "اَلَّذِیْنَ کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ" میں شامل ہیں، بدرجۂ مجبوری ماننا اور تسلیم کرنا الگ بات ہے اور بخوشی تسلیم کرنا الگ ہے۔ پہلی صورت میں ہم کو ممکن ہے معذور قرار دیا جائے لیکن دوسری صورت میں ارتداد کے دائرہ میں داخل ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْآ اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْآ اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ط وَیُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلاً بَعِیْدًا ○

(سورۃ النساء:60)

اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

''یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو، لہٰذا یہ آیت اس معنیٰ میں تو بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات کو فیصلہ کیلئے لے جانا خود ایمان کے منافی ہے، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم وملزوم ہیں، اور اللہ اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا منافقت ہے''۔

آخر اس طرح کی قرآنی تصریحات کو کیوں نظر انداز کر دیا جا رہا ہے۔ جو بے شعور ہیں اور دینی حقائق سے بے بہرہ ہیں ان کی طرف سے اس طرح کی چوک اور کوتاہی قابلِ فہم ہو سکتی ہے لیکن جو صاحب علم وشعور ہیں ان کے اندر کتاب اللہ کے خلاف یہ جرأت اور دلیری قوم کی تباہی اور بربادی کو دعوت دینے والی ہے۔ اے کاش اس کا شعور ہمارے اندر پیدا ہو جائے اور اللہ کے غضب سے محفوظ ہو جائیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ o (سورۂ بقرہ:114)

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے روکے، اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے، ایسے لوگوں کے لئے نہیں ہے کہ وہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوں، ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں ایک بڑا عذاب ہے۔

اس آیت پر گفتگو سے پہلے ہم حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا تفسیری نوٹ درج کرتے ہیں:

''بہرحال آیت کا شانِ نزول تو مفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے، مگر اس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے، تاکہ یہ حکم انہیں نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کے لئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوامِ عالم کے لئے عام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے ''مساجد اللہ'' فرما کر تمام مساجد پر اس حکم کو عام کر دیا گیا، اور آیت کا مضمون یہ ہو گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے، یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہو جائے تو وہ بڑا ظالم ہے۔ مساجد اللہ کی عظمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو، ہیبت وعظمت اور خشوع وخضوع کے ساتھ داخل ہو، جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں''۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واحکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:

❶ اوّل یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں، جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبویؐ کی بے حرمتی ظلمِ عظیم ہے۔ اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے، اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی وعظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبویؐ ونیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے۔ ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دور دراز ملکوں سے سفر کرنے پہنچنا موجب ثواب عظیم اور باعثِ برکات ہے، برخلاف دوسری مساجد کے ان تینوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل جان کر اس کے لئے دور سے سفر کر کے آنے کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

❷ دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب

ناجائز وحرام ہیں، ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہی ہے کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز وتلاوت سے صراحۃً روکا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور وشغب کرکے یا اس کے قرب وجوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز وذکر وغیرہ میں خلل ڈالے، یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقات نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح وتلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں، مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذکر بالجہر کرنے لگے، تو یہ بھی نمازیوں کی نماز وتسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے اسی لئے حضرات فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو، اس وقت ذکر یا تلاوت جہر کا مضائقہ نہیں۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جس وقت لوگ نماز وتسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

③ تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوگیا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں، اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہوجائے اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لئے لوگ نہ آئیں، یا کم ہوجائیں، کیونکہ مسجد کی تعمیر وآبادی دراصل در ودیوار یا ان کے نقش ونگار سے نہیں، بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے، اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ. | یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر اور نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ |

اسی لئے حدیث شریف میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین وخوب صورت ہوں گی، مگر حقیقتاً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہوجائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ ؓ کا ارشاد ہے کہ شرافت وانسانیت کے چھ کام ہیں، تین حضر کے اور تین سفر کے۔ حضر کے تین یہ ہیں: ① تلاوت قرآن کرنا، ② مسجدوں کو آباد کرنا، ③ ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا

جو اللہ تعالیٰ اور دین کے کاموں میں امداد کریں اور سفر کے تین کام یہ ہیں: ① اپنے توشہ سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، ② حسن خلق سے پیش آنا اور ③ رفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی تفریح و خوش طبعی کا طرزِ عمل رکھنا، بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے۔

حضرت علی ﷺ کے اس ارشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں خشوع و خضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں، اور وہاں حاضر ہو کر ذکر و تلاوت میں مشغول رہیں، اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ ہوگی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہو جائیں یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع و خضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شانِ نزول واقعۂ حدیبیہ اور مشرکین مکہ کا مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انہیں منہدم کر دیا جائے، بلکہ مساجد جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہو جائے تو مساجد ویران کہلائیں گی''۔ (معارف القرآن)

آیت زیر بحث کے پہلے سے ذکر چلا آ رہا ہے یہود و نصاریٰ کے ان جرائم کا جن کی وجہ سے انہیں دنیا کی پیشوائی اور امامت و قیادت کے منصب اور درجہ سے ہٹایا گیا اور ان کی جگہ اُمت محمدیہؐ کو امت وسط بنا کر بٹھایا گیا جن کا فریضہ یہ بتایا گیا کہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے۔

یہ اہل کتاب اپنی دنیاوی وجاہت کو باقی رکھنے کے لئے ایک دوسرے کو بے دین بتاتے تھے، اور ایک دوسرے کو عبادت گاہوں سے روکتے تھے، یہودی نصاریٰ کی اور نصاریٰ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو اُجاڑنے اور ویران کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کا نام لینے سے روکنا اور عبادت گاہوں کو ویران کرنا بھی ان جرائم میں سے ایک جرم ہے جس کے بعد کوئی قوم عزت کے مقام پر باقی نہیں رکھی جاتی اور اس کے لئے دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب مقدر کر دیا جاتا ہے۔

چونکہ مشرکین ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کو کعبۃ اللہ سے روکتے تھے اس لئے آیت میں ایک طرف اہل کتاب کی دناءت اور شرات کو بتایا گیا ہے اور دوسری طرف

مشرکین مکہ کو بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اب تم بھی اپنے انجامِ بد کو پہنچنے والے ہو۔

آیت میں مساجد اللہ کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے لہٰذا کسی بھی مسجد میں اللہ کا نام لینے سے روکنے والے ظالم ٹھہریں گے۔ دیکھئے آیت میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔

① جو کسی بھی مسجد کو ویران کرنے کی کوشش کرے گا اور جو کوئی کسی مسجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع کرے گا وہ اللہ کے نزدیک بڑا ظالم قرار پائے گا۔ قرآن میں دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ظالموں کا بڑا برا انجام ہونے والا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ | اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا |
| لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ | ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔ |
| لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ | ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے۔ |

قرآن کی ان وعیدوں کے پیش نظر خود مسلمانوں کو بھی بہت محتاط رہنا چاہئے، اس لئے کہ مسلمان بھی بسا اوقات اللہ کے ذکر سے، اور تلاوت قرآن اور درسِ قرآن سے اپنے باہمی فروعی اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے کے لئے مسجدوں کے دروازے بند کر دیتے ہیں، اور انتظام کے نام پر ایسی پابندیاں لگا دیتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ کا نام لینے سے رُکاوٹ ہوتی ہے۔ مساجد کی کمیٹیاں یقیناً یہ حق رکھتی ہیں کہ جن کو چاہیں روکیں اور جن کو چاہیں اجازت دیں، لیکن ان کا یہ اختیار مساجد میں اللہ کا نام لینے سے منع کرنے کو جائز قرار نہیں دے سکتا۔ کمیٹیوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیارات کا استعمال شریعت کے تابع رکھیں ورنہ ان پر بھی وعیدیں لاگو ہوں گی، اور وہ بھی ظالموں کے زمرہ میں شامل ہوں گی۔

مساجد کو ویران کرنے کی کوشش دو ② طریقے سے ہوسکتی ہے ایک یہ کہ اللہ کا ذکر کرنے والوں کو مسجد تک جانے سے روک دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مسجد کو منہدم کر دیا جائے، ان دونوں صورتوں کا ذکر ہمارے قدیم مفسرین نے کیا ہے اور ان دونوں صورتوں کی مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا کنٹرول ہے وہ طرح طرح کی پابندیاں مسلمانوں پر لگاتے ہیں اور ہندوستان میں بابری مسجد کو بالکل منہدم کر دیا گیا۔

تفسیر جلالین میں آیات کی تفسیر پڑھیئے۔

| | |
|---|---|
| مَنْ اَظْلَمُ | یعنی کوئی بڑا ظالم نہیں ہے |
| مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ | یعنی نماز اور تسبیح سے روکے۔ |
| وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا | یعنی منہدم کر کے، معطل کر کے |
| اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ | انداز خبر دینے کا ہے لیکن منشا، حکم دینا ہے۔ یعنی ان کو جہاد کے ذریعہ خوف زدہ کرو تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ داخل نہ ہوں۔ |
| لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ | ذلت ہے قتل کی صورت میں یا قید ہونے کی صورت میں یا جزیہ دینے کی صورت میں |

تفسیر بیضاوی میں یہ آیت نقل کرنے کے بعد علامہؒ نے لکھا ہے:

عَامٌّ لِكُلِّ مَنْ خَرَّبَ مَسْجِداً وَسَعٰى فِىْ تَعْطِيْلِ مَكَانٍ مَرَشَّحٍ لِلصَّلٰوةِ وَاِنْ نَزَلَ فِى الرُّوْمِ. یعنی یہ حکم عام ہے ہر اس کے لئے جس نے کسی مسجد کو ویران کیا یا نماز کے لئے تیار کی ہوئی کسی جگہ کو معطل کرنے کی کوشش کی، اگرچہ آیت اہلِ روم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

'سَعٰى فِىْ خَرَابِهَا' کی تفسیر بالهدم او التعطيل کے الفاظ میں کیا ہے:

مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا...... کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "یعنی حق نہیں ہے کہ وہ ان میں داخل ہوں مگر اس حال میں کہ وہ مسلمانوں سے ڈر رہے ہوں کہ مسلمان انہیں دبوچ لیں گے چہ جائے کہ اُلٹا وہ مسلمانوں کو روکیں۔"

اس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ان ظالموں کو خوف و دہشت میں رکھیں۔ اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے تفسیر کبیر کے یہ الفاظ دیکھئے۔

② "وَاِنْ كَانَ لَفْظُهٗ لَفْظُ الْخَبَرِ لٰكِنِ الْمُرَادُ مِنْهُ اَلنَّهْىُ عَنْ تَمْكِيْنِهِمْ مِّنَ الدُّخُوْلِ" یعنی لفظ اور اندازِ بیان خبر دینے کا ہے لیکن مقصود منع کرنا ہے اور مسلمانوں کے لئے اس میں حکم ہے کہ تم ان ظالموں کو مسجد میں داخل نہ ہونے دو اور وہ مسجد پر قبضہ نہ کر سکیں۔"

اس حکم کو ذہن میں رکھئے اور تصور کیجئے اس صورتِ حال کا کہ ہمارے سامنے ایک مسجد کو نہ

صرف ویران کیا گیا بلکہ اس پر قبضہ کیا گیا اور پھر اس کو بنیاد سے اکھیڑ پھینکا گیا اور پھر وہاں بت خانہ بنا کر بتوں کی پوجا ہو رہی ہے، اور ہم ہیں کہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو مسجدِ اقصیٰ کے مقابلہ میں بابری مسجد کا معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ مسجد اقصیٰ پر تو یہود کا صرف قبضہ ہے لیکن یہاں تو مسجد کی عمارت کو نیست و نابود کر دیا گیا، اور مزید آگے بڑھ کر وہاں مورتیاں رکھ کر پوجا پاٹ ہو رہی ہے اور کسی مسلمان کو اس کے قریب تک جانے نہیں دیا جا رہا ہے۔

الغرض "مَا كَانَ لَهُمْ" میں محض ایک بات کی خبر نہیں دی جا رہی ہے بلکہ ایک حکم دیا جا رہا ہے کہ دیکھو ایسا نہ ہونے دو کہ مشرکین مسجد پر قبضہ کر لیں۔



# شعائر اللہ: علماء و مفسرین کی نظر میں

از: شفیق الرحمٰن

شعائر اللہ قرآن مجید کی ایک نہایت اہم بلکہ بہت بنیادی اصطلاح ہے، جو ایک طرح سے پورے دین پر حاوی ہے، اس میں جہاں احکامِ الٰہی شامل ہیں وہیں اس کے عملی مظاہر بھی شامل ہیں اور اسی طرح اس میں وہ مقامات بھی شامل ہیں جنہیں اسلام کی رو سے مقامات عبادات کہتے ہیں، علماء و فقہاء نے واضح قرآنی نصوص اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں اس کی جو تعیین کی ہے، اس کے مطابق جس طرح بیت اللہ شریف ایک شعیرہ ہے اسی طرح وہ تمام مساجد بھی شعائر اسلام میں داخل ہیں جو دنیا کے کسی بھی گوشہ میں پائی جاتی ہوں اور ایک مومن کے لئے ان کا احترام بھی ٹھیک اسی طرح واجب ہے جس طرح بیت اللہ شریف کا احترام اس کے لئے لازم ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے درجات میں فرق ہے، تاہم حکم تعظیم دونوں کے لئے یکساں ہے، امت کا اس معاملہ میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا ہے، قرآن مجید میں اس سلسلے میں بہت واضح احکام دئے گئے ہیں، کتاب اللہ میں چار مقامات پر اس کا تذکرہ آیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ (سورۃ البقرہ:158)

**ترجمہ:** ”یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں“۔

② يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (سورۃ المائدہ:2)

**ترجمہ:** ”اے ایمان لانے والو! خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو“۔

③ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ (سورۃ الحج:32)

**ترجمہ:** ”یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے“۔

④ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ (سورۃ الحج:36)

**ترجمہ:** ”اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے، تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے“۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں فلسفہ شعائر اسلام سے بحث کی ہے اور اس کی حقیقت کو واضح کیا ہے، علماء وفقہا نے شعائر اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے ان شعائر کی فہرست بھی پیش کی ہے، شاہ محمد عیسیٰ فردوسی نے اپنی ایک تصنیف عقیدۂ اسلامی (مطبوعہ مکتبہ اہل قلم دہلی) میں اس کی تفصیل بیان کی ہے، جس کے مطابق درج ذیل چیزیں شعائر اسلام میں داخل ہیں:

1. کتاب اللہ
2. اذان و جماعت
3. مسجد
4. جمعہ
5. طواف کعبہ، حج وغیرہ
6. جانور کی قربانی (عیدالاضحیٰ کے موقع پر)
7. تکبیرات تشریق
8. عقیقہ
9. عیدین
10. ختنہ
11. مقامات مقدسہ
12. امامت وخلافت
13. تبلیغ ودعوت دین
14. ہجرت
15. جہاد
16. سلام کرنا
17. داڑھی
18. مونچھیں
19. ناخن ترشوانا
20. موئے بغل وزیرناف صاف کرنا
21. حجاب
22. عربی زبان
23. تکفین وتجہیز
24. مظلوم کی اعانت۔

20 ویں صدی کے بعض معروف مفسرین قرآن نے اس قرآنی اصطلاح کی جو حقیقت بیان کی ہے اور اس قرآنی حکم کے مقصد و مدعا پر جو روشنی ڈالی ہے ذیل کی سطروں میں اسے نقل کیا جا رہا ہے:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے شعائر اللہ کی تشریح یوں فرمائی ہے:

''ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرز فکر یا عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعار کہلائے گی کیونکہ وہ اس کے لئے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے، سرکاری جھنڈے، فوج اور پولس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکموں سے بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں، گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں، چوٹی اور زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں اور کڑا اور درانتی

اشتراکیت کا شعار ہے، سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہے، یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں، اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنیٰ ہے۔''

''شعائر اللہ سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک وکفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں، ایسی علامات جہاں جس ملک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو''۔

(سورہ المائدہ: آیت 2 کے تحت تشریحی نوٹ)

مولانا محمد جوناگڑھی نے اپنے ترجمے میں (اس کے تفسیری حواشی مولانا صلاح الدین یوسف نے لکھے ہیں) اس کی تشریح کچھ اس طرح فرمائی ہے:

''شعائر شَعِيْرَةٌ کی جمع ہے، اس سے مراد حرمات اللہ ہیں، (جن کی تعظیم وحرمت اللہ نے مقرر فرمائی ہے)، بعض نے اسے عام رکھا ہے اور بعض کے نزدیک یہاں حج وعمرہ کے مناسک مراد ہیں یعنی ان کی بے حرمتی اور بے توقیری نہ کرو، اسی طرح حج وعمرے کی ادائیگی میں کسی کے درمیان رکاوٹ بھی مت بنو، کہ یہ بھی بے حرمتی ہے۔'' (سورہ المائدہ: 2)

ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے:

''شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنیٰ علامت اور نشانی کے ہیں۔ شعائر اللہ وہ ہیں جو اعلام دین یعنی اسلام کے نمایاں امتیازی احکام ہیں جن سے ایک مسلمان کا امتیاز اور تشخص قائم ہوتا ہے اور دوسرے اہل مذاہب سے الگ پہچان لیا جاتا ہے، ان کی تعظیم کا مطلب ان کا استحسان اور امتنان ہے، اس تعظیم کو دل کا تقویٰ قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ دل کے ان افعال سے ہیں جن کی بنیاد تقویٰ ہے''۔

(سورہ الحج: 32)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اسیر مالٹا نے اپنے ترجمہ قرآن میں (جس کے تفسیری حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھے ہیں) شعائر اللہ کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا ہے: یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت ومعبودیت کے لئے علامات اور نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی

مت کرو، ان میں حرم محترم بیت اللہ شریف، جمرات، صفا و مروہ، ہدی، احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں۔ (سورہ المائدہ:2)

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ میں سورۃ الحج کی آیت 32 کے تحت جو حاشیہ لکھا گیا ہے اس میں اس کی تشریح کچھ اس طرح کی گئی ہے: یعنی شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں، جس کے دل میں پرہیز گاری کا مضمون اور خدائے واحد کا ڈر ہوگا وہ اس کے نام لگی ہوئی چیزوں کا ادب ضرور کرے گا، یہ ادب کرنا شرک نہیں بلکہ عین توحید کے آثار میں سے ہے کہ خدا کا عاشق ہر اس چیز کی قدر کرتا ہے جو بالخصوص اس کی طرف منسوب ہو جائے۔ (سورہ الحج:32)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اس کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

حکم دوم تحریم ترک تعظیم شعائر

''اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ (کے دین) کی نشانیوں کی (یعنی جن چیزوں کے ادب کی حفاظت کے واسطے خدا تعالیٰ نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں ان احکام کے خلاف کر کے ان کی بے ادبی نہ کرو)''۔ (سورہ المائدہ:2)

ایک دوسری جگہ وہ فرماتے ہیں:

یہ دو امر پر دال ہے ایک یہ کہ اصل محل تقویٰ کا قلب ہے دوسرے یہ کہ معالم دین کی تعظیم (حد شرعی کے اندر) جس میں انبیاءؑ و اولیاءؒ کے آثار بھی داخل ہو گئے مشروع ہے۔ (الحج:32)

حضرت مولانا نے لکھا ہے:

''اس تعظیم کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی تعظیم ہے''۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں شعائر اللہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے''۔ (سورہ البقرہ:158)

آپ مزید فرماتے ہیں: ''شعائر اسلام ان اعمال و افعال کو کہا جائے گا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامتیں سمجھے جاتے ہیں اور محسوس و مشاہد ہیں جیسے نماز، اذان، حج، ختنہ اور سنت کے موافق داڑھی وغیرہ شعائر اللہ کی تفسیر اس آیت میں مختلف الفاظ میں منقول ہے مگر صاف بات وہ ہے جو بحر

محیط اور روح المعانی میں حضرت حسن بصریؒ اور عطاؒ سے منقول ہے اور امام جصاصؒ نے اس کو تمام اقوال کے لئے جامع فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعائر اللہ سے مراد وہ تمام شرائع اور دین کے مقرر کردہ واجبات وفرائض اوران کی حدود ہیں، اس آیت میں: لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ کے ارشاد کا یہی حاصل ہے کہ اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو اور شعائر کی بے حرمتی ایک تو یہ ہے کہ سرے سے ان احکام کو نظر انداز کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ ان پر عمل تو کریں مگر ادھورا کریں پورا نہ کریں، تیسرے یہ کہ مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے آگے بڑھنے لگیں، لَا تُحِلُّوْا شَعَائِرَ اللّٰهِ میں ان تینوں صورتوں سے منع فرمایا گیا ہے''۔ (سورہ المائدہ:2)

سورہ حج میں مذکور اس اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے: ''شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنیٰ علامت کے ہیں جو چیزیں کسی خاص مذہب یا جماعت کی علامت خاص سمجھی جاتی ہوں وہ اس کے شعائر کہلاتے ہیں، شعائر اسلام ان خاص احکام کا نام ہے جو عرف میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں، شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقویٰ کی علامت ہے ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوف خدا ہو''۔ (سورہ الحج:32)

مولانا امین حسن اصلاحیؒ نے اپنی مشہور تفسیر تدبر قرآن میں شعائر اللہ کی حقیقت اور مقصد و مدعا پر نہایت مفصل روشنی ڈالی ہے، آپ نے لکھا ہے: ''شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنیٰ کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان (Symbol) ہو، اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کئے گئے ہوں، ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں لیکن یہ مقرر کئے ہوئے اللہ اور رسولؐ کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں، مثلاً قربانی، حقیقت اسلام کا ایک مظہر ہے، اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دے، اپنی کوئی محبوب سے محبوب چیز بھی اس سے دریغ نہ رکھے۔ اس حقیقت کا عملی مظاہرہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی قربانی کر کے فرمایا، وہ تاریخ انسانی کا ایک بے نظیر واقعہ ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار میں جانوروں کی قربانی کو ایک شعیرہ کے طور پر مقرر فرما دیا تا کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کے اندر اسلام کی اصل

حقیقت برابر تازہ ہوتی رہے۔

اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے، یہ پتھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اس روایت کا ایک نشان ہے کہ اس کو بوسہ دے کر یا اس کو ہاتھ لگا کر بندہ اپنے رب کے ساتھ اپنے عہد بندگی اور اپنے میثاق اطاعت کی تجدید کرتا ہے، چنانچہ بعض حدیثوں میں اس کو یمین اللہ (خدا کا ہاتھ) سے تعبیر کیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ جب اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو گویا وہ خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس سے تجدید بیعت کرتا ہے اور جب اس کو بوسہ دیتا ہے تو گویا یہ اس کی طرف سے خدا کے ساتھ عہد محبت و وفاداری کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی طرح جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں، یہ نشانات اس لئے قائم کئے گئے ہیں کہ حجاج ان پر کنکریاں مار کر اپنے عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں پر خواہ وہ ابلیس کی ذرّیات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا انسانوں کے کسی گروہ سے، لعنت کرتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کے لئے ہر وقت مستعد ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس بیت اللہ بھی ایک شعیرہ بلکہ سب سے بڑا شعیرہ ہے جو پوری امت کا قبلہ اور توحید و نماز کا مرکز ہے اس کے ارد گرد طواف کر کے اور اپنی نمازوں اور اپنی تمام مسجدوں کا اس کو قبلہ قرار دے کر ہم اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جس خدائے واحد کی عبادت کے لئے یہ گھر تعمیر ہوا، ہم اسی کے بندے، اسی کی طرف رخ کرنے والے، اسی کے عبادت گزار اور اسی کی شمع توحید پر پروانہ وار نثار ہیں۔

اسی طرح صفا و مروہ بھی اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں ان کے شعائر میں سے ہونے کی وجہ عام طور پر تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ انہی دونوں پہاڑیوں کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے پانی کی تلاش میں تگ و دو کی تھی لیکن استاذ امامؒ (مولانا حمید الدین فراہی) کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ اصل قربان گاہ مروہ ہے، یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ اور غلامانہ سرگرمی دکھائی۔ اس وجہ سے ان دونوں پہاڑیوں کو شعائر میں سے قرار دے دیا گیا اور ان کی سعی یادگار ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی گئی۔

ان شعائر اللہ سے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہئے:

ایک یہ کہ شعائر اللہ، اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ ہیں، کسی دوسرے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو دین کے شعائر میں سے قرار دے دے یا جو چیز شعائر میں داخل ہے اس کو شعائر کی فہرست سے خارج کر دے، دین میں اس قسم کے من مانے تصرفات سے شرک و بدعت کی راہیں کھلتی ہیں، جن قوموں نے اپنے جی سے شعائر قرار دئے، تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اس طرح شرک و بت پرستی کی راہیں کھول دیں۔

دوسری یہ کہ جس طرح شعائر، اللہ کے مقرر کردہ ہیں اسی طرح اسلام کے ان شعائر کی تعظیم کے حدود بھی خدا اور رسولِ خداؐ ہی کے مقرر کردہ ہیں، جس شعیرہ کی تعظیم کی جو شکل شریعت میں ٹھہرا دی گئی ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کی واحد شکل ہے، جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے، اس سے سرِ مو انحراف نہ صرف اس شعیرہ کی حقیقت سے انسان کو محروم کر دینے والی بات ہے بلکہ اس سے شرک و بدعت کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ حجر اسود ایک شعیرہ ہے، اس کی تعظیم کے لئے اس کو حالت طواف میں بوسہ دینے یا اس کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوم لینے یا اس کی طرف اشارہ کرنے کی شکلیں خود دین کے لانے والے کی طرف سے مقرر کر دی گئی ہیں، اگر کوئی شخص تعظیم کی صرف انہی شکلوں پر قناعت نہ کرے بلکہ تعظیم شعائر اللہ کے جوش میں وہ اس پتھر کے آگے گھٹنے ٹیکنے لگے یا اس کے سامنے نذریں پیش کرنے لگے یا اس پر پھول نثار کرنے لگے یا اس طرح کی کوئی حرکت کرنے لگے تو ان باتوں سے وہ نہ صرف یہ کہ اس حقیقت سے بالکل دور ہو جائے گا جو اس شعیرہ کے اندر مضمر ہے بلکہ وہ شرک و بدعت میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری یہ کہ ان شعائر میں اصل مطمح نظر وہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتی ہیں ان حقیقتوں کے اظہار کے لئے یہ شعائر گویا قالب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے ملت کی زندگی کے لئے سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں یہ حقیقتیں برابر زندہ اور تازہ رکھی جائیں، اگر یہ اہتمام سرد پڑ جائے تو دین کی اصل روح نکل جاتی ہے، صرف قالب باقی رہ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں کی اصل توجہ صرف قوالب پر مرکوز ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین صرف ایک مجموعۂ رسوم بن کر رہ جاتا ہے۔ (سورہ البقرہ:158)

شعائر اللہ سے دین کے اعلام یعنی نشانیاں مراد ہیں خواہ وہ مقامات ہوں جیسے کعبہ، عرفات، مزدلفہ، جمار ثلثہ، صفا، مروہ، منیٰ، مساجد یا ازمنہ جیسے رمضان، اشہر حرام، عید الفطر و اضحیٰ، جمعہ، ایام

تشریق یا دوسری علامات جیسے اذان، اقامت، نماز با جماعت، نماز جمعہ، نماز عیدین، ختنہ، یہ سب شعائر دین ہیں۔ (سورہ البقرہ: 158)

(ترجمہ: حضرت مجدد اعظم، علامہ احمد رضا خاں بریلویؒ، تفسیر: مولانا مولوی محمد نعیم الدین صاحب)

دورِ جدید کے مشہور عرب مفسر قرآن سید قطب شہیدؒ نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں سورہ الحج کی 36 ویں آیت کی تشریح میں لکھا ہے:

''اسلام کے یہ شعائر اور مناسک مقرر ہیں، عبادات اور عبادات کے مقامات متعین کئے گئے ہیں اور ان کا احترام ضروری قرار دیا گیا ہے، اس لئے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو ان شعائر کا احترام قائم کرے، آزادی فکر و نظر کے حق کو قائم کرے اور ہر شخص کے لئے ایسے مواقع پیدا کرے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اللہ کی پرستش کر سکے، نیز مقامات عبادات کے تقدس کو بھی قائم رکھ سکے، نیز یہ ممکن بنایا جا سکے کہ مومنین، عابدین اور عمل صالح کرنے والے نیک لوگ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق نظامِ زندگی قائم کر سکیں جس کا ایک طرف سے رابطہ اللہ تعالیٰ سے ہو اور دوسری جانب سے وہ نظام اس دنیا کے تمام انسانوں کے لئے موجب خیر و برکت ہو، غرض دنیا و آخرت کی بھلائی کا ضامن ہو، یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ اب اللہ کی راہ میں ہتھیار اُٹھا سکتے ہیں تا کہ وہ اپنی ملت کی مدافعت کر سکیں، اپنے نظریہ اور عقیدہ کی مدافعت کر سکیں، اگر کوئی دشمن ان کے علاقہ پر حملہ آور ہو تو اس کا دفاع کر سکیں کیونکہ مسلمانوں پر ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گئے ہیں، اس قتال کا مقصد وحید صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے بشمول اہل اسلام عقائد و نظریات کی آزادی قائم ہو سکے، اللہ کے دین کے نظام کے اندر، اللہ کی نصرت کا وعدہ حقیقت کا روپ اختیار کر سکے اور وہ دین اسلام اور نظام اسلام کے وہ فرائض ادا کر سکیں جن کا ذکر اسی سورہ کی آیات 41-38 میں آیا ہے''۔

مذکورہ بالا آیات و احکام کی روشنی میں جہاں مسئلہ فلسطین، ارض فلسطین اور مسجد اقصیٰ کی حیثیت و اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے، اس سے بابری مسجد کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس سے رہنمائی ملتی ہے، حیرت ہے کہ اتنے واضح قرآنی احکام کی موجودگی میں بھی ہمارے بعض بزعم خویش اسلامی دانشور مسلمانان عالم کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کے حل کے سلسلہ میں مغرب کا جو فارمولا ہے اس کو قبول کر لینا چاہئے کیونکہ اس مسئلہ کا اس سے بہتر حل اور کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا،

بعض فریب خوردہ اور نادان مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 242 اور 338 کی روشنی میں حل کیا جانا چاہئے حالانکہ ان قراردادوں کو تسلیم کرنے کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور پرامن بقائے باہم کے اصول پر کاربند رہنے کے قائل ہی نہیں بلکہ پابند ہیں، بعض نادان مسلمان تو اب یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ دنیا کے ہر شخص کو اس سلسلہ میں تجویز پیش کرنے کا حق حاصل ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ارض فلسطین بلکہ مسجد اقصیٰ پر تو یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی دعویٰ ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ ان کی مذہبی تعلیمات پر مبنی ہے، پہلی بات تو یہ کہ ان کی مذہبی کتابوں کی پہلے تحقیق ہونی چاہئے کہ وہاں ایسی کوئی بات مذکور ہے یا نہیں کیونکہ ایک تحقیق کے مطابق یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی ہے (دجال، جلد اول، مصنفہ اسرار عالم، صفحہ 164-160) اور اگر بالفرض ایسی کوئی چیز وہاں موجود بھی ہے تو فیصلہ قرآن وحدیث کی بنیاد پر ہوگا کیونکہ قرآن مجید کے نزول کے بعد اُس سے پہلے کے صحائف منسوخ قرار دے دیئے گئے ہیں، یعنی اب ان کی قانونی حیثیت نہیں رہ گئی ہے بلکہ شریعت محمدیؐ کے آجانے کے بعد دوسری تمام شریعتیں از خود منسوخ ہوگئیں، لہٰذا اس کا فیصلہ قرآن واحادیث کی روشنی میں ہی کیا جائے گا، بعض مسلمان تو یہ تک کہنے لگے ہیں کہ اس مسئلہ کا یعنی مسجد اقصیٰ کے مسئلہ کا دین اور اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے، انہیں مذکورہ بالا آیات اور تشریحات کی روشنی میں اپنے موقف بلکہ ایمانی حالت پر دوبارہ غور کر لینا چاہئے، اس لئے کہ ان کا یہ نقطۂ نظر محض کسی مسجد یا زمین کی جو شعائر اللہ میں سے ہے توہین ہی نہیں بلکہ دین اللہ کی حیثیت کو مجروح کرتا ہے۔ ان کو گزشتہ 70 برسوں کے دوران ارض فلسطین کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں جاری کئے جانے والے فتاویٰ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے، علماء حق نے بہت واضح الفاظ میں کہا ہے کہ فلسطین کی زمین کا یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کیا جانا حرام ہے، ابھی حال ہی میں بیت المقدس شریف اور فلسطین کے مفتی عام الشیخ عکرمہ سعید صبری نے ان فتاویٰ کی تائید وتصدیق کرتے ہوئے ایک اور فتویٰ جاری کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

**"ان التعویض عن الارض الفلسطینیة کبیعها سواء بسواء ولا یجوز مطلقا شرعاء و ینطبق علی الذی یاخذ التعویض عن ممتلکاته الفتویٰ الصادره عن علماء فلسطین منذالثلاثینات من القرن الماضی وَ التی تنص علی التحریم القطعی لان**

الارض الفلسطينية ليست سلعة للبيع والشراء، فهي وقفية مباركة مقدسة، كما ان علماء الامة الاسلامية وقتئذ وحتى يومنا هذا قد اصدروا فتاوىٰ مويدة لهذه الفتوى. (الدعوۃ، العدد، 102، جمادی الآخرہ، 1421 ہجری)

**ترجمہ**: فلسطین کی سرزمین میں کسی جگہ کا تبادلہ اس کو بیچنے جیسا ہے اور یہ از روئے شرع مطلق جائز نہیں ہے اور جو شخص اپنی کسی جائداد کے عوض معاوضہ حاصل کرتا ہے اس پر وہ فتویٰ منطبق ہوتا ہے جو علماءِ فلسطین نے گزشتہ صدی کے تیسرے عشرے میں دیا تھا جو کہ اس فروخت کے قطعی حرام ہونے پر نص کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ سرزمین فلسطین کوئی خرید وفروخت کی چیز نہیں ہے یہ تو ایک مقدس اور مبارک وقف جائداد ہے، ٹھیک اسی طرح سے امت مسلمہ کے علماء اس وقت سے لے کر آج تک اس فتوے کی تائید میں برابر فتوے دیتے رہے ہیں۔ (ارض فلسطین کی شرعی حیثیت اور اس کے سلسلہ میں 1930ء کے بعد سے لے کر آج تک جاری ہونے والے فتاویٰ کے لئے ملاحظہ ہو:

فتویٰ علماء المسلمین بتحریم التنازل عن ای جزءٍ من فلسطین، مطبوعہ جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی، الکویت)

اس فتوے کی روشنی میں بابری مسجد کے سلسلے میں اختیار کئے جانے والے موقف کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور شعائر اللہ کی تفہیم بھی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ ☐ ☐ ☐

# قضیہ بابری مسجد اور شریعتِ اسلامی

مفتی صباح الدین ملک

① قضیہ کیا ہے؟

بابری مسجد کا قضیہ ایک معروف قضیہ ہے۔ برادرانِ وطن کے ایک گروہ کا مطالبہ ہے کہ اجودھیا میں کئی سو سال سے قائم اور آباد مسجد رام مندر بنانے کے لئے ان کے حوالہ کر دی جائے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق مسجد کی جگہ ہی شری رام کا جنم استھان ہے۔

یہ عقیدہ انہیں حکم دیتا ہے کہ وہ ہر قیمت پر مسجد کی زمین پر قبضہ کر کے اس مقصد کی تکمیل کریں۔ مسلمان تو ان کے سامنے کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ عدالت اور حکومت سے بھی انہیں اس کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا چیلنج ہے کہ اگر رام جنم استھان بابری مسجد نہیں ہے تو عدالت اور حکومت بتائے کہ یہ استھان کہاں ہے؟

اس مہم میں اب تک جو کامیابی انہیں ملی ہے وہ یہ کہ پہلے چوری چھپے مسجد میں ایک مورتی بٹھا دی گئی۔ حکومت نے مفاد عامہ اور قانون کے نام پر اس کی حفاظت کے لیے مسجد میں تالا لگا دیا۔ دوسرے مرحلہ پر تالا کھول دیا گیا تا کہ مورتی کا درشن اور پوجا کی جا سکے۔ مسلمانوں پر پابندی برقرار رہی۔ تیسرے مرحلہ پر ریاستی اور مرکزی حکومت نے اجودھیا کو نراج کی حالت میں چھوڑ کر ہندوتوا بلوائیوں اور دہشت گردوں کو مسجد کے انہدام کا پورا موقع دیا۔

اس مہم کے پورے عرصے میں مسلمانوں کو جان و مال کا جتنا نقصان پہنچانا ممکن ہو سکا، پہنچایا گیا اور آخر میں (جو کہ آخری نہیں ہے) گودھرا واقعہ کی سازش کر کے گجرات قتل عام کا سامان کیا۔

اس مہم میں ان دہشت گردوں کو سرگرم یا خاموش مددان کے ہم مذہب ہر طبقہ اور ہر حلقہ سے حاصل ہوئی، عدالت، حکومت، سیاست، صحافت اور تجارت ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں نے ان کی بھرپور مدد کی ان سب کے باوجود موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ:

رام جنم بھومی فریق اس مسئلہ کو 'عدالت' سے باہر رکھ کر محض طاقت سے حل کرنا چاہتا ہے اور یہی

اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس فریق کو اور دنیا کو معلوم ہے کہ ان کے پاس ''عقیدہ'' کے سوا اور کوئی ثبوت وشواہد نہیں ہیں اور یہ عقیدہ بھی ''عقل ونقل'' سے ثابت نہیں ہے جیسا کہ ہندو مت کے تمام عقیدوں کا حال ہے۔

مسلم فریق ہندتو فریق کی طاقت کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں کسی بھی طرح نہیں ہے۔ بالفرض اگر ہوتا تب بھی انصاف پسندی کا تقاضہ یہی تھا کہ عدالت سے معاملہ کا تصفیہ کرایا جاتا۔ چنانچہ مسلم فریق نے جیسا کہ ملکی قانون وعدالت کے احترام کا تقاضا ہے، عدالت کے فیصلہ کو ماننے کا مسلسل اور بار بار یقین دلایا ہے۔ اس فریق کی سب سے بڑی مضبوطی یہی ہے۔ یہ فریق جانتا ہے کہ مسجد ہر اعتبار سے ایک جائز ملکیت پر بنی ہے اور فریق ثانی کا دعویٰ محض بے بنیاد ہے۔

ملک میں دو طرح کے لوگ اور ہیں۔ ایک وہ جن کو اس مسئلہ میں حقیقت اور انصاف کے پہلو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ مسئلہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائے۔ چنانچہ جب وہ دیکھتے اور سمجھتے ہیں کہ ہندتو فریق مضبوط ہے اور کسی طرح مان کر نہیں دے گا اور فریق مسلم کمزور ہے اور اسے حقیقی اور فرضی خطرات واندیشے سے ڈرا کر دبایا جا سکتا ہے تو وہ ایسی تجویزیں پیش کرتے ہیں جو دراصل ہندتو فریق کے حق میں ہوتی ہیں اور ان تجویزوں کے معاملہ میں وہ مسلم فریق کے موقف کو یا تو سنتے ہی نہیں اور اگر کچھ بے دلی سے سنتے بھی ہیں تو ان کے اس دین اور فقہ وشریعت کو لعن طعن کرنے لگتے ہیں جو مسجد کے مقدمہ میں مسلم موقف کی بنیاد ہے۔ اس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنے والے بے خبر اور بے علم عوام ہی ہیں ہیں بلکہ اپنے علم و دانش پر فخر کرنے والے خواص بھی ہیں اور ان کے درمیان مسلم اور غیر ہونے کی بھی کوئی قید نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی اس قبیلہ کی اکثریت ہے۔

دوسرے طرح کے لوگ وہ ہیں جو اس مسئلہ میں حقیقتاً دل میں تو ہندتو فریق کی حمایت رکھتے ہیں اور تصفیہ اور مصالحت کے لیے تجویزیں ایسی پیش کرتے ہیں جس میں بظاہر ہندتو فریق کی خواہش کو نہ مانا گیا ہو، مگر مسلم فریق کو اس کے حق ملکیت سے محروم کر دیا گیا ہو اور اس طرح ہندتو فریق کی مدد کی گئی ہو۔

ایک تیسرا گروہ وہ بھی ہے جو ان تکلفات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ صاف صاف اور

انتہائی معصومانہ اور بھولے پن کے انداز میں کہتا ہے کہ کیا حرج ہے کہ مسلمان مسجد دوسری جگہ بنا لیں، نماز کہیں بھی پڑھی جاسکتی ہے اور بابری مسجد کی زمین پر مندر بنا دیا جائے۔ کیونکہ رام للا کا مندر تو وہیں بن سکتا ہے جہاں ان کے جنم لینے کا عقیدہ ہے۔ مسلمان اگر یہ بات نہیں مانتے تو یہ محض ان کی ہٹ دھرمی ہے۔

جب مسلم فریق کا یہ کہنا ہے کہ مسجد کو بت خانہ بنانے کیلئے استعمال نہیں کیا جا سکتا تو اس سے ان کا مقصود اس موقف کو قطعیت فراہم کرنا ہوتا ہے جو شریعت میں مسجد کی دوامیت کے اصل کے طور پر پہلے موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ٹھیک ہے مسجد کی جگہ مندر نہیں بنایا جا سکتا تفریح گاہ تو بنائی جاسکتی ہے۔

قومی تفریح گاہ بنانے کی تجویز دینے والے یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اصل مسئلہ کسی بھی فریق کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ دوسرے فریق کو اس کے مسجد یا مندر سے محروم کر دیا جائے۔ ہندتو والوں کو وہ مقام مندر بنانے کے لیے چاہیے۔ رام جنم استھان پر تفریح گاہ بنانا مسئلہ کے پہلو سے ایک بے معنیٰ بات ہے اسی طرح مسلم فریق کو اصل فکر مندی اپنی مسجد (خدا کا گھر) کی حفاظت کے تعلق سے ہے نہ کہ مندر کی مخالفت سے۔

اس قضیہ میں مسلم موقف کیا ہے؟ مسلم مذہبی قیادت نے اسے ہمیشہ سے دوٹوک اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اس موقف کی بنیادیں شریعت وفقہ میں کیا ہیں؟ اس کا علم بہت زیادہ عام نہیں ہے خود راقم کو مسلمان اہلِ علم کے درمیان مختلف مواقع پر ایسے وضاحتی سوالات کا سامنا ہوا ہے جس سے اس ضرورت کا احساس ہوتا رہا کہ اس مسئلہ کی فقہی وضاحت کی جائے۔

## ② مسئلہ وقف کی وضاحت

اسلام میں مسجد کا مسئلہ وقف سے متعلق ہے اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وقف کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔

وقف کی مشروعیت: شریعت اسلامی میں ''وقف'' کی بنیاد حسب ذیل ہے:

❶ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا. (سورہ الکہف:46) سورۂ مریم آیت:76 میں خَيْرٌ أَمَلاً کی جگہ خَيْرٌ مَرَدًّا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک جزا و انعام اور نتیجہ کے اعتبار سے بہتر ہیں اور انہیں سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ سورہ یٰسین آیت:12 میں ارشاد ہے: إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ یعنی ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کرتے جا رہے ہیں۔ اس آیت کی رو سے جو تین قسم کے اندراجات انسان کے اعمال نامہ میں ہوں گے ان میں سے ایک یہ ہوگا، اس کے اچھے یا برے اعمال کے وہ اثرات جو وہ اپنے مرنے کے بعد اپنی آئندہ نسل، اپنے معاشرے اور پوری انسانیت پر چھوڑ گیا ہے۔

❷ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے۔ سوائے تین چیزوں کے: اوّل صدقہ جاریہ، دوم وہ علم جس کا نفع اس کے مرنے کے بعد بھی جاری ہو اور سوم وہ نیک اولاد جو اس کے لئے دعائیں کیا کرے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جس کسی کے پاس بھی کچھ ہوتا وہ اسے خدا کی راہ میں وقف کر دیتا۔
(ابن قدامہ: المغنی 544/5، دارالمنار، 1367)

❸ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں زمین حاصل ہوئی تو وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: **یا رسول اللہ انی اصبت ارضابخیبر لم اصب قط مالا انفس عندی منہ فما تامرنی فیھا؟** (اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے خیبر میں جو زمین ملی ہے اس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا۔ اس کے بارے میں میرے لیے آپؐ کیا فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان کنت جمعت اصلھا وتصدقت بھا غیر انہ لا یباع ولا یبتاع ولا یوھب ولا یورث** (اگر تم چاہو تو اس کا اصل اپنی ملکیت میں روک لو اور اس کو صدقہ کر دو۔ پھر یہ بیچی نہ جائے گی، نہ ہبہ کی جائے گی، نہ وراثت میں دی جائے گی) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ زمین فقراء، قرابت داروں، غلاموں، مسافروں اور مہمانوں کے لئے صدقہ

کر دی۔ (بخاری شریف، صفحہ 54، باب 19، مسلم شریف صفحہ 25، ح 15)

حضرت عمر ﷺ نے ایک اور زمین جو انہیں یہود بنی حارثہ سے حاصل ہوئی تھی وقف کی، یہ زمین شمغ کہلاتی تھی۔ (مسند احمد، جلد 2، صفحہ 114)

حضرت ابوطلحہ ﷺ نے آیت "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" سنی تو اپنے مال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ مال "حاء" کا کنواں وقف کیا۔

حضرت عثمان بن عفان ﷺ نے بھی مختلف اوقات میں کنواں وغیرہ وقف کیا۔

(بخاری کتاب، صفحہ 55، باب 33، نسائی کتاب صفحہ 29، باب 4)

**لغت میں وقف کا معنیٰ:** لغت میں وقف کے معنی ہیں روکنا، ٹھہرانا، قائم رکھنا، برقرار رکھنا اسی معنیٰ میں ایک دوسرا لفظ حبس بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حبس الشئی کے معنی ہیں پورے طریقے سے حفاظت کرنا، روک رکھنا یا روکے رکھنا، منعہ و امسکہ. وقف الدار کا مطلب ہے گھر کا وقف کرنا اور حبس المال علی کذا کے معنی ہیں مال وقف کر دینا، وقف یعنی اللہ کے راستہ میں وقف شدہ شئے جمع اوقاف اور حبیسہ یعنی کار خیر میں وقف کی ہوئی چیز جمع حبائس۔

**شرعی تعریف:** فقہاء کے نزدیک "وقف" کا مطلب ہے: حبس العین علی ملک الواقف او علی ملک اللہ تعالیٰ (المعجم الوسیط) کتب فقہ میں وقف کی تعریف اسی طرح درج ہے:

❶ حبس العین علی ملک الواقف و المتصدق بالمنفعۃ۔

❷ حبس العین علی ملک اللہ و صرف منفعتھا علی من احب (تنویر الانصار 494/3)
رد المختار میں "علی ملک اللہ" کی جگہ "علی حکم ملک اللہ" ہے جو گویا اسی کے مفہوم کی وضاحت ہے۔ (الکبیسی: 78/1)

❸ مملوک کو غیر کی تملیک سے روک دینا، "وقف" کہلاتا ہے۔ (المبسوط 27/12)
(دار المعرفہ بیروت 1978ء)

❹ بعض شافعی فقہاء نے اس طرح تعریف کی ہے: مالِ موقوف کے عین میں تصرف کو منقطع کرنا اور تقریب الی اللہ کے لیے اس کے منافع نیک کاموں پر خرچ کرنا۔

❺ کچھ حنبلی فقہاء یوں تعریف کرتے ہیں، اصل روک لینا اور پھل دے دینا۔ جیسا کہ حدیث نبویؐ میں ہے (ان شئت حبست اصلھا و تصدقت بھا) یعنی اعطاءِ منفعت نہ کہ اعطاء ذات۔

❻ بعض مالکی فقہاء کے نزدیک وقف کا مطلب ہے: اپنی ملکیت کے منافع (اجرت یا پیداوار) جتنی مدت کے لیے چاہے کسی مستحق کو دینا۔ (احمد بن احمد، شرح الصغیر 97/4)

(دارالمعارف مصر 1944ء)

لیکن یہ تعریف حقیقتاً عام صدقہ کی تعریف ہے۔ وقف کی نہیں۔ تاہم اس تعریف کی رو سے بھی کوئی شخص اپنی کوئی چیز ہمیشہ کے لئے وقف کر سکتا ہے۔

وقف کی فطرت اور مزاج: مندرجہ بالا تعریفات سے مندرجہ ذیل باتوں کا علم ہوتا ہے۔

(الف) وقف کے مقصد و مصرف کا بقاء و دوام

وقف کے شرعی معنی ہیں کسی جاری رہنے والے مقصد کے لیے سرمایہ کو مستقل طور پر خاص کر دینا۔ اسی لیے مقصد وقف دائمی ہوتا ہے۔ وقف کی جہت بھی منقطع ہونی والی نہیں ہوتی۔ خواہ یہ حقیقتاً ہو یا حکماً جیسے وقف علی المساکین۔ یا مثلاً اگر وقف علی الاولاد ہو تو اولاد کے مصرف کے منقطع ہو جانے پر یہ وقف خود بخود فقراء کے لیے ہو جاتا ہے۔

مقصد وقف کے بقاء کا مقتضی ہے کہ جہت وقف محفوظ و سلامت ہو اور موقوف علیہ کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ جیسے مسجد کی تعمیر کے لیے دی گئی چیز کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہیں کی جا سکتی۔ مقصد وقف کے دوام کی حتمی صورت کو الفاظ میں بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ 'وقف' کرنے سے دوام خود بخود متصور ہوتا ہے۔ جیسے اولاد پر 'وقف' کیا اور اولاد منقطع ہو گئی تو 'وقف' خود بخود فقراء کے لیے ہو جاتا ہے۔

(ب) وقف کے اصل کا بقا و دوام

لغت کے اعتبار سے 'وقف' کے لفظ میں ہی اس کے اصل کے بقاء و دوام کا مفہوم موجود ہے۔ اسی لیے 'وقف' کی بنیاد اصل مال (عین) کو روکنے (حبس) پر ہے۔ چنانچہ وقف میں اصل کو روکنا مقصود کے درجہ میں مطلوب ہوتا ہے تاکہ وہ مطلوبہ منافع دیتا رہے۔

اس حقیقت کا لازمی تقاضہ ہے کہ مال وقف کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اس کے بقا و

قیام کا انتظام کیا جائے۔

مالِ عقار یعنی غیر منقولہ (Immovable) میں موقوفہ شئے کی بقاء کا لازمی پہلو اس کا عدم ابدال و استبدال ہے یعنی تبدیل نہ کیا جائے۔

(ج) مدتِ وقف کا دوام

وقف میں تأبید (وقف کا ہمیشہ کے لیے ہونا) بھی بنیادی شرط ہے۔ چیز جب تک ہے وہ وقف ہے۔ اشیاء غیر منقولہ (Immovable) میں تأبید کا مطلب یہ ہے کہ ابدال و استبدال نہیں کیا جا سکتا۔ اشیاء منقولہ (Movable) میں تأبید کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب تک رہے گی وقف ہوگی۔ یعنی جو چیز طبعی طور پر جتنا عرصہ قائم رہے (یعنی مدتِ وجود) وہی عرصہ اس کے لئے تأبید ہے۔

(د) زوالِ ملکیت (ملکیتی عدم تصرف) کا دوام

''وقف'' تملیک کے بغیر زوالِ ملک کا موجب ہوتا ہے اور مال موقوف انسانی ملکیت سے خالی ہو جاتا ہے۔ وقف کنندہ مالِ موقوف کا مالک نہیں ہوتا، چنانچہ وہ جائداد موقوفہ کو بیچ نہیں سکتا۔ ہبہ نہیں کر سکتا، مرنے کے بعد اس میں اس کی وراثت نہیں جاری ہو سکتی نہ اسے بطور رہن رکھا جا سکتا ہے۔

جن فقہاء کے نزدیک وقف، ملک واقف میں برقرار رہتا ہے۔ ان کے نزدیک بھی اس میں کوئی مالکانہ تصرف کرنا، یعنی بیچنا، رہن رکھنا، ہبہ کرنا یا بطور وراثت منتقل کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وقف کے منافع کے مستحقین بھی صرف ''منفعت'' کے مستحق ہوتے ہیں۔ انہیں ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔

جمہور فقہاء کے نزدیک ''وقف'' مقاصدِ وقف کے حق میں بحکم مالک اللہ ہوتا ہے یعنی مالِ موقوف فی سبیل اللہ/فی اللہ منتقل ہو جاتی ہے۔ وقف کا متولی مقصدِ وقف کا وکیل اور مال وقف کا امین ہوتا ہے۔ اسے ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔

(ہ) عمل وقف کا دوام

وقف سے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ وقف دائمی ہوتا ہے۔ ایک بار وقف ہونے کے بعد اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ وقف عتق (غلام آزاد کرنا) کی طرح دائمی ہوتا ہے۔ جیسے یہ نہیں ہو سکتا کہ غلام کو چند دنوں کے لیے آزاد کر کے پھر غلام بنا لیا جائے اسی طرح وقف کا لعدم نہیں کیا جا سکتا۔

نیز جس وقت بیع میں توقیت (وقت متعین کرنا) جائز نہیں ہے۔ جیسے کسی چیز کو ایک مہینہ کے لیے نہیں بیچا جا سکتا۔ اسی طرح وقف کو خاص مدت تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ ''جس نے مسجد بنائی یا قبرستان بنایا اور لوگوں کو اس میں اجازت دی تو اس سے رجوع نہیں کر سکتا''۔ (ابن قدامہ، المغنی 548/5، دارالمنار 1367)

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اول: وقف کا محرک یا اخروی مقصد، اللہ تعالیٰ کے حضور تقرب حاصل کرنا ہے، چنانچہ اسلام نے صرف اللہ کی رضا اور قربت کے لیے ہی وقف کو جائز رکھا ہے۔ دوم: چونکہ وقف سے وقف کنندہ کا مقصود ''ثواب جاریہ'' کا حصول ہے۔ اس لیے موقوف کا دائم الانتفاع ہونا شرط ہے۔ یعنی شئے وقف کی منفعت کا جاری رہنا ضروری ہے۔ یہ ایک متفق علیہ شرط ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ شئے موقوفہ کو باقی اور برقرار رکھا جائے تا کہ وقف کنندہ کے مقصود کو اسی لئے موقوفہ سے اس کے طبعی زمانہ بقا تک حاصل کیا جاتا رہا ہے۔

### ③ مسجد کے وقف کی مخصوص نوعیت

عام رفاہی وقف جیسے مسافر خانہ، یتیم خانہ، مہمان خانہ وغیرہ کے مقابلہ میں مسجد (عبادت گاہ) کے وقف میں ملکیت کے پہلو سے قانوناً کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ مسجد خدا کے لیے اور اس کی عبادت کے لیے وقف۔ (للہ ولعبادۃ اللہ) ہوتی ہے جیسا کہ نص قرآنی ہے۔

اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝ (سورۃ الجن:18)

ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۝ (سورۃ الحج:32:22)

اس لیے مسجد کے وقف کی نوعیت میں خاصا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مسجد کو ملکیت کے بنیادی قانونی اساس کے ساتھ ساتھ ایک اضافی دینی اساس حاصل ہوتی ہے اسی لیے عبادت گاہ (مسجد) کے معاملات میں ہر قانون اور عدالت اس پہلو کا لحاظ کرتی ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قدیم رومی قانون دانوں کا نظریہ بھی یہی رہا ہے۔ رومانی فقیہ بانیان کا خیال ہے کہ:

''اگر کسی زمین پر مقدس عمارت قائم ہو اور پھر وہ عمارت منہدم ہو جائے تب بھی وہ زمین مقدس رہتی ہے۔ یعنی اس زمین کا تقدس متقاضی ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی شخص کی ذاتی ملکیت

نہ ہو۔" (مدونہ جستینان فی الفقہ الرومانی، تعریب، عبدالعزیز فہمی/25)

**مسجد بنانے کے سلسلہ میں لازمی شرائط و آداب**

یوں تو ہر وقف کے لیے کچھ ضروری آداب و شرائط ہیں مگر مسجد کے معاملے میں یہ آداب و شرائط زیادہ سخت بھی ہیں اور عام وقف کے مقابلے میں کچھ زائد بھی۔

مسجد کی تعمیر کے لیے زمین کو حلال طریقے سے حاصل کیا جانا اس کی صحت کی شرط ہے۔ حلال طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ اس زمین پر کسی شخص کا کوئی حق نہ ہو۔ اس کے حاصل کرنے میں کسی بندہ کا حق زائل نہ ہوتا ہو اور اس کے حصول میں زبردستی نہ کی گئی ہو۔ اس مسئلہ پر فقہ و فتویٰ دوٹوک اور واضح ہے۔ تفسیرات احمدیہ میں ہے۔

"جو مسجد ریاکاری یا نام و نمود یا کسی اور غرض فاسد کے لیے بنائی جائے، جس میں اللہ کی خوشنودی کا خیال نہ ہو یا جو مسجد ناپاک مال سے بنائی جائے اس کی حیثیت مسجد ضرار کی سی ہے۔ (تفسیرات احمدی، صفحہ 283، مدارک علی الخازن 265/2)

گویا وہ مسلمانوں کی نہیں بلکہ منافقوں کی مسجد ہے اور اسے ڈھا دینا چاہئے۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"کسی غاصبانہ قبضہ والی یعنی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی زمین پر مسجد بنانا درست نہیں، اگر بنالی جائے تو وہ توڑ دی جائے۔ مثلاً کسی کا گھر کچھ لوگ زبردستی حاصل کر کے وہاں مسجد بنالیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری، 214/6)

فتاویٰ ہندیہ میں مزید درج ہے:

"کوئی راستہ ایسا ہو جہاں مسجد بننے سے چلنے والوں کو نقصان یا تکلیف ہو تو بلاشبہ ایسی مسجد درست نہیں ہے۔" (فتاویٰ عالمگیری، 229/3)

ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں تحریر ہے:

"اگر کوئی شخص ایسی جگہ مسجد بنائے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہ کی گئی ہو تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ ایسی مسجد کو باطل قرار دے اور اپنا حق لے لے۔

وہ زمین جس پر کسی کو حق جوار یا حق شفعہ حاصل ہو تو اس پر مسجد نہیں بنائی جا سکتی۔

(فتح القدیر 875/2)۔

مزید فتوے ملاحظہ فرمائیں:

''کوئی شخص مرتے وقت اپنا گھر بار مسجد میں تبدیل کرنے کی وصیت کر دے، مگر اس کے جائز ورثاء وصیت پر راضی نہ ہوں تو اس کی وصیت جائز نہیں سمجھی جائے گی''۔

(فتاویٰ عالمگیری: 456/2)

''بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں''۔ (فتح القدیر: 857/2)

فتاویٰ رضویہ میں ہے:

''مسجدیں اللہ کے لیے ہیں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی شش جہت میں جمیع حقوق عباد سے منزہ ہوں۔ اگر کسی حصہ میں ملکِ عبد باقی ہے تو مسجد نہ ہوگی''۔

(فتاویٰ رضویہ 453/6)

ایک استفتاء میں پوچھا گیا کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندو زمین دار سے زمین خرید کر مسجد بنائیں کیونکہ مسلمانوں کے پاس موروثی زمین سے الگ کوئی ایسی زمین نہیں ہے جس پر مسجد بنائی جا سکے، لیکن وہ ہندو زمیندار زمین نہیں بیچنا چاہتا تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس کے جواب میں فتویٰ دیا گیا کہ اگر وہ ہندو زمین نہیں بیچنا چاہتا ہے تو پھر مسلمان گھروں ہی میں نماز پڑھیں۔

(فتاویٰ رضویہ 461/6)

اگر زمین مشترک ہے تو سرکار کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا جائز نہیں۔ اور اگر ایسی زمین پر مسجد بنا بھی دی جائے تو اس میں نماز پڑھنے کا ثواب نہیں ہے۔ بلکہ اس میں نماز ہی نہ پڑھی جائے۔

(مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ)

نابالغ کی زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں۔ (تتمہ امداد الفتاویٰ)

فاحشہ عورت نے اگر اپنی حرام آمدنی سے مسجد بنا دی تو وہ مسجد ہی نہیں تسلیم کی جائے گی اور نہ اس کو اس کا ثواب ملے گا۔ (مجموعہ فتاویٰ عبدالحیٔ 268ھ)

ہدایہ میں ہے کہ اگر ایک شخص نے کوئی ایسی مسجد بنائی جس کے نیچے تہہ خانہ ہو، اس کے بالائی حصہ پر کوئی مکان ہو، بیچ میں مسجد ہو اور اس کا دروازہ کسی راستہ پر کھلتا ہو۔ تو اگر چہ اس مسجد کے حصہ کو اس نے اپنی ملکیت سے نکال کر مسجد بنا دیا ہو، یہ درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب اس نے اس کو باضابطہ فروخت نہیں کیا ہے تو اس کو یا اس کے وارثوں کو اس حصہ کے فروخت کرنے کا حق باقی رہے گا۔

صاحبِ ہدایہ نے اس مسئلہ کی عقلی دلیل یہ دی ہے کہ یہ مسجد اللہ کے لیے خالص نہیں تھی کیونکہ اس سے بندہ کا حق متعلق ہے۔

قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ مسجد وہ ہے جس میں کسی کو بھی حق منع حاصل نہ ہو، یعنی اس مسجد پر کسی کا، کسی طرح کا بھی، کوئی حق نہ ہو۔ (ہدایہ 625/2)

## ④ وقف میں تبدیلی یا تبادلہ کے ضوابط

شئ موقوفہ کے معاملہ میں یہاں ایک دوسری بحث جو انتہائی اہم ہے وہ ہے ''ابدال اور استبدال'' کی بحث۔

ابدال سے مراد یہ ہے کہ اصل مال موقوف (عین) کو فروخت کر کے اس کی جگہ دوسرا مال خریدا جائے۔ استبدال سے مراد یہ ہے کہ ایک مال موقوفہ کی جگہ کوئی دوسرا مال لے لیا جائے۔ شریعت میں مالِ وقف غیر منقولہ میں ابدال و استبدال کی جائز بنیادیں صرف دو ہیں۔

❶ مالِ موقوف سے نفع کا کلی انقطاع ہو جائے اور تبدیلی سے مقصود اصل مقاصدِ وقف کا حصول ہو:

- جائدادِ غیر منقولہ کا نفع منقطع ہو گیا ہو اور یہ امید نہ ہو کہ اس کی منفعت بحال ہوگی۔ اس صورت میں ابدال و استبدال جائز ہے واجب نہیں۔ البتہ یہ اندیشہ بھی ہو کہ اگر جائداد کو باقی رہنے دیا گیا تو نقصان ہوگا اور جائداد خراب ہوگی تو ابدال و استبدال واجب ہے۔

جائداد غیر منقولہ کا نفع منقطع ہو گیا ہو مگر یہ امید باقی ہو کہ پھر سے منفعت دینے کے لائق ہو جائے گی تو اس طرح عارضی طور پر نفع معطل ہونا ابدال و استبدال کے لیے وجہ جواز نہیں ہے۔

❷ جائداد غیر منقولہ میں کوئی اہم ضرورت لاحق ہو جائے مثلاً مسجد یا قبرستان کی توسیع ضروری

ہو جائے یا عام راستہ سڑک بنانا ناگزیر ہو جائے۔ (الکبیسی 193/2)

جائدادِ منقولہ میں ابدال واستبدال کی جائز بنیاد صرف ایک ہے یعنی نفع کا انقطاع۔ نیز یہاں یہ بنیاد جائداد غیر منقولہ کی بہ نسبت زیادہ نرم ہے۔ اس کی وضاحت فقہی لٹریچر میں بکثرت موجود ہے۔

مثلاً ① مال موقوف اس کام کے قابل نہ رہے جس کے لیے اس کو وقف کیا گیا تھا۔

مثلاً چھت کی شہتیر ٹوٹ جائے اور کسی بھی طرح چھت کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہ رہے تو اسے فروخت کر دیا جائے۔

② مالِ وقف میں اصل مقاصدِ وقف کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔

مثلاً جہاد کے لیے وقف کیا گیا گھوڑا کسی وجہ سے جہاد میں کام دینے کے لائق نہ رہے تو اسی مقصد کے لیے تبدیلی کے ذریعہ گھوڑا حاصل کر لیا جائے یا مثلاً وقف کردہ غلام کو بیچ کر اس کی جگہ دوسرا غلام خرید لیا جائے۔ (الکبیسی 36/2)

③ جائدادِ منقولہ میں مصلحت کا تقاضا ہو مثلاً مالِ موقوف کو باقی رکھنے میں خرچ آتا ہو اور خرچ کرنے کی استطاعت نہ ہو تو اس مال کو بیچ کر اس کی جگہ ایسا مال خریدنا جس پر خرچ نہ آتا ہو۔

(الکبیسی 193/2)

اگر یہ غیر منقولہ (Immovable) وقف کار آمد ہو اور اس سے عمومی طور پر نفع بھی ہوتا ہو مگر تبدیل کرنا بہتر ہو تو اس صورت میں اکثر فقہائے احناف کے نزدیک ابدال واستبدال جائز نہیں۔

ابدال واستبدال کا اختیار

اگر موقوف علیہ (جن کے لیے وقف کیا گیا ہو) مسلمان ہوں تو اس وقف جائداد کا متولی مسلمان ہی ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً۔ (سورہ النساء:14)

فقہاءِ احناف ''اسلام'' کو عام اوقاف میں صحت تولیت کے لیے شرط قرار نہیں دیتے بلکہ وصف مانتے ہیں، لیکن خاص مسجد کے معاملے میں اسلام تولیت کے لیے شرط ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ط
(سورۃ التوبہ:17)

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... الخ (سورۃ التوبہ:18)

شرائط ابدال و استبدال کے پائے جانے پر اس کا اختیار وقف کنندہ، متولی، حاکم وقت یا بااختیار ادارہ (Competent Authority) کو حاصل ہوگا۔

### شرط ابدال واستبدال کی تحقیق کا مجاز

① مال وقف کی منفعت منقطع ہوگئی ہے یا نہیں اور وہ مقصد وقف کو پورا کر رہا ہے یا نہیں، عام طور پر اس کا فیصلہ ابدال و استبدال کے مجاز افراد و ادارے کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ شریعت اور دنیاوی امور پر اس کی تطبیق کے مسائل سے واقف ہوں۔

② جب مال وقف غیر منقولہ ہو اور اس کے ابدال و استبدال کی بنیاد نفع کا انقطاع کے بجائے کوئی خارجی ضرورت بن رہی ہو تو اس ضرورت کی تحقیق و تعیین کے لیے اسلامی حکومت و عدالت یا ہندوستان جیسے ملک میں متعلقہ مقام پر مسلمانوں کی نمائندہ قیادت کی سطح پر فیصلہ کرنا ضروری ہوگا کیونکہ شریعت میں کون سی مصلحت معتبر ہے اور کون سی نہیں ہے اسے شریعت کے علم کی بنیاد پر صرف مسلم علماء ہی طے کر سکتے ہیں۔

## ⑤ قضیہ کے فریق اور ان کا موقف

ہندوتوادی فریق: ہندوتوادی فریق کے نزدیک مقام مسجد رام جنم بھومی ہے۔ یہ ان کا عقیدہ (آستھا) ہے اور اِن کا موقف یہ ہے کہ عقیدہ کسی ثبوت و سند کا محتاج نہیں ہوتا، اور یہ بھی کہ چونکہ یہ ان کا عقیدہ ہے لہٰذا یہاں عدالت کا (یعنی انصاف) کوئی کام نہیں ہے۔ حکومت اور غیر مذہب کے لوگ سب کے لیے یہ فیصلہ کن ہے اور سب کو یہ بات مان لینی چاہئے اور ان کے خیال میں ان کے لیے اسے ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

مسلمان فریق: مسلمانوں کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ قضیہ بابری مسجد زمین کی ملکیت کا جھگڑا ہے، جس کے لیے اسی طرح اور اسی معیار کا ثبوت جیسے سرکاری دستاویز، تاریخی شہادت

وغیرہ درکار ہوتی ہے، جیسے عام زمینوں کے تصفیہ میں۔ اسی لیے ان کا موقف یہ ہے کہ عدالت ملکیت کے بارے میں جو فیصلہ کرے گی اسے وہ مان لیں گے۔

مسلمان یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ عدالت ہند مسلم اوقاف کے شرعی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ عقیدہ کا جھگڑا نہیں ہے، ورنہ دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے عقیدہ کے رو سے پوری دنیا (بشمول پورا ہندوستان مع اجودھیا) اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور پوری زمین مسلمانوں کے لئے مسجد قرار دی گئی ہے۔

وجعلت لی الارض کلها مسجداً (اوکما قالؐ) خدا کی ساری زمین اس امت کے لیے مسجد بنا دی گئی ہے۔ پھر یہ کہ سارے انسانوں کو ان کے عقیدہ کے مطابق اللہ نے پیدا کیا ہے۔ شری رام بھی اللہ کے پیدا کیے ہوئے انسان اور بندے تھے اور کسی انسان کی عبادت نہیں کی جاسکتی، لہٰذا شری رام کی بھی عبادت نہیں کی جاسکتی اور ان کے لیے کوئی مندر نہیں بنایا جاسکتا۔

مسجد میں جس خدا کی عبادت کی جاتی ہے وہ خدا ہندو بھائیوں کا بھی خدا ہے بلکہ ان کا سب سے بڑا خدا وہی ہے۔

رام جی وغیرہ ان کے عقیدے میں شاید اسی بڑے بھگوان کے چھوٹے چھوٹے روپ یا اوتار ہیں۔ ایسی صورت میں ہندو بھائیوں کو اپنے سب سے بڑے خدا کے پوجا استھل یعنی مسجد کو رام مندر بنانے پر ضد نہیں کرنا چاہئے۔ غیر مسلم اپنے کسی مندر کو مسجد کے لیے دے سکتے ہیں، کیونکہ اس میں ان کا عقیدہ مانع نہیں ہے، وہ ہزاروں بھگوانوں کو پوجتے ہیں اور اپنے عقیدے میں وہ مسلمان کے بھگوان کی بھی پوجا کرتے ہیں کیونکہ یہ بھگوان تو سب سے بڑا ہے۔ جب کہ مسلمان اپنے عقیدے کے مطابق اپنی عام زمین بھی اس مقصد (بت خانہ) کے لیے نہیں دے سکتے کجا یہ کہ خدا کا گھر بت خانہ بنانے کے لیے راضی ہوجائیں۔

اسلام میں مسجد کے معاملہ میں خصوصی طور پر شریعت میں یہ حکم ہے کہ اس کی زمین جائز ملکیت والی ہو ورنہ عبادت مقبول نہ ہوگی اس لیے مسلمانوں کی دیگر ملکیتوں کے مقابلے میں مسجد کی زمین کے بارے میں یہ بات زیادہ اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ کسی ناجائز قبضہ سے صاف اور پاک (Fair) ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان یا ان کے حکمران مندروں کو توڑ کر

مسجدیں بناتے رہے ہوں۔

یہ ہوسکتا ہے کہ بعض مسلمان فاتحوں اور حکمرانوں نے جنگ کے زمانے کے غیظ وغضب میں کسی مندر کو مسمار کر دیا ہو یا کسی مندر کو سازش، بغاوت یا فحاشی کا اڈہ سمجھ کر اس کو منہدم کر دیا ہو مگر مندر توڑ کر اس کی جگہ پر مسجد بنانا ثابت نہیں اور نہ ایسی کسی مسجد کو علماء اور مسلمان تسلیم کر سکتے تھے۔ یہ ضرور قرین قیاس ہے کہ کسی خاص سبب سے توڑے ہوئے مندروں کے پاس یا اس سے تھوڑے فاصلہ پر کوئی مسجد بنا دی گئی ہو، مگر کسی مندر کی جگہ مسجد کی تعمیر ثابت نہیں۔

## ⑥ بابری مسجد میں تبدیلی یا تبادلہ

اسلام میں ''اصل شرعی'' مسجد کی دوامیت ہے یعنی یہ کہ ''جب کسی مقام پر ایک بار مسجد بن جاتی ہے تو وہ تا ابد مسجد رہتی ہے'' کیونکہ وقف میں اصل ابدیت اور دوام ہے۔ ہمیشہ سے فقہاء اسلام کا یہی موقف رہا ہے اور ماضی و حال میں ہر مسلم ملک و معاشرہ اسی رائے پر کاربند ہے۔

جہاں تک بعض استثنائی صورتوں میں مقام مسجد میں ابدال و استبدال کا تعلق ہے وہ بھی فقہاء کے نزدیک مسلم رہی ہیں اور ان پر مسلمانوں کا ان مخصوص مواقع پر عمل بھی رہا ہے۔

مثلاً مسجد کسی ایسی جگہ واقع ہو جس سے آبادی کی توسیع کے نتیجہ میں گزرگاہ کی تنگی مستقل پریشانی کا باعث بن جائے تو اس میں حسب ضرورت ترمیم یا کلیتاً ابدال و استبدال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس طرح کے عمل میں چار باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ اس بڑی خارجی مصلحت کو پورا کرنے کے لیے وقف میں ترمیم یا تبدیلی کے سوا کوئی اور راستہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ مقصد وقف کو پورا کرنے کے لیے دوسری متبادل شئی پوری طرح موزوں ہو، تیسرے یہ کہ اس تبادلے کے عمل میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو۔ چوتھے یہ کہ تبدیلی کے لیے جو خارجی مصلحت بنیاد بن رہی ہو وہ شریعت میں معتبر ہو۔

بابری مسجد کے معاملے میں تبادلہ کو کوئی داخلی بنیاد موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا نفع منقطع نہیں ہے۔ وہ حکماً ایک آباد مسجد ہے۔ جس وقت اس پر قبضہ کیا گیا اس وقت بھی آباد تھی، جب اس کی عمارت کو منہدم کیا گیا، اس وقت وہ عدالتی حکم اور حکومت کی طاقت کے تحت متروک الصلوٰۃ تھی

اور آج بھی جیسے ہی ناجائز قبضہ کی گرفت سے آزاد ہوگی فوراً بحال اور آباد ہوگی۔ (انشاء اللہ)

بت خانہ بنانے کے لئے مسجد کا ابدال واستبدال

اگر بابری مسجد کسی استعمال میں نہ ہوتی، ویرانہ بن چکی ہوتی اور مسلمانوں کے کسی کام کی نہ ہوتی اور یوں ہی چھوڑنے سے ضائع ہو جاتی تب بھی بت خانہ کے مقصد سے نہیں دی جاسکتی تھی کیونکہ بت خانہ بنانا ایک مانع ہے۔ مطلب یہ کہ مسجد اللہ کا گھر (بیت اللہ) ہے اور اس کی تعمیر کا مقصد خدائے واحد کی عبادت کو قائم ومنظم کرنا ہے۔ اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۝

اسلام توحید کا داعی اور شرک کا مخالف ہے۔ اس کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، جبکہ بت خانہ اس کے بالکل برعکس شرک کا مرکز ہے نیز ابدال واستبدال کا یہ عمل شعائر اللہ کی تعظیم کے بھی خلاف ہے جس کا مسلمانوں کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

⑦ شریعت میں ملّی یا انسانی مصالح کا لحاظ

ظلم، دھمکی، جان و مال کو نقصان پہنچانا یہ وہ شرعی مصلحت نہیں ہے، جو مسجد کو بت خانہ بنانے کے لیے جواز بن سکے۔ ہندوستان جیسے ملک میں اگر زور زبردستی کو شرعی مصلحت مان کر کسی مسجد میں تبادلہ کا عمل کر لیا جائے تو اس سے ہر مسجد اور ہر وقف کی بنیاد کمزور ہو جائے گی اور یہ ظالموں کے لیے مستقل نظیر بن جائے گی اور ان کے ہاتھ میں ظلم کا ایک مستقل قانونی پروانہ آ جائے گا۔

پھر ملکی عدالتیں ''انصاف'' کا فرض انجام دینے کے بجائے ایسی ہی مصالحت کی تلقین کرنے لگیں گی اور سیاسی حکومتیں ایسا ہی تصفیہ کر کے متبادل کی پیش کش کیا کریں گی۔ یہ سلسلہ کہیں نہ رک سکے گا۔ قوموں خصوصاً ظالم قوموں کی نفسیات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

فرق ثانی کے موجودہ دعویٰ حقیقت کا فیصلہ ہوئے بغیر مسجد سے دستبردار ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ ملت اسلامیہ پر یہ الزام ثابت ہو جائے کہ اس نے ظلماً زمین غصب کر کے مسجد بنائی۔ یہ اخلاقی شکست خوردگی کے ہم معنیٰ ہے۔

یہ بات کوئی غیرت مند قوم خصوصاً اسلام کے ماننے والے قبول نہیں کر سکتے۔ حضرت یوسف

علیہ السلام کو جیل سے رہا کیا جانے لگا تو انہوں نے اپنی براءت اور دوسرے فریق کے جھوٹ کا افشاء ضروری سمجھا۔

مسجد سے مقہورانہ دستبرداری ملت کے اندر عدم تحفظ اور شکست خوردگی پیدا کرنے کا بھی باعث بنے گی۔ جبکہ دوسری جانب یہ ان فرقہ پرست دہشت گردوں کی جارحانہ فتح مندی کو تقویت پہنچانا ہوگا۔

ہندوستان میں جمہوریت اور انصاف کی بقا کے لیے لازم ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی پیش کی جائے اور تدارک کے لیے تمام وسائل استعمال کیے جائیں۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ یہ عمل صرف بابری مسجد کے معاملہ میں آخری طور پر اختیار کرلیا جائے، اس کے بعد ہر مسجد کے لیے امن ہی امن ہے، جو لوگ ایک ظلم اور ناانصافی کو کھلے عام محض اپنی طاقت کی منطق سے قانون و عدالت کی موجودگی میں روا رکھنا چاہتے ہیں وہ آئندہ بھی کسی قانون و حکومت کو اپنے مرضی کا ظلم کرنے میں رکاوٹ تصور نہیں کریں گے۔

پھر انسانی قوانین بدلتے رہتے ہیں، ان کے مخالفین بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی نیتیں اور ان کا عمل بدلتا رہتا ہے، ان میں سے ہر کوئی چیز قابل بھروسہ نہیں ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی اور آج کے خودساختہ عالمی اداروں کا ریکارڈ بھی جانبداری اور ناانصافی کے کارناموں سے پر ہے۔

اگر مسجد کے ابدال و استبدال میں بنیادی شرعی موانع نہ ہوتے تو بھی فقہاء و مجتہدین یہ ضرور دیکھتے کہ اس عمل سے ملت کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے یا اپنے معابد، مساجد کے معاملہ میں وہ لامتناہی مشکلات میں مبتلا ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کے نزدیک استصلاحاً اور سداً للذریعہ بھی اس طرح کا ابدال و استبدال ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

مسلمان کمزور اور بے بس ہیں ان کے لیے یہ تو ممکن ہے کہ اپنے ضعف کی بنا پر بابری مسجد کے تحفظ کے لیے جسمانی طور پر سامنے نہ آئیں اور معاملہ کو ملک کی حکومت اور عدالت پر چھوڑ دیں جیسے کعبہ پر ابرہہ کے حملے کے وقت کعبہ کے متولی سامنے نہیں آئے مگر وہ مسجد کو اپنے ضعف کی بنا پر یا بالفاظ دیگر دوسروں کے ظلم کی بنا پر بطور خود حوالہ کر دیں یہ ممکن نہیں ہے۔

یہ ذمہ داری حکومت کی ہے کہ وہ شئے موقوفہ کی حفاظت کرے، مال موقوف کو زبردستی غصب کیے جانے سے روکے۔ کسی فریق کو دھمکی دینے، مار دھاڑ کرنے، خونریزی اور فساد مچانے والوں کا مواخذہ کرے اور مسلم فریق کے جان و مال کا تحفظ کرے۔

حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ ایک فریق کو دوسرے فریق پر ظلم کرنے یا اس کے مال و جائداد کو تباہ کرنے یا اس پر قبضہ کرنے سے روکے۔ نزاع کا فیصلہ انصاف کے ساتھ اپنے عدالتی نظام کے ذریعہ کرے وہ کسی فریق کا مال اپنی تحویل میں لے کر دوسرے کو حوالہ نہیں کرسکتی۔

ظلم کا دفع کرنا جس طرح بقدر استطاعت مظلوم کی ذمہ داری ہے اسی طرح اس حکومت اور عدالت کی بھی ذمہ داری ہے جہاں مسلم اقلیت ایک مساوی شہری کی طرح رہ رہی ہے اور شہری حقوق و فرائض میں برابر شریک ہے۔ جہاں تک عدالت کا تعلق ہے تو وہ دھونس اور دھاندلی کو کسی فریق کے خلاف یا حق میں وزن نہیں دے سکتی۔ قانون کی نگاہ میں اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر فرق نہیں کرسکتی۔ وہ ملکیت کے نزاع کے کیس میں ملکیت کے قانون کے تحت ہی فیصلہ کرسکتی ہے۔

عدالت ''باہمی مصالحت'' کے لیے حکم نہیں جاری کرسکتی وہ فریقین سے محض اپیل کرسکتی ہے اور یہ اپیل بھی لامحدود مدت تک کے لیے نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر عدالت کی طرح ملکی عدالت بھی یہ سب کچھ یقیناً سمجھتی ہے۔

اس قضیہ کی صورت حال یہ ہے کہ ہندوتو فریق عدالت میں مدعی بن کر نہیں گیا بلکہ ابتدا ہی سے اس نے غیر قانونی اقدامات شروع کردیے۔ 22/دسمبر 1949ء کی شب میں مسجد کے اندر مورتی رکھ دی اور اس کے بعد سے اب تک مدعی بن کر عدالت میں جانے کے بجائے خلاف قانون سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس کی انتہا 6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کا انہدام ہے۔

ہندتو وادی اپنا یہ مذہبی و جمہوری حق سمجھتے ہیں کہ نفرت انگیز رتھ یاترائیں نکالیں، طاقت کا ناجائز اور غیر قانونی استعمال کریں۔ مسلمانوں کو ہراساں کریں اور ہر طرح انہیں نقصان پہنچائیں اور آستھا کے نام پر ظلم اور دھاندلی کا بازار گرم کریں، مکر و فریب کے تمام ہتھکنڈے استعمال کریں۔

اس دس سال میں جہاں تک حکومت و عدالت کی کارکردگی کا سوال ہے تو یہ بالکل واضح ہے کہ

وہ ہندتو فریق کی ہم مذہب ہے۔ اور انصاف کے لیے متذبذب بلکہ ہم مذہب فریق کے لیے ہمدرد اور سیاسی مفادات کی اسیر۔ چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر اس دوران حکومتوں کا رویہ بھی ان کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی کا رہا ہے اور وہ تماشائی بنی دیکھتی رہی ہیں۔ امت کی ذمہ داری ہے کہ ان خطرات سے تحفظ و سلامتی کے لیے ملی نظم و انتظام نیز موجود قانون و عدالت اور حکومت اور انسانی وسائل کو حتی الامکان ہموار کرے اور ملت کی ضعیفی دور کرنے کا سامان کرے۔

## ⑧ مسلم اہلِ قلم میں مرعوبیت اور خود اعتمادی کی کمی

سہ روزہ 'دعوت' کے شمارہ 19 اپریل 2003ء اور 'افکار ملی' مئی 2003ء میں ایک مضمون بعنوان ''مسجد کی دوامیت کا فتویٰ اور سپریم کورٹ کا فیصلہ'' شائع ہوا ہے جس میں سپریم کورٹ کے 1994ء کے فیصلہ کے حوالہ سے فقہاء اور وکلاء کے غور وخوض کے لیے تین ایسے سوالات اُٹھائے گئے ہیں جن کا سامنا مضمون نگار کی نظر میں وکلاء کو عدالت میں ہوسکتا ہے۔

مضمون نگار کے خیال میں پہلا سوال جس سے دوچار ہونا پڑے گا وہ یہ ہے کہ: آیا مسجد کی دوامیت کا فتویٰ قرآن و سنت کی روشنی میں منصوص ہے۔ اور نہیں تو کیا سب ائمہ اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ بلا لحاظ مفاد عامہ وضروریات ومصالح دینی و دنیوی مسلمان مجبور ہیں کہ ایک بار مسجد بن گئی تو خواہ اس دیار میں وہ آباد ہو یا نہ ہو، وہاں مویشیوں کا اڈا ہو جائے یا ان کی مستقل عدم موجودگی کی وجہ سے وہاں غلاظت کا ڈھیر ہو جائے، لیکن وہ اسے کسی غیر مسلم کو مکان یا دکان بنانے کے لیے بھی نہیں دے سکتے۔ اس ارادہ سے بھی کہ وہ رقم صرف مسجد بنانے میں صرف ہو۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ فتویٰ قرآن وسنت کی روشنی میں مستنبط ہے اور اس ضابطہ فقہی پر فقہائے امت کا اجماع ہے کہ وقف کی اصل دوامیت ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ شریعت میں معتبر کسی مصلحت یا ضرورت کی بنا پر وقف میں ابدال یا استبدال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ سوال میں مصلحت و ضرورت کی جو مثالیں ذکر کی گئیں ہیں وہ شریعت میں عموم واطلاق کے ساتھ معتبر نہیں ہیں۔

مضمون نگار کے الفاظ میں دوسرا سوال جس کا عدالت کے سامنے جواب دینا ہوگا، یہ ہے کہ آیا کوئی استھان اور کوئی پتھر بھی جو مذہبی پوجا کے لیے استعمال ہوتا ہے، کبھی اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں

جا سکتا خواہ اس کی موجودگی سے راہ گیروں کو کتنے ہی حادثے پیش آئیں گے؟ اگر اس کو ہٹایا جانا عدل و انسانیت دوستی کا تقاضا ہے تو عدالت یہ کہے گی کہ اس اصول کا اطلاق وہ مسلمانوں کے ان مذہبی مقامات بشمول مسجد پر کرے گی جو وہ کسی اور جگہ بھی انجام دے سکتے ہوں۔

اس سوال کے جواب میں پھر یہ عرض ہے کہ اسلام میں وقف کی اصل روایت ہے۔ تاہم مذہبی و غیر مذہبی تمام اوقاف میں معتبر مصلحت و ضرورت کے تحت ابدال و استبدال کی شق پہلے ہی سے موجود ہے۔ بشرطیکہ (مثلاً دی گئی مثال میں) یہ ثابت ہوا کہ راستہ کی ضرورت کا پورا ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور متبادل موجود نہیں۔

مضمون نگار کے مطابق ایک تیسرا سوال عدالت کے سامنے پیش آئے گا کہ کیا ماضی و حال میں ہر مسلم ملک و معاشرہ نے دوامیت مسجد کی رائے پر عمل کیا ہے یا عمل اس کے برعکس ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ماضی و حال میں ہمیشہ ہر مسلم ملک و معاشرہ نے اس اجمالی ضابطہ پر عمل کیا ہے کہ وقف کی اصل دوامیت ہے الا یہ کہ اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر حقوق العباد متاثر ہوتے ہوں۔ صرف اسی صورت میں وقف کے اس ضابطہ میں ابدال و استبدال کی رخصت پر عمل کیا گیا ہے۔

ان سوالات کو جن الفاظ اور جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کے مدِ نظر صاحبِ مضمون کی دینی علمیت کے بارے میں کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ مزید برآں مضمون کے باقی حصہ کو دیکھ کر تو مضمون نگار کی متانت اور شائستگی بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ امت کی دینی قیادت کے خلاف دل میں جو انقباض اور برہمی ہے اس کا واضح اظہار موجود ہے۔ تیسرے سوال کے معاً بعد لکھتے ہیں: ''بہتر ہوگا کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو بھی روایۃً و درایۃً اور کامل تاریخی شواہد سے واقف اور مطمئن کیا جائے کہ کیا واقعی اسلام میں عام مساجد کی یہ حیثیت ہے کہ خواہ اس کے لیے ہزاروں مومنوں کی جانیں جائیں، سیکڑوں مسجدیں تباہ ہوں اور اسلام کے خلاف نفرت کی لہر بڑھتی جائے، لیکن وہ فقہی رائے پر اٹل رہیں۔ نظر ثانی کی شرائط اور اس کے راہنما اصول بھی واضح کر دیے جائیں۔'' آگے وہ دوامیتِ مسجد کی رائے کو ''مفروضہ فقہی رائے'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ یہ ہے کہ ''اسوۂ رسول اللہ اور اسلامی تعلیمات اور عقل و ہوش کی روشنی میں مسلمانوں کی ملی زندگی کی ترجیحات مقرر کر کے مسلم موقف اختیار کیا جائے۔

اس مشورہ کا مطلب مضمون کی روشنی میں غالباً یہی ہے کہ بالفاظ دیگر مضمون نگار دوامیت مسجد کی رائے ایک ''مفروضہ فقہی رائے'' ہے جو اسوۂ رسول اور اسلامی تعلیمات سے ثابت نہیں ہے۔ نیز عقل و ہوش کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ و سلامتی کے لیے کسی باوقار مصالحت کے ذریعہ مسجد سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔

1994ء کے سپریم کورٹ کے جس فیصلہ کے حوالہ سے آئندہ کے ممکنہ سوالات اُٹھائے گئے ہیں، اس کی تفصیل مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ مسلم کیس پیش کرتے ہوئے وکلاء نے اسلام میں مسجد کی دوامی حیثیت کی دلیل عدالت کے سامنے رکھی، جس کو رد کرتے ہوئے عدالت نے فیصلہ کیا کہ ''ہندوستان کی ریاست اس امر پر مقتدر ہے کہ وہ کسی مذہبی جگہ یا عمارت کو بلاتفریق مذہب وملت مفاد عامہ کے پیش نظر قانوناً اپنے قبضہ میں لے لے، الّا یہ کہ متعلقہ جگہ یا عمارت کو اس مذہب کے ماننے والوں کے نزدیک کوئی خصوصی حیثیت حاصل ہو، مثلاً سڑک پر کسی منڈپ یا پوجا استھان کے ہونے سے ٹریفک کو مڑنے سے ہر سال دس پانچ لوگ ہلاک ہو جاتے ہوں تو حکومت کو یہ حق ہوگا کہ وہاں سے باضابطہ کارروائی کے ذریعہ ہٹوا کر سڑک سیدھی کر دے۔ یہی حق اسے کسی مسجد یا مزار کو ہٹانے کے لیے حاصل ہے۔ الّا یہ کہ پوجا استھان یا مسجد و مزار یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ ان کے مذہبی عقیدہ کا یہ لازمی جزو ہے کہ وہیں یہ کام انجام پا سکتا ہے۔

مضمون نگار اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عدالت عالیہ نے بابری مسجد کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ حکومت اسے مفاد عامہ کی خاطر اپنے قبضہ میں لے لے، البتہ اصولی موقف پر یہ واضح کر دیا ہے کہ عام مسجد بھی حکومت مفاد عامہ کی غرض سے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے۔ فاضل ججوں نے یہ صاف کہہ دیا ہے کہ اسلامی ممالک میں فتویٰ یا عمل جو بھی ہو، سیکولر ہندوستان میں بلاتفریق مذہب عمومی عبادت گاہوں کو حکومت مفاد عامہ میں اپنے قبضہ وتصرّف میں لے سکتی ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ فتویٰ کہ ایک بار کوئی مسجد بننے کے بعد وہ جگہ دائماً مسجد ہی کے لیے وقف رہے، جس کا بہ تکرار مسلم سیاسی قائدین حوالہ دیتے رہے ہیں، اس عدالتی فیصلے سے متصادم ہے۔ مسلمان فقہاء وعلماء وقائدین بار بار زور دے کر یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ ہم عدالت کے فیصلہ کو ہر صورت میں ماننے کے لیے آمادہ ہیں۔ کیا وہ فیصلہ کے اس جزو کو بھی تسلیم کرتے ہیں؟

چند بنیادی امور: یہاں چند بنیادی باتیں یاد رکھنی چاہئیں: اوّل یہ کہ شریعت کسی مسئلہ میں کیا کہتی ہے، وہ فقہ اسلامی کے ماہرین ہی طے کریں گے، سپریم کورٹ کسی طرح اس کا مجاز نہیں ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ وہی کہہ رہا ہے جو فقہاء امت کی ہمیشہ سے رائے رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ وقف میں دوامیت کے اصل ہونے کے ساتھ بعض شرعی طور پر معتبر مصلحت و ضرورت کے تحت وقف کے ابدال و استبدال کا ضابطہ خود شریعت میں متفق علیہ طور پر ہمیشہ سے موجود ہے۔ سپریم کورٹ جب یہ کہتی ہے کہ ''مفاد عامہ کے پیش نظر'' ہندوستان کی ریاست کے وقف کو اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے تو وہ دراصل یہ مانتی ہے کہ وقف میں اصل اس کی برقراری اور بقاء ہی ہے البتہ 'مفاد عامہ' کے تحت ریاست اسے قبضہ میں لے سکتی ہے۔

تیسرے یہ کہ کسی محدود مدت کے لیے قبضہ میں لینا ایک بات ہے اور قبضہ میں لے کر کسی دوسرے فریق کو دے دینا دوسری بات ہے جو سپریم کورٹ عدل و انصاف کے اصولوں کو نظر انداز کیے بغیر نہیں کر سکتی۔

چوتھے یہ کہ یہاں مسجد کے معاملہ میں قبضہ لینے کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کو مسجد کے اعمال یعنی نماز و جماعت و جمعہ سے وہ روک دے۔ اس قبضہ کا منشا صرف تحفظ اور انتظام ہو سکتا ہے یا یہ کہ جب تک معاملہ دونوں فریقوں کے درمیان فیصل نہیں ہو جاتا اس وقت تک قبضہ اس مقصد و معنیٰ میں ہو کہ دونوں فریق کو اس کے استعمال سے روکے رہے۔

پانچویں یہ کہ ہندوستان کے سیکولر ہونے سے یہ تو لازم آتا ہے کہ وہ قانون کا انطباق بلاتفریق مذہب و ملّت کرے مگر اس سے اس کو یہ حق نہیں ملتا کہ وہ کسی فریق کے مذہبی معاملہ میں بے جا مداخلت کرنے لگے۔

چھٹی بات یہ کہ مسلمان جب عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کی بات کہتے ہیں تو ان کی واضح اور دو ٹوک مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ عدالت یہ فیصلہ کرے کہ مسجد کی جگہ کس کی ملکیت ہے۔ مسلمان ایسا اس حقیقت کی بنا پر کہتے ہیں کہ ملکیت کا فیصلہ ظاہر ہے کہ ثبوت و شواہد ہی کی بنا پر ہونا ہے جس کے بارے میں انہیں علم و یقین ہے کہ بابری مسجد شرعی حکم اور تاریخی صداقت کے اعتبار سے جائز ملکیت پر بنائی گئی اور اس کے خلاف کوئی ثبوت دوسرا فریق نہیں پا سکتا۔ اگر ان کے پاس

کمزور سا ثبوت بھی ہوتا تو اب تک ان کے حق میں بوجوہ فیصلہ ہو چکا ہوتا نیز فریق ثانی معاملہ کو عقیدہ کا مسئلہ بنا کر عدالت سے باہر رکھنے پر اصرار نہ کرتا اور طاقت کی منطق استعمال نہ کرتا۔

ساتویں بات یہ یاد رکھنی چاہیے کہ مقابل فریق تمام ہندو برادران نہیں ہیں بلکہ اصلاً ہندتو وادی ہندو ہیں، جو اپنے ہم مذہب عوام کا استحصال کر کے اپنے مقاصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔

ایک ضروری بات یہ کہ مصالحت کاری کا خمار اتنا نہیں چڑھنا چاہیے کہ عدل و انصاف نظر نہ آئے۔ قرآن حکیم نے ''مصالحت'' کے کچھ اصول بتائے ہیں جن کی پاسداری ضروری ہے۔ سورہ حجرات میں یہ مسئلہ اس طرح مذکور ہے:

**ترجمہ:** ''اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والوں سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

مصالحت کے یہ اصول اگرچہ مسلمانوں کے دو گروہ کے نزاع کے معاملہ میں مسلمان مصالحت کاروں کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم یہ تمام انسانی برادری کے لیے بھی بہترین اصول ہیں۔ اس سیاق میں آیت کا منشا یہ ہوگا کہ اول، گروہی نزاع میں مصالحت کاری ضرور کرنا چاہیے، لاتعلق نہیں رہنا چاہیے، یہاں تک کہ وہ حق و انصاف کی بات سننے کے لیے مجبور ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ مصالحت کار 'عدل' کے ساتھ مصالحت کرائیں، ظالم سے ڈر کر اور دب کر اور مظلوم کو ڈرا اور دبا کر اور حق و انصاف کو نظر انداز کر کے مصالحت کرانا 'مصالحت' نہیں ہے۔ اسی لیے دوبارہ تاکیدی حکم دیا کہ ''اقسطوا'' (انصاف کرو) اور مزید ترغیب کے لیے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔ □ □

# بابری مسجد: اربابِ فقہ وفتاویٰ کی نظر میں

ذیل کے مضمون سے بابری مسجد کی شرعی حیثیت، اس کے سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور مسجد کی نقل مکانی کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

استفتاء

حامداً و مصلیاً

بابری مسجد جو جائز زمین پر تعمیر کی گئی ہے، جہاں پنج وقتہ نمازیں ادا ہو رہی تھیں اسے زبردستی نزاعی بنایا گیا اور پھر اسے شہید کر کے بت خانہ میں تبدیل کر دیا گیا اس حوالے سے شرعی نقطۂ نظر سے درج ذیل سوالات کے جواب مع دلائل مطلوب ہیں:

① اسے شہید کر دینے والے ظالم قرار پائیں گے یا نہیں؟

② اس کی خاموش تائید کرنے والوں کا کیا حکم ہوگا؟

③ اس کی بازیابی مسلمانوں پر فرض ہے یا نہیں؟

④ عدلیہ کی ٹال مٹول کی پالیسی کو دیکھتے ہوئے کہاں تک اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

⑤ بحالت موجودہ اس کی بازیابی کے لئے کون سے اقدامات کئے جاسکتے ہیں؟

⑥ مصالحت کے نام پر اس سے دست بردار ہونا جائز ہے یا نہیں؟

شعائر اسلام کے تحفظ سے متعلق شریعت اسلامیہ کا کیا موقف ہے؟ جو مسلمان شعائر اسلام کی حفاظت میں جاں بحق ہو جائے اس کا شمار کس زمرے میں ہوگا؟

⑦ بابری مسجد کی بازیابی کی جدو جہد کرنا کیسا ہے؟ کرنا چاہئے یا نہیں؟ اور اس پر سکوت اختیار کرنے میں گناہ تو نہیں ہے؟ اسی طرح بابری مسجد کی تعمیر نو کے سلسلے میں مالی تعاون باعث اجر وثواب ہے یا نہیں؟

## فتویٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء

هو الصواب

آپ کے تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ مسجد ہمیشہ کے لئے مسجد ہے اور اللہ کی ملک ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ان المساجد لله کہ تمام مساجد اللہ کی ملک ہیں، لہٰذا اس سے کسی طرح سے دست بردار ہونے کا حق کسی مسلمان کو حاصل نہیں۔ اس کی بازیابی کے جو بھی طریقے حکمت عملی سے اپنا سکتے ہوں، اپنانا مسلمانوں پر لازم ہے۔ جذباتیت سے کوئی ایسا قدم درست نہ ہوگا جس سے مسلمانوں کو ضرر لاحق ہو اور حاصل کچھ نہ ہو۔ ضرر سے بچاتے ہوئے حتی المقدور کوشاں رہیں۔ انشاء اللہ کامیابی ایک دن ہوگی، نہیں تو کوششوں کا ثواب تو ملے گا ہی۔ کعبہ کو مشرکوں نے بت خانہ بنا لیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بازیابی کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ ایک دن وہ آیا کہ اس کو بازیاب کرلیا۔ ولکم فی رسول الله اسوة حسنه۔

جواب صحیح ہے۔

| ظفر عالم ندوی | ناصر علی |
|---|---|
| دارالافتاء ندوۃ العلماء، لکھنؤ | دارالافتاء ندوۃ العلماء |

## فتویٰ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب　　　　　　　　هو الموفق

بابری مسجد شہید کرنے والے یقیناً ظالم ہیں۔ اس شہادت کی تائید کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ یہ سخت گنہ گار قرار پائیں گے۔ اس مسجد کی بازیابی کے لئے سعی کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ یہ مقدمہ 1949ء سے قائم ہے اور اب تک عدلیہ نے فیصلہ نہیں دیا اس لئے اس پر اعتماد کرنا مشکل ہے، باقی مجبوری ہے، قانوناً جب تک فیصلہ نہ ہو لڑتے رہنا چاہئے۔

اس سلسلہ میں جنہوں نے سعی کی وہ قابل اجر ہیں اور اس کی حفاظت میں جو مسلمان مارے گئے وہ شہید ہیں۔ اس کی بازیابی کے لئے کوشش کرنے والے لائق مدح وستائش ہیں۔ اس مسجد سے دستبردار ہونا درست نہیں ہے۔

| الجواب صحیح | الجواب صحیح | محمد ظفیرالدین |
|---|---|---|
| محمد عبداللہ غفرلہٗ | کفیل الرحمٰن | مفتی دارالعلوم دیوبند |

## فتویٰ دارالعلوم اشرفیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب

① بابری مسجد شہید کرنے والے ظالم، جفاکار، ستم شعار اور حقیقت میں ڈاکو ہیں اور ایسے ظالم ہیں کہ ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يَّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا. ''ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جنہوں نے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام لینے سے لوگوں کو روکا اور اسے ویران کرنے کی کوشش کی۔'' جس نے بابری مسجد شہید کر کے بت خانہ بنانے والوں کو ڈاکو کہا صحیح کہا اس لئے کہ ڈاکو عرفاً، قانوناً، شرعاً وہ شخص ہے جو طاقت کے بل پر دوسرے کی چیز ہتھیا لے۔ اور بابری مسجد شہید کرنے والوں نے یہی کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

② بابری مسجد کی شہادت اور اس کی بت خانہ سازی کرنے والوں کی تائید کرنے والوں کا حکم وہی ہے جو اس کو شہید کرنے والے اور بت خانہ بنانے والے کا ہے۔ ارشاد ہے: انکم اذا مثلھم خواہ وہ تائید خاموش کریں یا ڈنکے کی چوٹ پر۔ لیکن یہ حکم تائید کرنے والے کے لئے ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ان مجبوریوں کی بنا پر جو اس راہ میں حائل ہیں مصلحتاً خاموش ہیں، یہ خاموش تائید نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

③ جس کچہری میں یہ مقدمہ ہے ان کی روش کچھ بھی ہو اس سے گھبرا کر اس مقدمے کی پیروی نہ کرنا حقیقت میں بابری مسجد ہندوؤں کو سپرد کر دینا ہے اس لئے ان کچہری کے ججوں کی روش کچھ بھی ہو مسلمانوں پر لازم ہے کہ پوری توجہ کے ساتھ اس مقدمہ کی پیروی کریں اس میں کوتاہی نہ کریں۔

④ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے جو مسلمان مارے گئے یا مارے جائیں گے بلاشبہ وہ شہید ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

⑤ میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے بہت غور کیا مگر فی الحال بابری مسجد کی بازیابی کے لئے کوئی

تدبیر سمجھ میں نہیں آئی اور جو تدبیر سمجھ میں آتی ہے وہ فی الحال ناممکن ہے مثلاً سارے کلمہ گو پہلے وارننگ دیں کہ ہمیں بابری مسجد واپس کی جائے ورنہ ہم الیکشن کا بائیکاٹ کریں گے، ہندوستان کی کسی بھی پارٹی کو ووٹ نہیں دیں گے اور اس پر مضبوطی سے جم جائیں ایک دو الیکشن میں ایسا ہی کریں تو مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے ظالم وغاصب حکمرانوں کو کچھ ہوش آئے۔ اگرچہ اس میں بھی خطرات ہیں لیکن خطرات کی پرواہ کرکے کچھ نہیں کریں گے تو پھر مسلمانوں کو اسی طریقہ سے ڈھکیلا جائے گا۔ یا کم از کم مسلمان اتنا کریں کہ متحدہ طور پر اپنا ووٹ کسی ایک پارٹی کو دیں جن سے یہ معاہدہ ہو جائے کہ بابری مسجد کی بازیابی کے لئے مسلمان جو مناسب اور ضروری اقدامات کریں۔ اس میں وہ پارٹی مسلمانوں کا ساتھ دے۔

⑤ بابری مسجد کے سلسلے میں کسی صلح کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ کسی صلح کی گنجائش ہے۔ بابری مسجد تحت الثریٰ سے لے کر بیت المعمور تک مسجد ہے۔ اب بھی ہے اور قیامت تک رہے گی اس میں بت رکھ دیا گیا پوجا ہو رہی ہے مگر پھر بھی وہ مسجد ہی ہے جیسے بیت اللہ شریف میں صدیوں تک بت رکھے رہے مگر وہ بت خانہ نہیں ہو گیا، بتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ بیت اللہ تھا، اسی طرح بابری مسجد میں بت رکھ دیا گیا پوجا وہاں ہو رہی ہے مگر اب بھی وہ مسجد ہے اور مسجد ہی رہے گی اس کے کسی جزو کو مسجد سے خارج کرنا اور اس کے عوض نقد یا زمین قبول کرنا حرام وگناہ اور اپنے اوپر جہنم کی آگ کو مباح کرنا ہے۔ پوری مسجد کے تبادلہ کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مسجد میں نمازیوں کے لئے جو استنجا خانہ بنا ہوا ہے اس کا تبادلہ بھی کسی حال میں جائز نہیں۔ فقہائے کرام نے نہایت واضح تصریح فرمائی ہے: "فاذاتم والزم فلا یملک ولا یملک" بابری مسجد تو بڑی چیز ہے اس سے متصل جو میدان تھا وہ حقیقت میں وقفی قبرستان ہے جس پر ظالموں نے قبضہ کر لیا ہے اس کا تبادلہ بھی جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بقلم محبوب اشرف

مفتی دارالعلوم، اشرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ

## فتویٰ دارالعلوم دیوبند

الجواب

① شعائر اسلام کے تحفظ و بقا کی جدوجہد ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے۔ مذہب اسلام کے شعائر اور اس کی امتیازی خصوصیات ہی اسے دیگر تمام ادیان باطلہ سے جدا کرتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کے شعائر کو مٹا دیا جائے تو ان میں اور دوسری قوموں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اپنے شعائر کے تحفظ کی ممکن کوشش کرنی چاہئے۔

② جو مسلمان شعائر اسلام کی حفاظت میں جاں بحق ہو جائے وہ مقتولین فی سبیل اللہ کے زمرے میں آئے گا اور یہی شہادت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ انہی کے سلسلے میں قرآن شریف میں کہا گیا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ٥ (سورۂ بقرہ)

③ بابری مسجد ہو یا دوسری مسجدیں ہوں ان کی بازیابی کے لئے تمام مسلمانوں کو مل کر پرامن اور مثبت کوشش کرنی چاہئے۔

یہ مسجدیں اسلامی شعائر ہیں جن کی بقا و تحفظ قیامت تک کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے۔
ولو خرب ماحوله واستغنٰى عنه يبقى مسجدًا عند الامام الثانى(ابى يوسف) ابدًا الٰى قيام الساعة، وبه يفتٰى۔ (درمختار جلد 3، صفحہ 513)

فقط واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم دیوبند

الجواب صحیح
محمد عبداللہ غفرلہٗ / حبیب الرحمٰن
محمد ظفیر الدین

## فتویٰ وقف دارالعلوم دیوبند

الجواب وبا للّٰه التوفيق

① شعائر اسلام کا تحفظ مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

② بابری مسجد کی بازیابی کے لئے کوشش کرنا عین تقاضائے شریعت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ٥ (اور اللہ کی نشانیوں کی جو عزت کرے اس کے دل کی پرہیز گاری کی وجہ سے یہ ہے) اور استطاعت کے باوجود اس جدوجہد سے قطعی طور پر

لاتعلق ہونا موجب گناہ ہے، اس بازیابی کی تگ ودو میں اگر کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو انشاء اللہ شہادت کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی امداد کرتے رہو) اس جدوجہد میں مال خرچ کرنا بھی باعث اجر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (اللہ کی راہ میں خرچ کرو) واللہ اعلم۔

الجواب صحیح

سید عالم، محمد احسان (نائب مفتی وقف دارالعلوم دیوبند)

28/ذی الحجہ 1421ھ

## فتویٰ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

الجواب وباللّٰہ التوفیق

مسجد اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہے اس کی تعظیم لازمی ہے اور اس کی بے حرمتی نہیں کی جا سکتی اور نہ اس کی بے حرمتی گوارا کی جا سکتی ہے۔ اللہ کے شعائر کی تعظیم ایمان اور تقویٰ کی علامت ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (سورہ الحج) ''اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا پس وہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔ لہٰذا بابری مسجد کی تعمیر نو کی جدوجہد مسلمانوں پر فرض ہے اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش لازمی ہے۔ تحریک بازیابی بابری مسجد سے لاتعلقی ایک بڑا گناہ ہے اور اس تحریک کے راستے میں جان و مال کی قربانی ایمان کا تقاضہ ہے اور جو لوگ اس جدوجہد میں کام آجائیں، وہ شہید ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''من قتل دون ماله فهو شهيد، من قتل دون اهله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد'' ''جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو شخص اہل وعیال کی حفاظت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے اور جو شخص دین وایمان کی راہ میں کام آجائے وہ شہید ہے۔''

بابری مسجد کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے دین وایمان کا مسئلہ ہے نیز یہ مسئلہ ان کی عزت و ناموس کا بھی ہے۔ اس لئے اس کی تعمیر نو کے لئے ہر ممکن جدوجہد ہونی چاہئے۔ اور اس میں پوری ملت کو شریک ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب

محمد طاہر مدنی، مفتی جامعۃ الفلاح

# مسجد کی منتقلی اور مقبوضہ مسجد کے بارے میں

بانی امارت شرعیہ بہار کا فتویٰ

## مسجد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

استفتاء 135: ایک پختہ مسجد ہے وہ کسی خاص شخص کی جانب اس کے دروازے پر تعمیر کرائی گئی ہے، اب وہ شخص اس مسجد کو مسمار کرنے کا ارادہ رکھ کر اس کی حفاظت سے درگزر کرتا ہے تو فرمائیں ایسی حالت میں بستی والے اس کو کسی دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: جس شخص نے جس جگہ مسجد بنوائی اگر وہ زمین خود اس کی ہو، یا اس کو کسی نے بذریعہ بیع و ہبہ دی ہو اور اس شخص نے اس میں نماز باجماعت کے لیے اذن عام دیا ہو اس میں اذان و جماعت ایک مرتبہ بھی ہوگئی ہو تو وہ مسجد قیامت تک کے لئے ہوگئی۔ وہ مسجد وہاں سے منتقل نہیں ہو سکتی کیونکہ دراصل زمین ہی مسجد ہے نہ کہ عمارت اور وہ مسجد اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہوگئی۔ اور وہ شخص اس کی نگرانی و حفاظت نہیں کرتا ہے تو قرب و جوار کے مسلمانوں کو اس کی حفاظت کرنا چاہئے اور مسجد کو کسی حال میں ویران نہ ہونے دیا جائے ورنہ سب لوگ گنہگار ہوں گے۔ شریعت کا یہی حکم ہے۔ اگر وہ مسمار کرنا چاہے تو مسمار نہیں کرنے دیا جائے۔

ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہٗ ٦/ذیقعدہ، 1344ھ

### مقبوضہ مساجد کا حکم

استفتاء 126: (شہر) کے اطراف میں بالکل ویران مساجد ہیں جن پر ہنود نے قبضہ کر رکھا ہے ایک کو بمنزلہ بول و براز بنا دیا ہے اور اس کے اندر پاخانے کے لئے چھاؤنی کر دی ہے۔ دوسری مسجد کی زمین بہت سی اپنے مکان میں داخل کر لی ہے۔ ایک مسجد کا زیریں حصہ دکان بنا لیا ہے۔ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہے؟ مولانا عبدالکافی نے لکھا ہے کہ جو مسجد جس جگہ بنی وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے۔

الجواب: جواب مسئلہ بابت مسجد وہی ہے جو حضرت مولانا عبدالکافی صاحب نے دیا یعنی جس

زمین پر مسجد بنی وہ زمین سے لے کر آسمان تک اور زمین کے نیچے تحت الثریٰ تک قیامت تک کے لئے مسجد ہے۔ مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس ویران مسجد کو آباد کریں اور جس شخص نے قبضہ کرلیا ہے اس سے مسجد واپس لیں۔ پہلے اہلِ محلّہ پر واجب ہے اگر ان سے انجام نہ پائے تو جولوگ ان سے قریب ہوں وہ اس میں حصہ لیں اسی ترتیب سے تمام اہل شہر پھر پورے ضلع کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان مسجدوں کو واپس لیکر آباد کریں ورنہ سخت گنہ گار ہوں گے۔

**ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہٗ**

## تحویل و منتقلی مسجد کے بارے میں عالم عرب کا فتویٰ

### مسجد کی تحویل و منتقلی کا حکم

سوال: ایک قدیم مسجد پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ اس کے بدلہ میں ایک دوسری مسجد تعمیر کی گئی ہے اور اب اس وقت اسی جدید مسجد میں نماز و جماعت اور دیگر دینی شعائر انجام پا رہے ہیں اور قدیم بند پڑی ہے اور اب جب کہ نئی اس کے عوض بن گئی ہے لوگوں کا خیال ہے کہ اس قدیم مسجد کی جگہ پر کوئی اسلامی اور دینی سینٹر قائم کیا جائے اس بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مسجد قدیم علی حالہٖ ہمیشہ باقی رہے گی اس مسجد سے نماز جمعہ اور پنج وقتہ نماز باجماعت کا ترک قطعاً جائز نہیں اور نہ اسے منہدم وغیرہ کر کے اس مقام پر کوئی اسلامی سینٹر یا دینی ادارہ قائم کرنا درست ہے اس لئے کہ مسجد جب ایک بار مسجد بن جاتی ہے اور کوئی زمین مسجد کے لئے وقف کر دی جاتی ہے تو وہ اللہ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ (مساجد اللہ کے لئے ہوتی ہیں) اس میں کسی قسم کا تصرف جو مسجد سے الگ ہو کسی حال میں اور قطعاً جائز نہیں۔ اور نہ بلاضرورت اس مسجد کو چھوڑ کر اس کے عوض دوسری اس کے پاس تعمیر کرنا درست ہے جو مسجد قدیم کے معطل ہونے کا سبب بنے اور اگر ضرورت ہو تو اس قدیم مسجد کی اس طرح توسیع و تجدید کی جائے کہ ضرورت پوری ہو جائے۔ قدیم مسجد کو معطل کر کے نئی مسجد بنانا درست نہیں۔ لہٰذا اس پہلی مسجد کو معطل کرانے کی غرض سے کوئی دوسری نئی مسجد تعمیر کی جائے یا اسے کسی اسلامی سینٹر میں تبدیل کیا جائے، یہ قطعاً حرام ہے اور اس پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ ہم مسجد کے ذمہ داروں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ دونوں مسجد کو ایک ساتھ توسیع وغیرہ کے ذریعہ ضم کر کے دونوں کا احیاء

کریں یا اس طرح کی کوئی دوسری ایسی شکل اختیار کریں جس میں مسجد قدیم کی عبدیت اور تقدس برقرار و بحال رہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

## مسجد کی شرعی حیثیت کے بارے میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا متفقہ فیصلہ

اسلامک فقہ اکیڈمی کے تیرہویں (13) فقہی سیمینار منعقدہ 13 تا 16/اپریل 2001ء بمقام جامعہ سید احمد شہید، کٹولی، ملیح آباد میں ملک بھر سے آئے ہوئے مکاتب فکر کے ایک سو بیس ممتاز علماء ومفتیان کرام نے اپنے دستخط کے ساتھ مندرجہ ذیل فیصلہ کیا:

مساجد کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے اور اس پر جمہور امت کا اتفاق ہے کہ جس مقام پر ایک بار مسجد بنائی گئی وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے اب نہ اس کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے نہ وہ خطہ ارض کسی اور کو ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی شخص یا حکومت اس کی حیثیت کو تبدیل کر سکتی ہے، مسجد دراصل وہ حصہ زمین ہے جسے ایک دفعہ مسجد کے لئے وقف کر دیا گیا ہو۔ مسجد صرف در و دیوار اور مسجد میں استعمال ہونے والے تعمیری سامان کا نام نہیں، اس لئے اگر مسجد کی عمارت منہدم ہو جائے یا اسے ظلماً منہدم کر دیا جائے یا کسی وجہ سے طویل عرصہ تک وہاں نماز نہ پڑھی جائے تب بھی وہ مسجد باقی رہتی ہے اور مسلمانوں پر اس کو دوبارہ آباد کرنا شرعاً واجب ہے۔

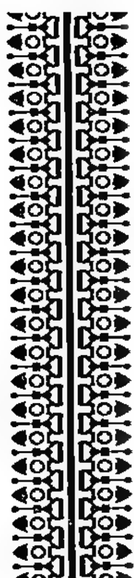
مسجد کا مقصد کائنات کے حقیقی خالق و مالک کی عبادت اور غیر اللہ کی معبودیت کی نفی ہے، اس لئے مسجد کی زمین پر بت خانہ بنانے کی اجازت ہرگز نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ مسجد کے مقصد کے عین برعکس بات ہوگی اور یہ نہ صرف مذہب وعقیدہ بلکہ تقاضائے عقل کے بھی خلاف ہوگا کہ کوئی چیز اپنے برعکس مقصد کے لئے استعمال کی جائے۔

اسلام دنیا میں عقیدۂ توحید کا نمائندہ مذہب ہے اور وہ پوری انسانیت کو اس سچائی کی طرف دعوت دیتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور رب ایک ہی قادر مطلق ذات ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں عدل اور رواداری کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ وہ مذہب کے معاملے میں کسی جبر اور اکراہ کا قائل نہیں، اس لئے اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ کسی فرد یا قوم کی انفرادی یا قومی اور مذہبی زمین پر قبضہ کر کے اسے زبردستی مسجد بنا لیا جائے، اس لئے نہ صرف تاریخ بلکہ عقیدہ اور اسلامی تاریخ کی رو سے بھی یہ بات صریحاً غلط ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں کسی

زمین یا کسی قوم کی عبادت گاہ پر قبضہ کر کے اسے مسجد بنایا ہو۔

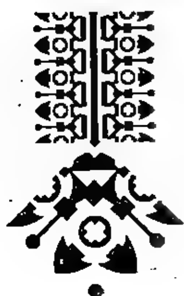
لہٰذا اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ سیمینار متفقہ طور پر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ بابری مسجد یا کسی اور مسجد کے بارے میں ایسی کوئی صلح شرعی اعتبار سے قطعاً جائز نہیں کہ جس کا مقصد مسجد کی حیثیت کو تبدیل کرنا یا نعوذ باللہ اسے بت خانہ بنانا ہو اور یہ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اور علماء امت کا متفقہ فیصلہ ہے۔

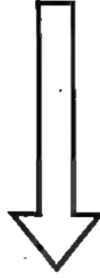




# باب 2

# ہندتو: حقیقت، تاریخ، عزائم





"هندتو کی حقیقت نسل، خون، ھڈی اور تسلسل نطفه ھے. عقیده، شعائر، کتاب، دین، روایات، فلسفه، شاشتر، قانون، فضا، تاریخ، ثقافت، زبان، تهذیب، هیئت، ساخت، جسم، ذرائع سب کچھ عوارض سے زیاده کچھ بھی اهمیت نہیں رکھتے. چنانچه اس فکر کی تین هزار ساله تاریخ دراصل تسلسل نطفه اور تغلب نسل کی تاریخ ھے."

از: مولانا اسرار عالم، "ہندتو"

# ہندتو کی تاریخی حقیقت

از: اسرار عالم

بابری مسجد کی شہادت دراصل وہ علامت ہے جس کے ظہور سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ ہندتو کا ایجنڈا کیا ہے۔ عام طور پر ہندو مذہب سے یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ ''وہ مذہب جس کی پیروی یہاں کے ہندو کرتے ہیں''۔ لیکن ہندو مذہب کا اتنا سادہ مفہوم نہیں ہے۔ جبکہ اسے سمجھنے کے لیے گہرے غور وفکر، تدبر اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کی قدیم تاریخ، ثقافت، دھرم، روایت اور ان کے رشیوں، اچاریوں اور دیوتاؤں کی حقیقت سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مذہب کی نئی تشریح ''ہندتو'' کی حقیقت کو بھی سمجھنا ناگزیر ہے کیونکہ اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے 1989ء میں آر.ایس.ایس کے کل ہند سیوا پرمکھ سوریہ نارائن راؤ نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ لفظ زبان زدعام ہوا۔ لیکن ''ہندتو'' کی حقیقت کیا ہے اور اس کی تہہ میں کون سی روح اور عوامل کارفرما ہیں، اس سے معدود چند ہی واقف ہیں۔ لہٰذا ''بابری مسجد کی شہادت'' کے بعد کے خونریز حالات، ملک میں پے درپے رونما ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی روداد اور بابری مسجد کی تاریخ اور دستاویز سے آگاہ ہونے سے قبل اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ''ہندتو'' کی اصل حقیقت کی رونمائی کی جائے۔ تاکہ ہندو بھائیوں کی نفسیات اور ذہنیت کو سمجھنے میں ہمیں دشواری نہ ہو۔

زیرِ نظر مضمون دراصل معروف اسلامی اسکالر اور مفکر اسلام جناب اسرار عالم کا بصیرت افروز مقالہ ہے جو موضوع کے اعتبار سے دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ توقع ہے کہ اس کے مطالعے سے علماء، دانشور اور سیاستداں کے ساتھ عام لوگ بھی ''ہندتو'' کی اصل حقیقت سے قریب تر ہو جائیں گے۔ یہ مقالہ سب سے پہلے دسمبر 1995ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی کی جانب سے ''ہندتو'' کے نام سے شائع کیا گیا تھا بعد ازاں اسے ادارہ دارالعلم نے شائع کیا۔ اب تک اس کی چھ اشاعتیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ادارہ دارالعلم کے شکریہ کے ساتھ اب اس مقالہ کو ''شہید بابری مسجد'' کے موضوع پر شائع ہونے والی کتاب میں افادہ عامہ کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ہندتو کی حقیقت

ہندتو لفظ ہندو سے مشتق ہے جو قدیم ہے اور نہ ملکی۔ چنانچہ اس لفظ سے اہلِ ہند ناواقف تھے۔ لفظ ہند کا استعمال ایرانیوں اور عربوں نے کیا اور وہ بھی محض جغرافیائی حیثیت سے۔

(ملاحظہ ہوں: طبقاتِ ابن سعد جلد 1، صفحہ 239، سیرت ابن ہشام جلد 2، صفحہ 594-593، تاریخ طبری جلد 3، صفحہ 165، الاصابۃ فی تمیز الصحابہ جلد 7، صفحہ 264، مستدرک جلد 4، صفحہ 35، سنن نسائی باب غزوۃ الہند و مسند احمد مرویات حضرت ابو ہریرہؓ اور معجم للطبرانی مرویات حضرت ثوبان)

اصطلاح ہندو بہ معنیٰ ہندو مذہب کا ماننے والا اور ہندومت یا مذہب بہ معنیٰ ایک مخصوص مذہب تو بلاشبہ گیارہویں صدی عیسوی یا اس کے بعد کا ایجاد ہے۔ چنانچہ البیرونی (متوفی 1048ء) نے اپنی مشہور کتاب "کتاب البیرونی فی تحقیق ما للھند من مقولۃ فی العقل او مرذولۃ" میں ہندومت، ہندو مذہب یا ہندو بہ معنیٰ ہندو مذہب کے ماننے والا کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حتیٰ کہ عہد وسطیٰ کی تصنیف برہس پتیہ شاستر نے بھی اس لفظ کا جغرافیائی معنوں میں ہی استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال اس اعتبار سے نادر ہے کہ اس سے قبل سنسکرت میں اس لفظ کا یوں استعمال نہیں ملتا۔ بیان کیا گیا:

*"Himalayam Samarabhya Yavadindu Sarovaram tam
Devanirmitam desham Hindusthanam Prachakshate."*

ترجمہ: دیوتاؤں کے ذریعہ بنی، ہمالیہ سے اندوسرور تک پھیلی یہ زمین ہندوستان ہے"۔

اس لفظ "ہندتو" کا پہلا استعمال 1989ء کے بعد ہی ہوا۔ میرے علم کی حد تک اس لفظ کا پہلا استعمال آر. ایس. ایس کے کل ہند سیوا پرمکھ کے. سوریہ نارائن راؤ نے اپنے مضمون "The Concept of the Hindu Rashtra" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"What are the factors that have kept this nation as one inspite of the foreign domination for over one thousand years. It is its faith in its age-old culture, Dharma, tradition and its forefathers like Rishis, Acharyas, Sri Rama and Sri Krishna. All this can be condensed into one word and that is the HINDUNESS, HINDUTVA", (Why Hindu Rashtra? Suruchi Prakashan, New Delhi, 1990)

ترجمہ: ''وہ کیا عوامل ہیں جنہوں نے اس قوم کو ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک باوجود غیر ملکی تسلط کے، ایک رکھا۔ یہ ہے اس کا اپنی قدیم ثقافت، دھرم، روایت اور اپنے اسلاف مثلاً رشیوں، اچاریوں، شری رام اور شری کرشن پر یقین۔ ان تمام کو ایک لفظ میں سمیٹا جا سکتا ہے اور وہ ہے ہندو پن، ہندتو''۔

## فکری قدامت

ہر چند کہ یہ لفظ قدیم نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، تاہم وہ فکر جو آج اس لفظ سے سمجھی اور تسلیم کی جاتی ہے بہ الفاظ دیگر وہ احساسات و افکار جن کا اظہار اس اصطلاح سے ہوتا ہے بلا شبہ قدیم ہی نہیں بلکہ ہر زمانے میں موثر رہے ہیں لہٰذا آئندہ سطور میں جو بحث ہوگی وہ اس لفظ سے زیادہ اس فکر سے متعلق ہوگی۔ لیکن اصل بحث سے قبل دو امور کی وضاحت یا تنقیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

## تنقیح

① میں نے ابتداءً لکھا ہے کہ ''میرے علم کی حد تک اس لفظ کا پہلا استعمال ''آر.ایس.ایس' کے کل ہند سیوا پرکھ کے سوریہ نارائن راؤ نے کیا ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہندتو آر.ایس.ایس کی فکر ہے اور اس پر ان کی اجارہ داری ہے۔ بلا شبہ اس لفظ کا استعمال آر.ایس.ایس کے حلقے سے ہوا لیکن جہاں تک اس فکر کی بات ہے یہ تمام ہندوؤں سے متعلق ہے اور دنیا کے اور بطور خاص بھارت کے ہندو اس فکر میں برابر کے شریک ہیں۔ یہ درست ہے کہ حقیقت کے ایک ہوتے ہوئے بھی ہندوؤں کے مختلف طبقات اس کی تعبیر اور منہج یا طریقہ کے اعتبار سے باہم مختلف ہیں۔ لیکن جہاں تک حقیقت یعنی اصول اور ہدف کی بات ہے سبھی متفق و متحد ہیں۔

چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہندتو کے سرخیل طبقات میں سے تین ❶ بلاواسطہ ہندتو کے قائلین، ❷ بالواسطہ ہندتو کے قائلین اور ❸ بنیادی ہندتو کے قائلین۔ اصول اور ہدف میں متحد و متفق ہوتے ہوئے بھی تعبیر و طریقہ کار میں مختلف ہیں۔ ان میں بلاواسطہ ہندتو کے قائلین میں نمایاں ترین داعی سنگھ پریوار ہے بالواسطہ ہندتو کے قائلین میں نمایاں ترین داعی کانگریس ہے اور بنیادی ہندتو کے قائلین میں نمایاں ترین داعی کمیونسٹ پارٹی (M.L) ہے۔

② دوسری تنقیح لفظ ہندو سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نہایت مبہم، پر فریب اور تہہ دار ہے۔ ہندوستان کے تناظر میں اس میں مندرجہ ذیل طبقات شمار ہوتے ہیں۔

❶ ہندو (غیر برہمن، غیر سورن)

❷ ہندو (غیر برہمن، سورن)

❸ ہندو (برہمن (ویشنو))

❹ ہندو (برہمن (سمارتا)) } + سپت رشی براہمن

آئندہ سطور میں ہندو سے اکثر مراد برہمن ہوں گے۔ بصورت دیگر ہندو بہ معنی (غیر برہمن سورن اور برہمن) ہوگا۔ صرف بعض صورتوں میں ہی ہندو سے مندرجہ بالا تمام طبقات مراد ہوں گے۔

ہر چند کہ ہمارے پیش نظر ہندتو تحریک کے فکری پس منظر کی تنقیح و تحقیق ہے تاہم تحقیق حقیقی کے لئے لازم ہے کہ ہم اسے کثیر الجہات طریقے سے دیکھیں۔ یعنی کسی ایک زاویہ اور بُعد کے استعمال کے بجائے مختلف و متبائن ابعاد (Dimension) کا استعمال ہو، تا کہ اصلی حقیقت سامنے آجائے۔

چونکہ یہ تحقیق و تجزیہ مجرد معنوں میں ہندتو کا تجزیہ و تحقیق نہیں بلکہ بین السطور میں اسلام اور مسلمانوں کے تناظر میں ہندتو کا تجزیہ و تحقیق ہے لہٰذا مختلف ابعاد کا استعمال اور بھی ضروری ہے۔

## ہندتو کی تاریخ

ہندتو کی حقیقت اے کہ (एकः) ہے۔ ایکہ کا مفہوم ہے ایک۔ ایک شُرُوتی ہے:

''वृक्ष इव स्तब्धो दिवि तिष्ठत्यकस्तेनेदं पूर्णं पुरूषेण सर्वम्।''

**ترجمہ**: درخت کے مانند، آسمان میں پرسکون تشریف رکھتے ہیں وہی ایک۔ اس پُرش میں، اس کمال میں، یہ سراسر مکمل ہے''۔

بادی النظر میں یہ ''ایکہ'' توحید یا بصورت دیگر وحدت الوجود کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے ابتداً ایسا ہی ہو۔ لیکن اس بد بخت قوم نے (جس کی تفصیل انشاء اللہ آئے گی) اپنے نفسوں اور خلق خدا پر ظلم کیا، احکاماتِ ربانی کو جھٹلایا اور انبیاءؑ کی تکذیب کی اور زمین کے ساتھ احکامات ربانی کو بھی فساد سے بھر دیا۔ چنانچہ رچاؤں میں اب جو کچھ حق یا حق نما نظر آتا ہے وہ انہیں احکامات کے مابقیہ ہیں۔

چنانچہ مذکورہ ''ایکہ'' کی ابتدائی صورت ایک تو وہ تھی جو ان تشریحات میں نظر آتی ہے:

''एष सर्वेश्वर एष भूतधिपतिरेष भूत पाल
एष सेतुर्विधरण एषां लोकनामसम्भेदाय!''

**ترجمہ**: ''یہ'ایک ہی' سب کا خدا ہے۔ تمام ذی روح کا مالک اور اب یہ ایک ہی پل کے مانند ہو کر سارے عالم کو تباہی سے بچاتا ہے۔''

''एषास्य परमा गतिः, एषास्य परमा सम्पद,
एशोऽस्य परमो लोकः एशोऽस्य परम आनन्दः!''

**ترجمہ**: ''وہ ایک ہی ہیں جو ذوی ارواح کی حرکت اعلیٰ ہیں۔ جو ذوی ارواح کا سرمایہ ہیں۔ جو ذوی ارواح کا ملجاء اعلیٰ ہیں۔ جو ذوی ارواح کا رضوان ہیں۔''

یہی'ایکہ' فساد سے آلودہ کردی گئی۔ ایکہ کے معنیٰ بدل گئے اور فلسفیانہ تاویلات نے اس نئی فکر کو دو اور اصطلاحات سے ہم کنار کیا۔ وہ دو اصطلاحات ہیں:

مہت (महत्)

چتی (चित्)

اب ایکہ کی اصل رب کائنات نہیں رہ گیا بلکہ قدیم کے ''برہما'' کے بجائے ''متبدل برہما'' اور اُس کے سات بیٹے ـــــ سات پرجاپتی المعروف بہ سات رشی: پڑی گھو، پُلستیا' اَنگی رَاس، مریچی، دَکشا، اَترِی اور وَسِشٹھ اس کی اصل اور محور ہو گئے۔ (حسب ضرورت اس میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ ملاحظہ ہو وِشنو پُران اور پدّم پران کے فروق) ہر مَنُ وَنتر میں ایک مَنُو ہوا اور اب تک چھ منو گزر چکے ہیں۔

اب'ایکہ' مَہَت اور چِتی کا محور اصلاً برہمن نسل ہو گئی اور اس کے چاروں طرف فلسفوں، روایات، تصنیفات، ثقافت، تہذیب اور مروۃ کا جال بن دیا گیا جس کے پردے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ اور مظالم کا ایک ایسا سلسلہ چلا جس کا خاتمہ نظر نہیں آتا اور یہی اس قوم کی بدبختی ہے۔

نسلی تفوق اور اس پردے میں ظلم کی یہ تاریخ تین ہزار سالوں سے جاری ہے۔ ساتویں من ونتر یعنی موجودہ عہد، ست پتھ براہمن کے مطابق، وے وی وت اور دکشا براہمن کی بیٹی ادا سے شروع

ہوا۔ یہی بھارت ورش کے ابتدائی ہندو تھے۔

بھارت میں آکر بس جانے والی یہ نسل جو آریہ کہلائی کئی قبیلوں میں منقسم تھی۔ رگ سنہتا کے مطابق یہ (1) اَنو (अणु) (2) دُرُو ہرے (द्रुह्य) (3) یَدُو (यदु) (4) تُروس (तुर्वस) (5) پُرُو (पुरू) اور ذیلی قبیلے (6) بھَرَت (भरत) (7) کِروِی (क्रिवि) اور (8) ترِت سُو (त्रित्सु) کے نام سے مشہور تھے۔ اس نسل نے خون کی ندی بہا دی۔ مقامی اور غیر آریہ قوموں: (1) اج (अज) (2) یکشو (यक्षु) (3) ککٹ (किकट) (4) پشاچ (पिशाच) (5) ششرو (शिश्रु) غلام بنا لئے گئے۔ اور یہیں سے ہندتو کا آغاز ہوا۔

مغلوب قوموں کے ساتھ اپنی زندگی کو اپنی خواہش اور اپنے مفادات کے مطابق استوار کرنے کے لئے عقیدے، فلسفے، روایات، ثقافت اور تہذیب کی تشکیل ہوئی۔

غیر آریہ قوموں کے نام رکھے گئے: (1) اَنَاریہ (غیر مہذب) (2) اَنَاسہ (अनास:) چپٹی ناک والے، (3) اَدیُویو، (अदेवयु) دیوتاؤں کی طرف غیر ملتفت (4) اَکرمَن (अकर्मन्) (5) شِشنَن دیوہ (शिश्नदेव:) (6) انیہ وَرَت (अन्यव्रत) (7) مِردھ واک (मृध्रवाक्) وغیرہ۔

ایسی غیر آریہ قومیں جو مزاحمت کے بعد حلیف ہوگئیں مگر جن کے طبعی خواص آریوں کو نافع نظر آئے ان کی الگ درجہ بندی کی گئی اور وہ خدمت گذار مگر آزاد قرار پا کر چھتری قرار پائے۔ وشو پران کہتا ہے کہ وشنو کے چھٹے اوتار اور پہلے رام۔ پرسورام نے تہیہ کیا تھا کہ وہ چھتری نسل کو تین بار سات سات مرحلوں میں نیست و نابود کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ پرسورام تریتا عہد یعنی عہدِ دوم کی پیداوار تھے۔

ایسی غیر آریہ قومیں جو بغیر مزاحمت یا کمتر مزاحمت کے بعد حلیف ہوگئیں یا جن کے طبعی خواص درجہ دوم میں نافع نظر آئے خدمت گزار اور آزاد شمار ہو کر ویشیہ قرار پائے۔ (وشنو پران)

ایسی غیر آریہ قومیں جو مغلوب ہونے کے باوجود اپنے طبعی خواص کے اعتبار سے کمتر درجے میں نافع پائے گئے۔ ہمیشہ کے لئے غلام بنا دئے گئے اور دَسیو (Dasyu) کہلائے۔ اکثر غیر آریہ کالے اور آریہ تانبے کی طرح سرخ تھے اس لئے اَسوَرا (Asura) اور سُوراَ (Sura) کہلائے۔ یہ اظہار رامائن اور مہابھارت میں ہے۔ لیکن اس سے قبل رگ وید اور اتھر وید میں یہی اسورا (Asura) اور دیوا (Deva) تھے۔ گویا ایک دیوتا کی قوم تھی اور دوسری غیر دیوتا کی۔ براہمن تو اکثر کلمات سے

ہی شروع ہوتے ہیں:

"Devasura Va Eshu Lokeshu Samayatanta"

**ترجمہ:** ''اس دنیا میں خداوندان اور اسورر ہتے ہیں۔''

ہندتو کی حقیقت نسل، خون، ہڈی اور تسلسل نطفہ ہے۔ عقیدہ، شعائر، کتاب، دین، روایات، فلسفہ، شاشتر، قانون، فضا، تاریخ، ثقافت، زبان، تہذیب، ہیئت، ساخت، جسم، ذرائع، سب کچھ عوارض سے زیادہ کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس فکر کی تین ہزار سالہ تاریخ دراصل تسلسل نطفہ اور تغلب نسل کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے:

① عہدِ استغلاب (Period of Overtaking) 1500 قبل مسیح سے 550 قبل مسیح تک۔

② عہدِ احیاء (Period of Revival) 272 قبل مسیح سے 1993 عیسوی تک۔

عہدِ استغلاب کے چار مراحل گزرے ہیں:

① پہلا مرحلہ 1500 قبل مسیح تا 1000 قبل مسیح

② دوسرا مرحلہ 1000 قبل مسیح تا 800 قبل مسیح

③ تیسرا مرحلہ 800 قبل مسیح تا 600 قبل مسیح

④ چوتھا مرحلہ 600 قبل مسیح تا 550 قبل مسیح

عہدِ احیاء کے تین مراحل ہیں:

① پہلا مرحلہ 320 عیسوی تا 413 عیسوی

② دوسرا مرحلہ 650 عیسوی تا 750 عیسوی

③ تیسرا مرحلہ 1947 عیسوی تا تادمِ تحریر

تیسرے مرحلے کی تاریخ دراصل 1556 عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کے چار مرحلے 1947ء سے قبل گزر چکے ہیں۔

① 1556 تا 1707 ② 1707 تا 1858

③ 1858 تا 1905 ④ 1905 تا 1947

## ترکیب و عمل

ہندتو کی ہیئت بنیادی اعتبار سے چار چیزوں سے مرکب ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

① اصول ② ساخت

③ جسم ④ ذرائع اور آلہ جات

عام طور پر دنیا کے ادیان، اجتماعات اور افکار میں مذکورہ امور میں سے اوّل الذکر تین یا کم از کم ایک لازماً حقیقت سمجھے اور قرار دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہندتو کی فکر بالکل جداگانہ ہے جس کی مثال دنیا میں صرف ایک ہے۔ اس میں مذکورہ تمام کے تمام امور حقیقت نہیں بلکہ عوارض ہیں۔ چنانچہ ذرائع اور آلہ جات کی بات تو الگ رہی، جسم، ساخت، حتیٰ کہ اصول بھی حقیقت نہیں بلکہ عوارض ہیں۔ چنانچہ ترقی اور تنزلی کے حالات میں ان عوارض میں اُبھار اور سمٹاؤ ہوتا ہے۔ لیکن اس اُبھار اور سمٹاؤ میں تدریج اور ترتیب ہوتی ہے۔

بصورت ترقی علی الترتیب اصول، ساخت، جسم اور آلہ جات میں پھیلاؤ اور اُبھار آتا ہے۔ بصورت تنزل علی الترتیب آلہ جات، جسم، ساخت اور اصول پچکتے اور سمٹ جاتے ہیں۔

## اتساع و انقباض کی کیفیت

ہندتو ترقی کی صورت میں لامتناہی طور پر پھیلتا ہے۔ اس کی وجہ اس نسل کی نفسیات ہے۔ بنیادی طور پر ہندو نفسیات غیر معمولی طور پر حساس اندرونی نفسیات (Insular-psyche) کی حامل ہے۔ لہٰذا اپنی اصل کے اعتبار سے اس کا رجحان تسابق للبقاء کا نہیں ہوتا بلکہ تنازع للبقاء کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی مقابل قوم فکر، عقیدہ، قوت اور اجتماعیت کے اعتبار سے اتنی ہی قلاش اور مفلوک الحال واقع ہوئی کہ ہر طرح کی ذلت برداشت کرنے کو تیار ہو جائے جب بھی ہندو نفسیات دنیا کی دیگر قوموں کے مقابلے میں مغلوب قوم کی اس درجہ تذلیل پر بھی بس نہیں کرتی اور اسے مزید سے مزید ذلیل کر کے مقام انسانیت سے ہی خارج کر دینا چاہتی ہے۔ چنانچہ ہزار سالوں کے بعد بھی ہندو قوم سے ہار جانے والی قومیں تمام ذلت برداشت کرنے کے باوجود سکون نہیں پا سکیں۔ جو قوم اتنی مفلوک الحال نہ ہو اس سے تسابق للبقاء کا سوال ہی نہیں اُٹھتا بلکہ تنازع للبقاء کی بھی انتہائی صورت درپیش ہوتی ہے۔

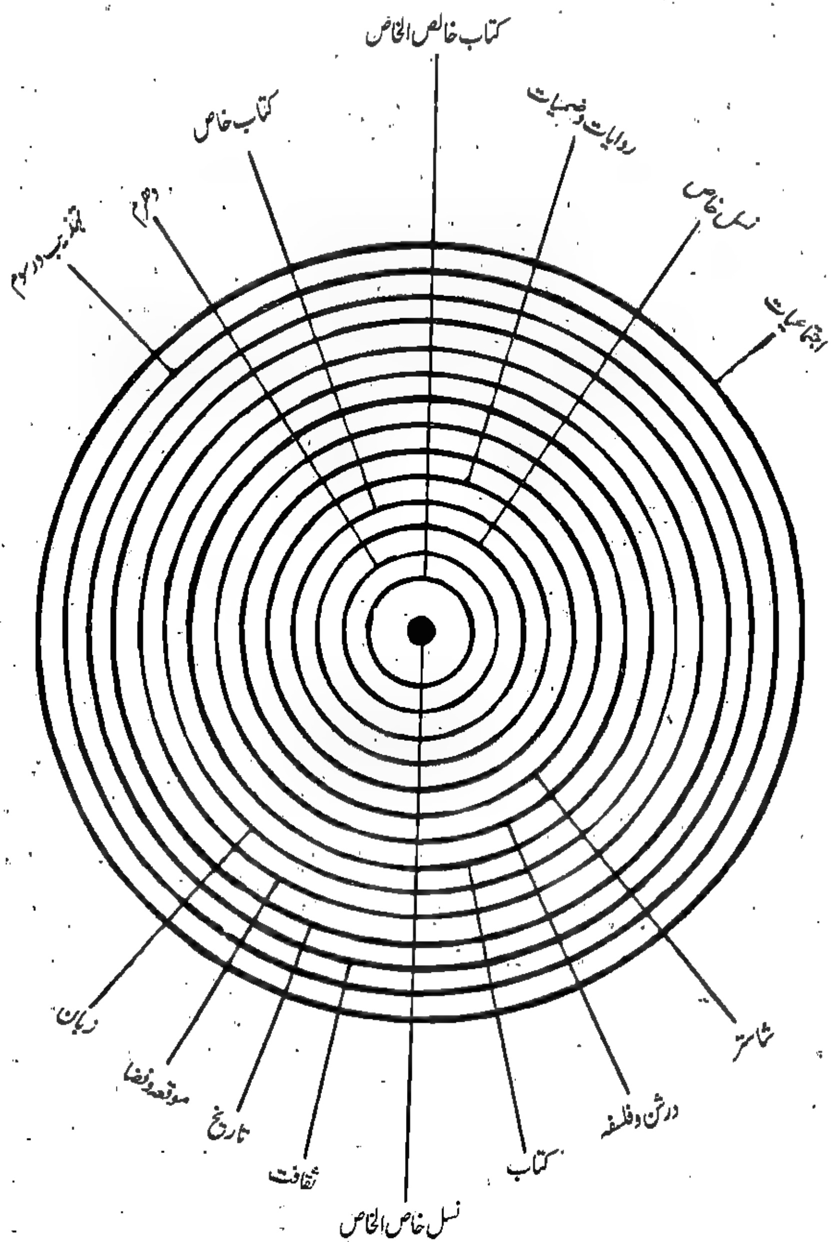
اس کے برخلاف تنزل کی صورت میں ہندتو کچھوے کی طرح سمٹ جاتا ہے، مگرمچھ کی طرح ساکت وصامت ہو جاتا ہے اور سیپ کی طرح مضبوط خول میں چھپ جاتا ہے۔ اتساع وانقباض کی کیفیت بے تحاشا نہیں ہوتی۔ بلکہ ہر عامل دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا حصہ نا قابل تبدیل اور دوسرا قابلِ تبدیل نظر آتا ہے۔ چنانچہ اتساع کی صورت میں آج کا قابل تبدیل حصہ بھی نا قابل تبدیل بن جاتا ہے اور ہندتو آگے بڑھ کر اور نئے دعوؤں کے ساتھ ایک نیا قابل تبدیل حصہ بنالیتا ہے۔ اسی طرح اتساع کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس کے برخلاف انقباض کی صورت میں کل کا نا قابل تبدیل حصہ آج قابل تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور ہندتو سمٹ کر اور اندر چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایسا لگتا ہے کہ ہندتو کی کوئی شئے نا قابلِ تبدیل نہیں۔ اس طرح کسی وقت ہندتو کی ہیت درج ذیل امور پر مشتمل ہوتی ہے:

نا قابل تبدیل اصولیات، قابل تبدیل اصولیات، نا قابل تبدیل ساخت، قابل تبدیل ساخت، نا قابل تبدیل جسم، قابل تبدیل جسم، نا قابل تبدیل آلہ جات اور قابل تبدیل ذرائع وآلہ جات۔

اتساع وانقباض کی یہ کیفیت پندرہ امور کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔ گزشتہ تین ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد عدل ہے۔ وہ پندرہ امور درج ذیل ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| 1) نسل خاص الخاص | 2) کتاب خاص الخاص | 3) دھرم |
| 4) نسل خاص | 5) کتاب خاص | 6) روایات وضمنیات |
| 7) شاستر | 8) درشن وفلسفہ | 9) کتاب |
| 10) زبان | 11) موقع وفضا | 12) تاریخ |
| 13) ثقافت | 14) تہذیب ورسوم | 15) اجتماعیات |

درج ذیل دائروں (Circle) سے اتساع اور انقباض کی کیفیت کے پندرہ امور کی وضاحت ہو سکتی ہے:



## ہندتو کے اقدامات کی میکانکیت

اتساع و انقباض کی حالتوں میں ہندتو کے اقدامات کی میکانکیت اتنی پیچیدہ اور تہہ دار ہوا کرتی ہے جس کا احاطہ کرنا یہاں آسان نہیں چہ جائیکہ مدلل استیعاب۔ میکانکیت کو صرف تقریب فہم کے لئے 8 حصوں میں منقسم کرتا ہوں:

① **توسیع وتبدیل کی میکانکیت:** یہ وہ میکانکیت ہے جس کے ذریعہ ہندتو اپنے اصول، ساخت، جسم اور ذرائع میں ترقی وتنزلی کو دیکھتے ہوئے حسب موقع توسیع وقبض کرتا ہے۔

② **تحریف و الحاق کی میکانکیت:** یہ وہ میکانکیت ہے جس کے ذریعہ ہندتو حقیقت حق، صحائف حق، اور مبلغ حق میں تحریف وتلبیس کرتا ہے۔ چنانچہ دیگر امور کا تو ذکر ہی کیا ہندتو کے اصل الاصول اور سرچشمۂ ہدایت رگ وید کی مثال کافی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ ویدویاس نے وید راشی سے وید کے رچاؤں کی رچنا کی۔ انہوں نے پَیل رشی کو دیا۔ پَیل رشی نے اسے اپنے دو شاگردوں اندر پرمیتی اور باسکل کو دیئے۔ اِندر پرَمیتی نے شاکلیہ کو اور باسکل نے اپنے چار شاگردوں کو دیئے۔ پاتن جلی کے زمانے میں رگ وید کی شاکھاؤں کی تعداد 21 تھی۔ ان 21 شاکھاؤں کی ترکیب وَتالیف جدید ہوئی اور انہیں پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا یعنی: شاکل، باسکل، اَشولائن، شانکھائن اور مانڈوکیہ۔ بعد میں دیومتر شاکلیہ نے پانچ ذیلی شاکھائیں ترتیب دیں۔ اب اس وقت جو رگ وید دستیاب ہے وہ صرف شاکل ہے۔

پھر ہر وید کی طرح رگ وید کے برہمن ہیں۔ اس پر مستزاد ہر وید کے اپنے اپنے اُپ نشد ہیں۔ براہمن اور اپ نشد بھی ایک ایک نہیں بلکہ کئی کئی ہیں۔ بظاہر یہ براہمن اور اُپ نشد تفسیر وتوضیح نظر آتے ہیں لیکن اصلاً ان کا تعلق ہندتو کے تحریف والحاق کی میکانکیت سے ہے۔

③ **تصنیف وتلبیس کی میکانکیت:** ہرچند کے ظاہراً یہ تصنیف وتالیف سے مشابہ اور باطناً تحریف والحاق سے مشابہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس باطن کے کئی بواطن ہیں اور ہر ایک اپنے میں تلبیس ہے، اس کے تین حصے ہیں:

❶ **تلبیس:** یہ ایک غیر معمولی عمل ہے جس کے عدیم النظیر نمونے چھ فلسفے (شڈ درشن षड्दर्शन) ہیں۔ یہ چھ فلسفے ہیں: گوتم کا نیائے، کناد کا وے شے شک، کپل کا سامکھیہ، پتنجلی کا یوگ،

ویاس کا اتر،ممانسا (ویدانت) اور جےمنی کا پرومانسا۔

❷ توجیہ: ہندتو کی ترقی واستحکام میں کہا جاتا ہے کہ سمرتی گرنتھوں سے زیادہ جس تصنیف کا عمل دخل ہے وہ ہے پران وانگ مئے۔ یہ بات فی الواقع درست ہے۔ یہی وہ تصنیف ہے جس نے ہر بحرانی کیفیت سے ہندتو کو نکالا اور ہر مہم کو سر کرنے اور ہر فتح کو درجہ کمال تک پہنچانے میں اس کی مدد کی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہندتو اپنے نظام، اپنے اقدامات اور عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے اور اپنے ہر ظلم کا جواز ثابت کرتا ہے۔ کہا گیا:

सर्गश्च प्रतिसर्गश्च
वंशो मन्वन्तराणि च।
वंशानुचरितं चेति
पुराणं पञ्चलक्षणम्।।

تلبیس کی انتہا یہ ہے کہ ہندتو نے اپنے یہاں تلبیس در تلبیس اور باطن در باطن کا طریقہ اختیار کیا۔ جب پرانوں کی حقیقت نفس الامری کا سوال اُٹھا تو کہا گیا کہ خود ویاس نے ویدوں اور مہابھارت کی رچنا کے بعد کلیگسارنبھ یعنی کل یگ کی شروعات کے وقت ہی ان 18 پرانوں کا نرمان کیا تھا، اس مخصوص میکانکیت کا نتیجہ ہی ہے کہ شنکر آچاریہ نے بھی اسے ویاس ورچت ہی کہا ہے۔ یہ 18 پران ہیں: برہما پران، پدم پران، وشنو پران، شیو پران، بھاگوت پران، بھوشیہ پران، نارد پران، ماکنڈیئے پران، اگنی پران، برہم دے ورت پران، لنگ پران، وراہ پران، سکند پران، وامن پران، کورم پران، متسیہ پران، گروڑ پران اور برہمانڈ پران۔

④ تقنین: تصنیف و تلبیس کی میکانکیت کا یہ تیسرا اہم حصہ ہے۔ تقنین کا یہ عمل نہایت پیچیدہ اور ہمہ جہت طریقے سے ہوتا ہے تاہم یہاں ہم اسے تین طریقوں میں منقسم کرتے ہیں:

❶ بذریعہ قانون نگاری و دستور سازی: قانون نگاری کا مفہوم ہے ماقبل کے تمام علمی خزانوں کا استعمال کرتے ہوئے اور اپنی موجودہ اور آئندہ مفادات، ضرورتوں اور مسائل کا لحاظ کرتے ہوئے کسی وقت وعہد خاص میں اپنے ضروری رویہ اور طریقہ کار کے جواز کو قانوناً ثابت کرنا اور اس کو باضابطہ قانون کی شکل دینے کے لئے قانون نویسی کرنا۔

ہر چند کہ ہندتو کا دعویٰ ہے:

वेदोऽखलो धर्ममूलं (मनु-2-6)

یعنی شروتی ہی دھرم کا مول ہے۔ لیکن درحقیقت سمرتی گرنتھوں کو ہی دھرم شاستر نام دیا گیا ہے۔ کہا گیا:

धर्मशास्त्र तु वै स्मृतिः

سمرتی وانگ مئے میں چار ورن اور چار آشرم سے متعلق قانون پایا جاتا ہے۔ غالب برہمنوں اور مغلوب قوموں کو منظم و منضبط کرنے کی اور اپنی ناانصافی کو سند جواز عطا کرنے کی یہ ایک بھرپور کوشش تھی۔ سوتر بدھ وانگ مئے میں... گوتم، بودھائن، اپستمبھ، وششٹھ، وشنو، ہارت، وے کھانس، شنکھ، اتری، کنو، کاشیپ، گارگیہ، بدھ، برہسپتی، دھرم سوتر، منو، یگیہ دلکیہ، پاراشر، نارد، برہسپتی، کاتیائین، انگیرا، دکش، پتامہہ، پلستیہ، پرچےتس، پرجاپتی، مریچی، یم، وشوامتر، ویاس، ہارت سمرتی اور سارے ہندوستان میں پھیلے نبندھ گرنتھوں کا سلسلہ شامل ہیں۔ یہ عمل گزشتہ دو ہزار سالوں سے زائد عرصے سے آج تک جاری ہے۔

یہ عمل دو مرحلوں میں ہوا کرتا ہے۔ سیاسی و عسکری غلبے سے قبل یعنی عہد نہضت میں اور سیاسی و عسکری غلبے کے بعد۔ عہدِ نہضت میں اس کی عام حالت صرف قانون نویسی تک محدود رہتی ہے لیکن عہد تغلب میں وہ باضابطہ قانون سازی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ کوٹلیہ کا ارتھ شاستر بیک وقت ان دونوں صورت حال کا اچھا نمونہ ہے۔

عہد موجودہ میں اگر دیانند سرسوتی (1824-1883)، اروند (1872-1950)، ویویکانند (1863-1902)، بال گنگا دھر تلک (1856-1920)، جواہر لال نہرو (1889-1964)، رادھا کرشنن، اور دین دیال اُپاھیائے کی تحریریں توجیہ اور قانون سازی کے ذیل میں رکھی جا سکتی ہیں۔ تو دستور ہند اور ہندتو کوڈبل قانون سازی کے ذیل میں۔ یہاں میں نے دیگر اشخاص کے ساتھ مہاتما گاندھی کا نام بطور خاص نہیں لیا، اس کی توجیہ آئندہ آئے گی۔

❷ **استحکام:** استحکام کا عمل تقنین کے وسیع عمل کا ایک حصہ ہے۔ استحکام کا مفہوم ہے اس قانون سازی کے لیے میدان عمل استوار کرنا اور زمین پر اس قانون کی عملی تنفیذ کر کے اسے مستحکم بنانا۔ اس کے تحت خصوصاً چار کام ہوتے ہیں:

① قوت نافذہ کا حصول ② ارضی استحکام

③ انتظامی مرکزیت کا قیام ④ توسیع انتظام و میدانِ عمل

ہر چند کہ یہ عمل خالص ملوکانہ، حاکمانہ اور عسکری نظر آتا ہے لیکن ہندتو کی بنیادی فکر و عمل سے اس کا براہِ راست تعلق ہے۔ چنانچہ اس کے تحت ہندتو سب سے پہلے اقتدار اور قوت نافذہ کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ پھر حصول قوت نافذہ کے بعد اس دائرہ عمل کو اراضی اور انتظامی اعتبار سے مستحکم (Consolidated) بناتا ہے۔ جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تب خود بخود اس کے اندر ایسے عوامل، جراثیم اور داعیات پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ انتظامی مرکزیت کے قیام کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ ہمیشہ تاریخ میں یہ عمل ''مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی'' کے مصداق ثابت ہوا ہے لیکن فی زمانہ یہی رجحان اسے سب سے زیادہ پسندیدہ نظر آتا ہے۔ ابھی یہ عمل چل ہی رہا ہوتا ہے کہ چوتھا عمل یعنی توسیع دائرہ انتظام و میدانِ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں ہندتو کا یہ میلان سفر بلا استثنا تین ہزار سالوں سے قائم ہے اور معاصر عہد میں بھی اس ذیل میں اس کے اعمال کی ایک ایک بات ہو بہو وہی ہے جو عہد گپت، عہد مہا کاویہ اور عہد وید میں رہی ہے۔ ان چاروں مرحلوں میں جو بات نمایاں رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندتو کو مطلق انسانی اخلاق سے کبھی تعلق نہیں رہا بلکہ اس کا نظریہ اخلاق اس معاملے میں یہ رہا ہے کہ ''ذریعہ قابل بحث نہیں مقصد اور ہدف کا حصول اصل ہے''۔ ہدف کا داعیہ اور حقیقی صورت حال اس بات کی پوری اخلاقیات فراہم کرتے ہیں کہ ذریعہ کیا اختیار کیا جائے۔

چنانچہ یجر وید میں ہے:

यो 5 अस्मभ्यमरातीयाद्यश्च नो द्वेषते जनः।
निन्दाद्यो अस्मान् धिप्साच्च सर्वं तं भस्मसा कुरु।। 11:80

**ترجمہ** : ''اے سبھا اور سینا کے مالک! آپ ان لوگوں کو جو دھرماتماؤں سے دشمنی کریں، جو ہمارے ساتھ بدتمیزی کریں، اور ہمیں ذلیل کریں، جو ہمیں نیچا دکھلائیں، اور ہمارے ساتھ فریب کریں، ان سب لوگوں کو جلا کر پوری طرح راکھ کر ڈالئے۔''

नमस्ते रूद्र मन्यव उतो त इषवे नमः।
बाहु भ्यामुत ते नमः।। 16:11

**ترجمہ** : ''اے (رُدر) شریر دشمنوں کو رلانے والے بادشاہ! تیرے غصہ سے بھرے بہادر نفس

کے لئے وجر حاصل ہو! اور دشمنوں کو مارنے والی تیری ذات کے لئے اناج حاصل ہو! اور تیرے بازوؤں سے (نکلے) وجر دشمنوں کو حاصل ہوں!''

अवसृष्टा परा पत शरव्ये ब्रह्मस शिते।
गच्छामित्रान् प्र पद्यस्व मामीषांकंचनोच्छिषः।। 17:45

**ترجمہ:** ''اے تیر اندازی میں ماہر وید کے علماء سے تعریف اور تعلیم حاصل کئے ہوئے سپہ سالار کی عورت! تو پریرنا کو حاصل ہوئی۔ دور جا، دشمنوں پر دھاوا بول۔ اور اسے مار کر فتح حاصل کر، ان دور ملکوں میں رہنے والے دشمنوں کو بغیر قتل کئے نہ جانے دے۔''

वि न इन्द्र मृधो जहि नीचा यच्छ पृतन्यतः।
यो अस्मां 2 अभिदासत्यधरं गमया तमः।। 18:70

**ترجمہ:** ''اے (اندر) اعلیٰ ترین قوت والی فوج کے سردار! تو معرکوں کو بطور خاص جیت! فوجوں والے دشمنوں کو (ہرا کر) ذلیل کر۔ جو ہمیں تباہ کرنے کی خواہش رکھتا ہے انہیں مہیب تاریکیوں میں دھکیل دے۔''

لیکن اس سے کہیں زیادہ واضح تحریر اتھروید میں ہے:

ममाग्ने वर्चो विहवेष्वस्तु वयं त्वेन्धानास्तन्वं पुषेम।
मह्यं नमन्तां प्रदिशश्चतस्रस्त्वयाध्यक्षेण पृतना जयेम।। 5:3:1

**ترجمہ:** ''(اے آگ) اے تمام جانوں کی جان! معرکوں میں میری روشنی ہو۔ ہم لوگ تجھ کو روشن کرتے ہوئے اپنے جسم کو پالیں۔ چاروں سمتیں ہمارے لئے جھک جائیں۔ تیری سربراہی میں ہم معرکوں کو سر کریں۔''

सर्वेषां च क्रिमीणां सर्वासां च क्रिमीणाम्।
भिनद्म्यश्मना शिरो दहाम्यग्निना मुखम्।। 5:23:13

**ترجمہ:** ''اور سب کیڑوں کا، اور سب کیڑوں کی عورتوں کا سر پتھر سے میں پھوڑتا ہوں۔ اور ان کے چہروں کو آگ سے جلاتا ہوں''۔

अक्ष्यौ निविध्य हृदयं निविध्य जिह्वां नि तृन्द्धि प्रदतो मृणीहि।
पिशाचो अस्य यतमो जघासाग्ने यविष्ठ प्रति तं शृणीहि।। 5:29:4

**ترجمہ:** ''اس کی دونوں آنکھیں چھید ڈال، دل، زبان کاٹ لے اور دانتوں کو توڑ دے، جس

کسی پشاچ نے گوشت کھایا، اے سب سے بڑی طاقت والے صاحب علم! اس کو واضح طور پر ٹکڑے ٹکڑے کرڈال"۔

कृतं मे दक्षिणे हस्ते जयो मे सव्य आहितः।
गोजिद्भूयासमश्वजिद् धनंजयो हिरण्यजित्॥ 7:50:8

**ترجمہ**: "کرم (عمل) میرے داہنے ہاتھ میں اور فتح میرے بائیں ہاتھ میں ہے۔ میں زمین جیتنے والا، گھوڑے جیتنے والا اور دولت جیتنے والا رہوں"۔

یہی وہ موقف ہے جو الہ آباد کے کتبوں میں سمدر گپت سے متعلق یوں مذکور ہے:

"अनेक आर्यावर्तराजप्रस भोद्धरणोद्धृत प्रभावमहतः"
"प्रभृति सर्वदक्षिणापथराजग्रहण मोक्षानुग्रहजनित
प्रतोपोन्मिश्र महाभागस्य"

اور عہد موجودہ میں "پنج شیل، اکھنڈ بھارت، وریتر بھارت اور Vision 2000 کے نظریوں اور انضمام ریاست، تنظیم جدید ریاست کے اقدامات کی شکل میں یہی موقف ظاہر ہورہا ہے۔

❸ تطبیق: تقنین کا تیسرا اہم حصہ تطبیق ہے۔ تطبیق کا مفہوم ہے کہ ہندتو کی توسیع، تقویت، استحکام اور مفادات کی حفاظت کے لئے موجودہ ہندو سماج کے طبقات کو ازسرنو منظم کرنا۔ اس کے ذیل میں اصل ہندو یعنی براہمن چھتری سے لے کر شودر تک تمام غلام داخلی طبقات کی اور دیگر خارجی طبقات کی ازسرنو درجہ بندی کرتا ہے اور اس میں تغیر وتبدیل، اخراج وادخال، تفریق وانضمام کا غیر معمولی عمل دہرایا جاتا ہے۔ اس کے لیے اگر ضروری ہوا تو کسی مرحلے میں بزور مزاحم قوت کا خاتمہ کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔

کبھی یہ عمل بزور ہوتا ہے کبھی برہمنوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اور کبھی غلام طبقات کے کسی فرد کو آلہ کار بنا کر اس کے ذریعہ کروایا جاتا ہے۔ (اس میکانکیت کا ذکر آئندہ اوتار کے ذکر کے ذیل میں ہوگا) ہندتو کا یہ عمل ایک لامتناہی طور پر ہمہ دم بہنے والے دریا کی طرح ہے۔ گزشتہ تین ہزار سالوں سے اپنی کلیات میں ذرہ برابر تبدیلی کیے بغیر اس کا یہ عمل اب تک جاری ہے۔

چنانچہ اسی عمل کے ذریعہ ہندوؤں نے بربریت کے ساتھ دشمن قوموں کو قتل کرکے اور انہیں مغلوب بنا کر (اگر وہ درجہ اول میں ان کے حلیف ہو گئے تو) انہیں چھتری کا درجہ دیا۔ وشنو پران میں پرشورام کے ذیل میں اس عمل کا ذکر ہے۔ ہر زمانے میں یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض قومیں جو کبھی بحیثیت

چھتری داخل کی گئیں تھیں دوسرے عہد میں نکال باہر کی گئیں اور دیگر قوموں کو وہ مقام دیا گیا۔ عہد وسطٰی میں ہن، شک اور یوچی کے بعض جنگجو قوموں کے بچے کھچے افراد کو یہی مقام دیکر راجپوت قرار دیا گیا اور آج بھی چند شودر قومیں اور چند ویشہ قومیں اسی مقام کی طرف لے جائی جارہی ہیں۔

ویشہ ہندتو کا ایک پیمانہ تحقیق ہے۔ چنانچہ ایسے گروہ جو حصول دنیا کو زندگی کا محور قرار دیتے ہیں اور حصول دولت کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے نہ ہندوؤں کی اجارہ داری کو کبھی چیلنج کرتے ہیں، مزاحمت کے بدلے مفاہمت کا سہارا لے کر صرف حصول دولت میں مشغول ہوتے ہیں تو ایسے خواص رکھنے والی قوموں کو وہ ویشہ کا درجہ دیتے ہیں۔ جن قوموں میں یہ خاصیت ختم ہو جاتی ہے اسے وہ اس گروہ سے خارج بھی کر دیتے ہیں۔ تاریخی طور پر ہندوؤں کو ویشیوں سے شاید ہی کبھی چیلنج کا سامنا رہا ہے اس لئے کہ یہ ہمیشہ ان کے حلیف اور آلہ کار رہے ہیں عموماً اخلاقی طور پر کمزور افراد ہی اس خواص کے مالک ہوتے ہیں لہٰذا دونوں کی طمانیت کا سامان ہندتو کے نظم میں ممکن ہوتا ہے۔

ہندو نسل کو چیلنج دینے والی داخلی محکوم قوموں اور مقابل خارجی قوموں سے تعامل کو تطبیق سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ہندو، محکوم داخلی قوموں میں جب مخالفت اور مزاحمت کا مزاج یا میلان پاتا ہے اور ان قوموں سے ہندتو کے لئے خطرات بڑھ جاتے ہیں تب وہ انہیں نیچے کے طبقے میں دھکیل دیتا ہے۔ دوسری طرف مقابل خارجی قوموں سے تصادم کے لئے تمام داخلی غیر ہندو محکوم قوموں کا استعمال کرنے اور انہیں اپنے مفادات کے لئے قربانی کا بکرا بنانے اور ان کے ذریعے بالواسطہ جنگ (Proxy War) کرانے کے لئے بھی اسی تطبیق کا استعمال ہوتا ہے۔ تیسری طرف مقابل خارجی قوم اگر تصادم کے بعد مغلوب ہوگئی اور اس مغلوبیت کے باوجود اس سے خطرہ باقی ہو تو اسے بھی تطبیق کے ذریعے ہی کنٹرول کیا جاتا ہے۔

تطبیق کا نمایاں پہلو ہے کسی گروہ کو بے انتہا ذلیل کر کے مقام انسانیت سے گرا کر قابل نفرت بنا دینا اور اس سے غیر انسانی سلوک کر کے اس کی عزت نفس کو مفلوج کر دینا۔ چنانچہ وشنو پران میں ہے کہ کئی چھتری قوموں کو ساگر نے ذلیل کر کے اور انہیں ملیکش (Mlechcha) قرار دے کر شودر بنا دیا۔ تمام مقابل قومیں تو اسی عمل کے ذریعہ ملیکش قرار دی جاتی ہیں اور ان کے خلاف ملک میں عظیم محاذ قائم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مغلوب قوموں کو شودر بنایا جاتا ہے۔ ابتدا ہی میں اس کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح غیر آریہ قبائل مغلوب ہو کر شودر قرار پائے۔ اس وقت جہاں ایک طرف کل کے شودروں میں

سے حلیف شودروں کو ترقی دے کر ویشیہ اور چھتری بنایا جا رہا ہے وہیں بعض مخالف مگر بظاہر مغلوب قوموں کو شودروں کے درجے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ معاصر ہندوستان میں مسلمانوں کی یہی نئی درجہ بندی کی گئی ہے۔ لہٰذا اس وقت دنیا کے مسلمانوں کے تعلق سے ہندتو کے دو خانے ہیں:

❶ بیرون ملک کے مسلمان اور ملک کے اندر غیر مغلوب نفسیات رکھنے والے مسلمان ملیکش ہیں۔

❷ ملک کے اندر پائے جانے والے مسلمانوں کے ایسے گروہ جو علمی، نفسیاتی، ثقافتی اور تہذیبی تغلب کو تسلیم کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کو شودر قرار دیا گیا ہے۔ ان کی باضابطہ فہرست موجودہ شودروں کی فہرست میں شامل کی گئی ہے۔ لہٰذا مرکزی طور پر اور ہر صوبے میں الگ الگ ایسی (SC، ST اور BC) قوموں کی فہرست سازی اسی دھرم شاستر کا حصہ ہے۔

⑤ **تحسین و توقیر کی میکانکیت:** اصل دین ربانی سے اس قوم نے نسلی بنیادوں پر انحراف اور ارتداد کیا۔ اور اس فساد کے لانے والے یہاں کے رشی یا ان کی اولاد تھے جو اصلاً اور نسلاً برہمن تھے۔ اس دوران جب بھی انہیں حق کی طرف بلایا گیا تو انہوں نے نبیوں کی تکذیب کی۔ تکذیب معروف طریقوں میں جھٹلانا، دربدر کرنا اور قتل کر دینا رہی ہے۔ یہ سارے طریقے یہاں بھی اس قوم نے اپنائے۔ لیکن اس نے ان تمام معاملات کو ایسے غیر معمولی طریقے سے منظم کیا کہ اس کے دامن کا یہ سیاہ داغ کم از کم دنیا کی تاریخ میں چھپ گیا۔ اس کے لئے ایک عجیب و غریب میکانکیت کا استعمال ہوا۔ اس میکانکیت کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ کا ذکر تحسین و توقیر کی میکانکیت کے نام سے کیا جاتا ہے۔

جب بھی کوئی مظہرِ حق آیا تو اسے عملاً جھٹلایا گیا لیکن چند دنوں کے بعد اس کے اچھے اعمال کو جنہیں وہ جھٹلا نہیں سکتے تھے اور جن کی یاد ہندتو کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھی۔ انفرادی حیثیت سے محدود کر کے اور اسے تنقید کے بجائے توقیر کے دائرے میں داخل کر کے اس کے نام اور پیغام کا استحصال کیا گیا۔ رفتہ رفتہ ان حق پرستوں کے اصل پیروکار یا تو تشدد کے طریقے سے ختم کر دیئے گئے یا انہیں کچھ تسکین کا سامان دے کر داخل دفتر کر لیا گیا۔ اس عمل کو ہندتو کا کسی مظہر خیر کو نارائن قرار دینا کہتے ہیں۔ البیرونی نے اسی میکانکیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

**وعلی مثله امر الهند، فانهم یرون الشریعة و منها صادرة عن رشین، الحکماء قواعد الدین، دون الرسول الذی هو نارائن، المتصور عند مجیئه و صور الانس ولن یجی الا لحسم مادة شر یطل علی العالم او لتلا فی واقع ولاعوض فی شئی من امر السنن. وانما تعمل بها کما تجدها. فلا جل هذا وقع الاستغناء عن الرسل عندهم فی باب الشرع والعبادة (فی تحقیق ما للهند صفحه 81)**

**ترجمہ:** ''اس طرح جہاں تک ہندوستان کا معاملہ ہے، تو وہ لوگ شریعت اور سنن کا رشیوں سے صدور مانتے ہیں۔ یہی رشی دین کے بنیادوں کے جاننے والے ہیں ان رسولوں کے برخلاف جو نارائن کہلاتے ہیں جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ انسانی صورت میں آتے ہیں اور ان کا آنا صرف دنیا میں پھیلے ہوئے شر کے خاتمہ کے لئے ہوتا ہے یا واقعہ کی تلافی کے لئے یا دین میں کسی شئ کی تبدیلی کے لئے۔ اور اہلِ ہند ان معاملوں سے اسی طرح نبٹتے ہیں جیسا وہ ضروری پاتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں شریعت اور عبادت کے باب میں رسولوں سے بے اعتنائی پائی جاتی ہے۔''

نارائن قرار دینے کا عمل اس خیر کو تسلیم کرنا اور اس کے مطابق زندگی گزارنا نہیں بلکہ اسے بے اثر کر کے اس کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ اسی ذیل میں وہ عمل بھی قرار دیا جا سکتا ہے، جب ہندتو اپنے لئے کئے گئے خدمت کے صلے میں کسی کو مرتفع قرار دیتا ہے۔ جو براہمن ہوتے ہیں وہ تو برہم رشی کے مقام پر فائز کئے جاتے ہیں مثلاً کشیپ، وشسٹھ، انگی راس، اتری، بھری گو اور جو چھتری ہوتے ہیں وہ راج رشی کے مقام بلند پر فائز کئے جاتے ہیں، مثلاً وشوامتر، اکش واکو وغیرہ۔

⑥ **تنظیم و انضمام کی میکانکیت:** ہندتو کی یہ ایک عجیب وغریب میکانکیت ہے۔ اس کے تحت ہندتو اپنے شدید مخالفین کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے یا اس کو ضم کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ انضمام کا یہ سارا عمل بظاہر تحسین وتعریف معلوم ہو۔ اس میکانکیت کی دو صورتیں ہیں:

❶ پہلی صورت یہ ہے کہ ہندتو اپنے مخالف چیلنج دینے والی قوت کے اندر سے کسی فرد کو آلہ کار بنانے کے لئے اسے تحسین وتعریف کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیتا ہے حتیٰ کہ اسے اپنے دیوتاؤں کا اوتار قرار دیتا ہے اور پھر ہندتو کے مقاصد کے حصول کے لئے اس کا استعمال کرتا ہے۔ اس صورت

کی دو ذیلی صورتیں ہیں:

(الف) پہلی صورت میں دشمنوں کے ایک فرد کو تحسین و تعریف کے ذریعہ آلہ کار بنا کر اور اسے اوتار قرار دے کر اس کی قوم کے خاتمے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور خود اس فرد کے ذریعہ اس کی اپنی قوم کو نہایت بربریت سے ختم کروایا جاتا ہے۔ اس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ پہلا فائدہ یہ کہ ہندتو کو اپنی طاقت کم صرف کرنا پڑتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ مخالف قوم خود آپس میں منقسم ہو جاتی ہے اور قومی بنیادوں پر متحدہ قوت کا استعمال کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

اس کی بہترین مثال پرشورام کی ہے جس کے ذریعے پہلے اس کی اپنی چھتری ماں کینو کو قتل کروایا گیا پھر اسے وشنو کا چھٹا اوتار قرار دے کر اسے کارتہ ویریہ کے چھتری راجہ ہے ہیا س کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا پھر اس کے بعد اس کے تحت باضابطہ عظیم لشکر تیار کر کے پوری چھتری قوم کا قتل عام کروایا گیا۔

ایمرجنسی میں بربریت کے اقدامات کرنے سے قبل (اور بطورِ خاص مسلمانوں کی جبری نسبندی کے اقدامات سے قبل) فخر الدین علی احمد کو صدر بنانا، سکھ مسئلے کو حل کرنے، بھنڈران والا کا قلع قمع کرنے، حتیٰ کہ گولڈن ٹمپل پر دھاوا بولنے کے دوران گیانی ذیل سنگھ کو صدر اور سردار بوٹا سنگھ کو وزیر داخلہ مقرر کرنا، 1990ء میں کشمیر کے سلسلے میں نئے اقدامات کرنے سے قبل مفتی محمد سعید کو وزیر داخلہ اور متحدہ کمانڈ کے لئے لیفٹننٹ جنرل ذکی کا انتخاب کرنا، محض اتفاق نہیں۔ اس سے قبل تقسیم ملک کے مرحلے میں مولانا آزاد کو کانگریس کا صدر بنانے کی کوشش کرنا بھی محض اتفاق نہیں تھا۔

(ب) دوسری صورت کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب:

① ہندو قوم کو عوامی تحریک (Mass Mobilisation) کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

② ہندو قوم کو اپنے اردگرد مغلوب قوموں سے رقیبانہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

③ جب ہندو قوم یہ سمجھتی ہے کہ اس کی براہِ راست قیادت انہیں مشکوک بنا سکتی ہے تو ایسی صورت میں وہ ذیلی مغلوب قوموں کو آلہ کار بناتی ہے، اس کی تعریف و توصیف کر کے اسے بلند مقام پر فائز کرتی ہے حتیٰ کہ ان میں بعض کو اوتار کے مقامِ بلند پر فائز کر دیتی ہے اور اس طریقے سے مذکورہ کام اس سے لیتی ہے۔ یہ طریقہ ہندتو کے کامیاب طریقوں میں سے ایک ہے۔

چنانچہ 550 قبل مسیح میں ہندوستان میں ہندتو کو پوری طرح اُکھاڑ پھینکا گیا۔ ہندتو کے مخالفین کی حکومت مگدھ میں 600 قبل مسیح میں قائم ہوئی اور یکے بعد دیگرے ہندتو کے مخالفین کی حکومت رہی۔ ان ہندتو کے مخالفین کی سب سے عظیم الشان حکومت نند خاندان کی قائم ہوئی۔ پرانوں میں اس خاندان کو سर्वक्षत्रान्तक: یعنی پوری چھتری قوم کا خاتمہ کرنے والا کہا گیا۔ یہ خاندان ہندتو کے مطابق شودروں کا خاندان تھا۔ لہٰذا ہندتو نے شودروں کے اس عہد کا خاتمہ کرنا چاہا۔ ہندتو کے مظالم سے ہزاروں سالوں سے کچلی جانے والی قوموں نے نہ صرف یہ کہ ہندتو کی حکومت کا خاتمہ کر کے خلاصی پالی تھی بلکہ اس کو مستحکم کرنے کے لئے انہیں مہاتما بدھ اور مہاویر کے افکار اور نظامِ حیات بھی مل گئے تھے لہٰذا اب وہ ویدک عہد اور مہاکاویہ عہد کے مقابلے میں زیادہ مضبوط پوزیشن میں تھے۔ لیکن ہندتو کے غیر معمولی دماغوں نے اس مضبوط قلعہ کو توڑنے کے آلہ جات تیار کر لیے۔ مگدھ سے دور تک شلا میں پوری سازش تیار کی گئی اور ایک شودر چندر گپت موری کو اس (Mass Mobilisation) مہم کے لئے استعمال کیا گیا۔ مدراراکشش (मुद्राराक्षस) میں چندر گپت کے لئے (वृषल) لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جس کا مفہوم ہے شودر کی اولاد۔ اسی میں اسے کلہین (कुलहीन) بھی کہا گیا ہے۔ چندر گپت کی آڑ میں کوٹلیہ نے ہندتو کا Counter Revolution لا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بودھ مذہب کی قوت مدافعت عود کر آئی اور چندر گپت کے پوتے اشوک نے پھر ہندتو کو شکست دے دی۔

عہدِ وسطیٰ میں مغل خاندان کے خلاف شواجی کو اُبھارنا اور پھر بعد میں شواجی کے خاندان کی آڑ میں پیشواؤں کی حکومت کا قیام اسی قبیل کی چیز ہے۔ شواجی اصلاً نچلی قوم کا ایک فرد تھا۔

ماضی قریب میں موہن داس کرم چند گاندھی اور بھیم راؤ امبیڈکر اس عمل کی اعلیٰ مثال ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ہندتو کی قوتوں نے انگریزوں سے مفادات کی بنیاد پر ربط تو قائم کر لیا اور پوری ایک صدی تک برہمن اپنی براہِ راست قیادت میں احیاء کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ رام موہن رائے (1772-1833)، دیوندر ناتھ ٹھاکر (پیدائش 1817)، سوامی دیانند سرسوتی (1824-1883)، راج نارائن بوس (پیدائش 1826)، بنکم چندر چٹوپادھیائے (پیدائش 1838)، بال گنگا دھر تلک (1856-1920)، بپن چندر پال (پیدائش 1858)، سوامی ویویکا نند (1863-1902))، اروند گھوش (1872-1950)، رام تیرتھ بنرجی، مدن موہن مالویہ (1861-1914)،

گوپال کرشن گوکھلے، کی کوشش قوم کو جگا تو سکتی ہیں لیکن عام بیداری پیدا نہیں کرسکتیں۔ انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ بیداری رقیب قوت سے محاذ آرائی کے لئے کافی نہیں اور براہمن مغلوب قوموں کو (Mobilise) نہیں کر سکتے لہٰذا ان کی آنکھیں کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے لگیں جو صدیوں سے چلا آتا اس عمل کی ذمہ داری قبول کر لے اور غیر برہمنوں میں سے ہو۔ چنانچہ ایک شخص پر ان کی نظر پڑی جو جنوبی افریقہ میں غیر معروف زندگی گزار رہا تھا لیکن اس میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جس کی انہیں تلاش تھی۔ یعنی:

① ہندو فلسفے سے آگاہ ہونا ② معاصر عہد سے آگاہ ہونا

③ غیر برہمن ہونا ④ آمادۂ کار ہونا۔

لہٰذا اسے بلایا گیا اور ایک ہی جست میں، اسے برصغیر جیسے ملک کی سب سے بڑی تنظیم کا مطلق العنان قائد بنا دیا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں قیادت سونپنے کی اس جیسی مثال جو 1914ء میں ہندوستان میں سامنے آئی دوسری نہیں ملے گی۔ پوری براہمن جمعیت اس فرد کے سائے میں آ گئی۔ چونکہ یہ ایک سوچا سمجھا عمل تھا اس لئے نہ ہی اس شخص کی ناتجربہ کاری کا سوال اُٹھایا گیا نہ اس سے کوئی رقیبانہ کشاکش ہوئی بلکہ تلک، مالویہ، گوکھلے، اروند، ٹیگور، سی آر داس، موتی لال نہرو جیسے اساطین تک نے اسے بطیب خاطر قبول کرلیا۔

جب گاندھی جی کو بھی ایک مرحلے میں محسوس ہوا کہ ان کی اپنی Mobilisation بھی ضروری حد تک کامیاب نہیں ہو رہی ہے تب اسی طریق کار کا استعمال کرتے ہوئے ایک مقوی (Booster) کا استعمال کیا گیا۔ اور اس دوسرے آلہ کار کے اوپر بھی تعریف و توصیف کے خزانے لٹا دیئے گئے۔ وہ آلہ کار تھا 'بھیم راؤ امبیڈکر'۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندتو کا فاصلہ جو انیسویں صدی سے آگے بڑھ رہا تھا کبھی بھی قوت نافذہ کا حصول نہیں کرسکتا اگر یہ دو شخصیتیں نہ ہوتیں۔

❷ تنظیم و انضمام کی میکانکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ جب مخالف و متصادم قوت باوجود کوشش کے ختم نہ ہو اور بظاہر اس کا خاتمہ کرنا ممکن نظر نہ آئے تو ہندتو ایک اور میکانکیت کا استعمال کرتا ہے۔ اس کے تحت اس دشمن فکر کے قائد کو ہندتو کے کسی دیوتا کا اوتار مان کر اسے ہندتو کا حصہ بنا لیا جاتا ہے، یا اس کی کوشش ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی طویل تاریخ ہے انہوں نے ہر زمانے میں کسی

ایسی صورت حال کے برپا ہونے کے بعد ایسا ہی کیا ہے۔

عام طور پر اس کے لئے وہ برہما، وشنو اور شیو میں سے وشنو کے اوتار کی حیثیت سے داخل کرتے ہیں۔ عموماً اس کے ذریعہ مخالف فکر کو اپنے اندر داخل کر کے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور اس میں بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے اہم اوتار درج ذیل ہیں:

① وشنو کا متسیہ/اوتار ② کرما/اوتار ③ وراہو/اوتار
④ نرسمہا/اوتار ⑤ وامن/اوتار ⑥ بھارگو/اوتار
⑦ رام چندر/اوتار ⑧ کرشن/اوتار ⑨ بدھ/اوتار

لیکن اوتار اتنے ہی نہیں بلکہ مہابھارت اور بھاگوت پران میں دیگر اوتاروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً بھاگوت پران ایسے 22 اوتاروں کا ذکر کرتا ہے۔

گذشتہ ایک سو سال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وشنو کا ایک اوتار (نعوذ باللہ) مان کر اسلام کو ہندتو کے اندر داخل کرنے کی متعدد کوششیں ہوئی ہیں۔

## نشأۃ جدید

اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ہندتو کا یہ عہد، عہدِ احیاء کا تیسرا دور ہے۔ ابھی ہندتو احیاء کے دوسرے دور میں ہی تھا کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد ہوئی۔ اسلام کی آمد کے بعد ہندتو کا مقابلہ ایک غیر معمولی قوت سے ہوا۔ خود ہندتو کی تاریخ میں کسی ایسے مقابلے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسلام کی غیر معمولی قوت نے ہندتو کے کس بل نکال دیئے اور اسلام نے اسے یہاں تک Marginalise کر دیا جہاں تک اسلامی قانون جو سرتا سر اعلیٰ اخلاق اور انسانیت پر مبنی ہے اجازت دیتا تھا۔ مسلمان خواہ کتنی ہی ہمہ گیر قوت کے مالک تھے اسلام نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ دائرہ اسلام میں نہ آنے والوں کو بزور مسلمان بنائیں، نہ ہی اس کی اجازت دی کہ جزیہ دینے کے بعد اور ذمی بن کر رہنے کی آمادگی کی صورت میں انہیں قتل کر دیں۔ لہٰذا اہلِ اسلام نے اتنا ہی کیا جتنا وہ کر سکتے تھے۔ اہلِ ہند کے دونوں بنیادی طبقات یعنی ہندوؤں اور مغلوب قوموں، چھتریوں ویشیوں اور شودروں کے اندر وہ جرأت رندانہ پیدا نہ ہوئی کہ وہ اس طویل حالت امن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس تاریخی ظلم کا خاتمہ کر دیتے۔ لیکن بدقسمتی سے اس دور میں بعض ایسی باتیں بھی

رونما ہوئیں جن سے ہندتو کے تن مردہ میں پھر جان پڑ گئی۔

1556ء سے بوجوہ اس قوت نے سنبھالا لینا شروع کیا۔ 1707ء میں اس میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ 1858ء میں اس نے مستحکم شکل اختیار کر لی۔ 1905ء میں اس نے واضح طور پر ہدف مقرر کر لیا۔ 1947ء سے احیاء کا تیسرا دور شروع ہو گیا۔

1858ء کے بعد اس فکر نے مستحکم شکل اختیار کر لی۔ عجیب وغریب بات ہے کہ ہندتو کی دو بڑی قوتیں جو ابتداءً ایک تھیں اور درمیان میں دور ہو گئیں تھیں پھر ہدف کے پاس ملتی نظر آتی ہیں۔ اسے عسکری اصطلاح میں Pincer Attack کہتے ہیں۔ جب ایک فوج دوطرفہ سے حلقہ بنا کر دشمن کو نرغے میں لے لیتی ہے۔

چنانچہ 1896ء کے کانگریس سیشن میں بنکم چندر چٹرجی نے ہدف کا پہلا اعلان کیا اور وہ تھا Vande Mataram۔ یہ آنند مٹھ کا ایک گیت ہے۔ لیکن ہندتو کی سب سے واضح اور بیّن آواز بکرمی سمبت 1959ء میں رویندر ناتھ ٹھاکر کی اُبھری۔ یہ آواز اتنی زوردار، اتنی مسحور کن اور ہندتو کے جادو سے ایسی بھری ہوئی ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا آسان نہیں۔

ذیل میں نہ صرف اس طویل اقتباس کو درج کیا جاتا ہے بلکہ اس کی اصطلاحی معنویت کو برقرار رکھنے کے لئے بجائے اردو ترجمہ کے ہندی ترجمہ دیا جاتا ہے:

हे अनन्त विश्व-संसार के परम एक परमात्मन, तुम मेरे सम्पूर्ण चित्त को ग्रहण करो। तुम समस्त जगत के साथ-साथ मुझे भी तो पूर्ण किये हुए स्तब्ध बने हुए विराज रहे हो, तुम ऐसा करो कि जिससे मैं तुम्हारी उस पूर्णता को अपने देह-मन में वाह्य-आभ्यन्तरम में, ज्ञान और भाव में प्रत्यक्ष अनुभव कर सकूँ। मैं अपने को सर्वतो भाव से तुम्हारे द्वारा आवृत रखकर, नीरव और निरभिमान होकर तुम्हारा कार्य करना चाहता हूँ। प्रतिक्षण तुम मुझे आदेश करते रहो, आहवान करते रहो, अपनी प्रसन्न दृष्टि से मुझे आनन्द देते रहो, अपनी दीक्षण बाहु से मुझे बल देते रहो। और जब मेरे दुर्दिन आयें, बन्धुगण साथ छोड दें, जगत के लोग मुझे लाँछित करें और अनुकूलता मेरे लिए दुर्लभ हो जाय, तब तुम मुझे परास्त और भुलुण्ठित न होने देना। तब मुझे सहस्त्रों के भय से भीत, सहस्त्रों के वाक्य से विचिलत, और सहस्त्रों के आकर्षण से विक्षप्त न होना पडे। एक तुम मेरे चित्त को एकासन में अधीश्वर विराजमान रहो, मेरे समस्त कर्म पर एकाकी तुम्ही अधिकार किये रहो, मेरे समस्त आभिमान को दमन करके, मेरी समस्त प्रवृत्तियों को अपने चरण में एकत्र और संयत कर रखो।

हे अक्षय पुरूष, पुरातन भारत वर्ष में तुममें से जब पुरातनी प्रज्ञा प्रसूत हुई थी, तब हमारे सरल हृदय पितृ पुरूषों ने ब्रह्म के अभय को, ब्रह्म के बल को, जान लिया था, वे एकके बल

से बली, एक के तेज से तेजस्वी और एक के गौरव से महीयान थे। पतित भारत के लिए पुनः हम उस प्रज्ञालोकित निर्मल निर्भय ज्योतिर्मय सुदिन की तुमसे प्रार्थना करते हैं। इस पृथ्वी पर और एक बार हमें तुम्हारे सिंहासन की ओर मस्तक उठकर खड़ा होने दो। हम केवल युद्ध विग्र यत्र तन्त्र वाणिज्य व्यवसाय द्वारा नहीं, हम सुकठिन सुनिमणं सन्तोष बलिष्ठ ब्रह्मचर्य के द्वारा महिमान्वित होना चाहते हैं हम राजस्व नहीं चाहते, प्रभुत्व नहीं चाहते, ऐश्वर्य नहीं चाहते, केवल प्रति दिन एक बार भूभुर्वः स्वर्लोक में तुम्हारी महासभा के महाप्राडण में खड़े होने का आधिकार चाहते हैं फिर हमारा कोई अपमान नहीं रहेगा, कोई अधीनता नहीं रहेगी, किसी प्रकार की दरिद्रता नहीं रहेगी, हमारी वेशभूषा दीन हो तो हुआ करे हमारी उपकरण सामग्री विरल हो तो हुआ करे उससे हम लेश मात्र लज्जा अनुभव न करें, किन्तु हमारे चित्त में भय न रहे, क्षुद्रतान रहे बन्धन न रहे, आत्मा की मर्यादा समस्त मर्यादाओं के उपर रहे और तुम्हारी दीप्ति से ब्रहमा परायण भारत वर्ष का मुकुट विहीन उत्तत ललाट ज्योतिष्मत हो उठे। हमारे चारों तरफ सभ्यता आभिमानी विज्ञान भदमत्त बाहुबल गर्वित स्वार्थ निष्ठुर जातियाँ जिन वस्तुओं को लेकर अहोरात्र अपने नख दन्त पैना रही हैं। परस्पर के प्रति सतर्क रूष्ट कटाक्ष कर रही हैं, पृथिवी को आतंक से कम्पित और मात्र शोणित पात से पाडिमल किये दे रही है उन सब काम्य वस्तुओं और परिस्फीत आत्माभिमान के द्वारा वे कभी अमर नहीं हो सकती। उनके यन्त्र तन्त्र, उनका विज्ञान, उनके पर्वत प्रमाण उपकरण उनकी रक्षा नहीं कर सकते। हे एकः उनकी उस बल मत्तता, धनमत्तता और उपकरण मत्तता के प्रति भारत वर्ष का कभी लोभ न हो।

हे अद्वितीय एक ऐसा करो कि तपस्विनी भारत भूमि अपना बल्कल-वसन पहने तुम्हारी ओर देखकर ब्रह्मवादिनी मैत्रेयीके उसी कण्ठ से कह सके

"येनाहं नामृता स्यां किमहं तने कुर्याम्"

जिसके द्वारा मैं अमृता नहीं होऊंगी उसे लेकर मै क्या करूंगी?

हे एकः तुम तोप-कमानों के धूम्रजाल और स्वर्ण धूलि से समाच्छन्न तमसावृत राष्ट्र गौरव की ओर भारत वर्ष की दृष्टि आकर्षित न करना हे विधान तुम अपने उस अनन्कार लोक के प्रति दीन भारत का नत मस्तक उठा दो।

यदाड त मस्तन्न दिवा न रार्तिन सन्न च सजिचव एव केवलः। जय तुम्हारा वह अनन्धकार आर्विभूत होता है तब कहाँ तो दिन कहाँ रात कहाँ सत कहाँ असत् तब शिव एवं केवलः, केवल शिव केवल मंगल है।

नमः शम्भवाय च भयोभवाय च,

नमः शकंराय च मयस्कराय च

नमः शिवाय च शिवतराय च

हे शकंर, हे भयोभव, तुम्हे नमस्कार है। हे शंकर, हे भयस्कर, तुम्हे नमस्कार है, हे शिव, हे शिवतर, तुम्हे नमस्कार है

बगंला-रचना वि. सं. 1958

1906ء میں کلکتہ کانگریس سیشن میں ایک فیصلہ لیا گیا۔ وہ فیصلہ تھا: ''سوراج کا حصول'' تب یہ ایک ذومعنی اور مبہم اصطلاح رہی ہوگی جس کا ظاہر انگریزی حکومت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ملک کو آزاد کرانا تھا لیکن جس کا باطن ہندتو کے لئے قوت نافذہ حاصل کرنا تھا۔

1930ء کے بعد اور بطور خاص 1935ء کے بعد ہندتو کی فکر نے Pincer Attack کی حکمت عملی اختیار کر لی۔ اس کا ایک بازو گاندھی جی کی سربراہی میں کام کرنے لگا اور دوسرا کیشو بلی رام ہڈگوار (1889-1940) کی سربراہی میں۔

ہندتو کا وہ دستہ جو گاندھی جی کی سربراہی میں کام کر رہا تھا بالواسطہ ہندوانے کے طریقے پر عمل پیرا تھا۔ اس Indirect Indianisation کا ظاہری ہدف بھارتیتہ (Composite Culture) کا قیام تھا اور اس کا ذریعہ سیکولرزم (Secularism) اختیار کیا گیا۔ اس طریقے میں ان تمام عوامل کی منضبط کارفرمائی ملتی ہے۔ جس کا ذکر ہندتو کی ترکیب و عمل اور میکانکیت کے ذیل میں گزر چکا ہے۔ چونکہ ملک کی باگ ڈور اسی دستے کے ہاتھوں میں آئی اور یہی دستور سازی سے لے کر اب تک حکومت پر حاوی رہا ہے اس لئے اس کا بالواسطہ ہندوانے کا عمل ہمہ گیر ہی نہیں بلکہ قوت نافذہ کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر گوشے میں یہ عمل مؤثر رہا۔

دوسرے دستے کا جو بلاواسطہ ہندوانے (Direct Hinduisation) کے طریقے پر عمل پیرا تھا کا ظاہری ہدف ہندو راشٹر کا قیام قرار دیا گیا۔

چونکہ اس طریقے میں معروف ہندتو کے تمام اعضاء واضح شکل میں اپنی قدیم روایت کے عین مطابق نظر آتے ہیں اس لئے اس کا ذکر لازمی ہے۔

اس فکر کی بنیادی اینٹ چیت (चित्) ہے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کا استعمال رویندر ناتھ ٹیگور نے بھی کیا ہے۔ دراصل یہ لفظ ہندتو کی قدیم اور ہمیشہ رہنے والی فکر ہے اس کو مہت (महत्) بھی کہا گیا۔

## چیت کا مفہوم

چیت وہ فکر ہے جس کے ذریعہ اعمال کے نتائج اور علم کے انواع، روح کے استعمال کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔

مہت کا مفہوم ہے عقل، جو پردھان کی پہلی پیداوار ہے۔ پردھان مادہ اولی کو کہتے ہیں جو وشنو

کی ایک شکل ہے۔ اس کو پرکرتی بھی کہتے ہیں۔ اس کے اندر علت اور معلول دونوں میں متشکل ہیں۔ مہت خواص کے مظاہر کی پیداوار ہے۔ چونکہ دین دیال اپادھیائے نے میک ڈوگل (Mc Dougal) کی دی گئی تعریف کو قبول کیا ہے اس لئے اسے معتبر سمجھ کر اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

میک ڈوگل نے کہا: ''چت کسی گروہ کے اندرون میں موجود فطرت ہے''۔

اپادھیائے جی اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Chiti is fundamental and is Central to the Nation from its very beginning. Chiti determines the direction in which the nation is to advance culturally. Whatever is in accordance with chiti is icluded is culture."

(Integral Humanism, Manthan July-Sept. 1941)

ترجمہ: ''چت اصل ہے اور بالکل ابتداء سے قوم کے لئے مرکزی ہے۔ چت ہی اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ قوم کس سمت ثقافتی طور پر پیش قدمی کرے۔ جو کچھ چت کے مطابق ہوتا ہے وہی ثقافت میں داخل کیا جاتا ہے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

"The laws that help menifest and maintain Chiti of a Nation are termed Dharma of that Nation, hence it is his Dharma that is Superme. Dharma is the repository of the Nations's soul, if Dharma is Destroyed, the nation perishes. Anyone who abandons Dharma, betrays the Nation." (Ibid)

**ترجمہ:** ''وہ قوانین جو قوم کے چت کے جلوہ گر ہونے اور برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں اس قوم کا دھرم کہلاتے ہیں۔ اس لئے یہی وہ دھرم ہے جو اعلیٰ ہے۔ دھرم قوم کی روح کا قالب ہے۔ اگر دھرم برباد کر دیا گیا تو قوم مرجاتی ہے۔ جو دھرم کو ترک کر دیتا ہے قوم کے ساتھ دغا کرتا ہے۔ یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ دھرم مذہب ہے۔''

دھرم کی خوبی بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

न राजयम न राजासीत, न दण्डयो न च दण्डिकाः।
धर्मनैव प्रजा सर्वाः, रक्षिन्तस्मा परस्परम्॥

**ترجمہ:** ''نہ کوئی ریاست ہے نہ بادشاہ، نہ سزا ہے اور نہ مجرم، ہر شہری کی ایک دوسرے کے ذریعہ دھرم کے فضل سے حفاظت کی جاتی ہے''۔

دراصل دیگر مذاہب کے افراد کو اس دھرم سے غلط فہمی اس وقت ہوتی ہے جب وہ ان باتوں کو ہندو دھرم گرنتھوں میں پاتے ہیں جنہیں میں نے حق کا مابقیہ کہا ہے۔ مثلاً

رگ وید نے کہا: सत्येनोत्तंभिता भूमि

**ترجمہ**: ''زمین سچ سے تھمی ہوئی ہے۔''

اتھر وید نے کہا: पृथिवी धर्मणा घृताम्

**ترجمہ**: ''یہ زمین دھرم کے سہارے ٹکی ہوئی ہے''۔

شت پتھ براہمن میں ہے:

योह्वैधर्मः, सत्यं वैतत्। तत सत्यं वदन्तं प्राहुः धर्मं वदतीति।

**ترجمہ**: ''بلاشبہ جو دھرم ہے وہی ستیہ ہے اور جو ستیہ ہے وہی دھرم ہے۔''

لیکن اس قوم نے حق کا استحصال کیا اور ان تمام کے معانی بدل دئے۔ اب دھرم کا مطلب ہے:

प्रभावार्थाय भूतानां धर्मं प्रवचनं स्मृतम

यत्स्यात् प्रभवसंयुक्त स धर्मं इति प्रकीर्त्तितः

**ترجمہ**: ''دھرم لوگوں کی ترقی اور بہتری کے لئے ہوتا ہے لہٰذا جس سے ترقی اور بہتری ہو رہی ہو وہی دھرم ہے''۔

چنانچہ اب اس کے دو مطلب ہوئے۔

① پہلا مطلب یہ ہے کہ ہندتو کے سماج میں ہر فرد اور طبقے کا، جس کو اس ہندتو نے اپنے مفاد میں ترتیب دیا ہے الگ الگ دھرم ہوا۔ چنانچہ راجہ کا دھرم الگ، برہمن کا دھرم الگ، ویشیہ کا دھرم الگ، شودر کا دھرم الگ، گرو کا دھرم الگ، ششیہ کا دھرم الگ، عورت کا دھرم الگ۔ چنانچہ یجر وید میں لکھا ہے:

ब्राह्मणोऽस्य मुखमासीद् बाहू राजन्यः कृतः।

ऊरू तदस्य यद्वैश्यः पदभ्यो शूद्रोऽअजायत।। 31:11

**ترجمہ**: ''اے براہمن! تم اس خدا کی تخلیق میں منھ کے مانند ہو۔ راجہ بازو کے مانند ہے، ویشیہ اس کی جانگھ اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔''

لہٰذا ہر ایک کا دھرم ہے اور اسے وہی کرنا چاہئے اگر راجہ براہمنوں کی عزت اور اس کی حفاظت

نہیں کرتا، اگر ویشیہ ان سب کے لے دھن کا حصول نہیں کرتا اور شودر ان سب کی خدمت نہیں کرتا تو وہ بغاوت کرتا ہے۔

② اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ کسی وقت خاص میں جو ہندتو کے لئے ضروری اور مفید مطلب ہو وہی اس وقت اس کا دھرم ہے۔

ہندتو کا نصب العین کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

کہا گیا: न तु आर्यस्य दशाभवा:

**ترجمہ:** ''آریہ کبھی غلام نہیں ہوگا''۔

❶ رگ وید میں ہے:

मइइन्द्रेणा सख्यं वियोषत् अस्मभ्यस्य दक्षिणा दुहीत।
उपज्येष्टे वरूये गमस्तौ प्राय प्राय विंजिगीवांस: स्याम॥

**ترجمہ:** ''اے خدا! آپ سے ہماری دوستی کبھی نہ ٹوٹے۔ اس خدا کی رحمت ہم پر ہمیشہ رہے۔ ہم ہمیشہ سب سے اعلیٰ اور دکھوں سے بچانے والے خدا کے بازوؤں کے اندر رہیں اور ہر جنگ میں فتح حاصل کریں۔''

❷ رگ وید میں ہے:

एकोबहुनामसि मन्यो वीलित: विशं विशं युघये संशिशाधि।
अकृत्तरूकत्वया युजावयम् द्युमन्तं घोंष विजयाय कृणमहे॥ 10:84:4

**ترجمہ:** ''منیو! دشمنوں کو پیس دینے والی میری قوت! تو اکیلا ہی تمام مخالفوں کو کچل دیتا ہے۔ اس لئے اے غیر مختتم روشنی والے! ہم تیرے ساتھ مل کر بلند آواز سے جے کار کرتے ہیں اور دیگر قوموں کو بتاتے ہیں'' کہ

इन्द्रेणा मन्युनावयं अभिष्याम पृतन्यत:।

**ترجمہ:** ''ہم اندر خدا کی مدد اور قوت سے مل کر تمام دشمنوں کو فتح کر لیتے ہیں''۔

اتھر وید میں ہے:

अतिद्यावतातिसरा इन्द्रस्यवचसाहत।
अविवृक इवमयनीत सवोजीवमृमाभोचि प्राणस्यापि नहयत॥ 5:8:4

**ترجمہ:** ''اے بہادرو! دوڑو، بھاگو، بڑھو، اپنے بادشاہ کے حکم سے دشمن کا خاتمہ کر دو۔ جیسے

بھیڑیا بھیڑ کو پیس ڈالتا ہے تم دشمن کو پیس ڈالو، وہ مہلک دشمن تم سے زندہ بچ کر نہ جائے۔ اس کی جانوں کو اپنے ملک میں کاٹ لو"۔

येरथिनो ये अरथाः, असादा, येच सादिनः।
सर्वानदन्तु तान् हतान् गृधाः श्येनः पतत्रिणः॥ 5:8:10

**ترجمہ**: "جو رتھ والے ہیں یا بغیر رتھ کے ہیں، جو گھوڑ سوار ہیں یا پیدل، ان سب دشمنوں کو مارو، اوران کے گوشت کو گدھوں کے کھانے کے لئے چھوڑ دو"۔

यंग्राम भाविशते इदमुग्रंसहोमय।
पिशाचास्तस्मान्नश्यन्ति न पाप मुपजायते॥ 4:36:8

**ترجمہ** : "اے آریہ! تو اعلان کر دے کہ جہاں جہاں بھی میری قوت قاہرہ موجود ہے کوئی آریوں کا دشمن پشاچ وہاں سرکشی نہیں کرسکتا"

ہندتو اپنی اصل میں ایک دو منزلہ (Two Tier) سماج کا تصور کرتا ہے جو دراصل غالب اور مغلوب کی پہلی تنظیم ہے اور خالصتاً ہندو مفاد میں ہے۔ یجر وید کہتا ہے:

यत्र ब्रह्मच क्षत्रंच सम्यं चौ चरतः सह।
लोकं पुरायं प्रक्षेषं यत्रदेवाः सहग्निना॥ 20:25

**ترجمہ** : "جہاں برہمن اور چھتری باہم ہوں اس ملک کو میں پوترف مانتا ہوں، جہاں اہلِ علم آگ کے ساتھ رہتے ہیں۔"

لیکن اصل حقیقت اس صورت میں بھی دوسری ہی ہوتی ہے۔ رگ وید کہتا ہے:

ब्राह्मण एव यतिर्राज यो न वैश्यः।
तत् सूर्यः ब्रुवन्नेति पयभ्योमानवेभ्यः॥ 17:9

**ترجمہ** : "یہ چمکتا ہوا سورج انسانی سماج کو پیغام دیتا ہوا کہتا ہے دراصل زمین کا مالک برہمن ہوتا ہے۔ راجہ یعنی چھتری یا ویشیہ نہیں ہوتا"۔

سام وید میں ہے: ब्राह्मणो स्वमृत हितम्।

**ترجمہ**: "براہمن اپنے آپ میں امرت ہوتا ہے یا امرت سے بھرا ہوتا ہے۔"

یجر وید میں ہے: अमृतं मोक्ष प्राप्त् ज्ञानम्

**ترجمہ**: "اس کا علم موکش دلانے والا ہوتا ہے"۔

اتھر وید سب کا حاصل یوں ظاہر کرتا ہے:

इदंमे ज्योति स्मत हिदरायं पक्वंक्षेत्रत् कामदुधाम एषा।
इदं धन निदधे ब्राह्मणेषु कृत्रिम पन्थां पितृवुयः स्वगर्य॥ 11:1:28

**ترجمہ:** ''میں اس چمکیلے اور تکلیفوں سے نجات دینے والے سونے کو، کھیت میں پکے اناج، اپنی کامدھینو گائیوں کو، اور اپنے دھن کو براہمنوں کے حوالے کرتا ہوں، اس سے میں اپنے لئے پالکوں میں سکھ کا دھام بناتا ہوں''۔

ہندو دھرم کی اس تحقیق کے بعد یہ بات آسان ہو جاتی ہے کہ اپادھیائے جی کے دھرم اور چت کو سمجھا جائے۔ اس وقت کی جن سنگھ نے 23 تا 25 جنوری 1965ء کو جس دھرم کا فیصلہ اپنے وجے واڑہ اجلاس میں کیا وہ وہی دھرم تھا جسے 22 تا 25/اپریل 1965ء کو اپادھیائے جی نے بمبئی میں اپنے چار خطبات میں پیش کیا اور اب وہ پورا Intergral Humanism جو گرو گولوالکر، دین دیال اپادھیائے اور ڈی بی ٹھینگڑی کے نظریات پر مشتمل ہے دراصل اسی قدیم ہندتو کی تطبیقِ جدید ہے۔



# ہندو مذہب کیا ہے؟

بیورلے نکلسن انگلستان کا ایک بہت مشہور اور مقتدر صحافی اور کالم نگار تھا۔ وہ اپنے ادارے ''الائیڈ نیوز پیپرز'' کے نامہ نگار کی حیثیت سے 1943ء میں ہندوستان آیا، لیکن ایک طویل اور خطرناک علالت کی وجہ سے ہندوستان میں قیام اتنا طویل ہو گیا کہ اسے نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ اپنی صداقت پسندی، بے لاگ سیاسی تجزیے اور جچے تلے تبصروں کی وجہ سے ہندوستان میں بھی مشہور ہوا۔ اس کی کتاب ''فیصلۂ ہند'' (Verdict of India) شائع ہوئی تو ہندو پریس کی جانب سے اس قدر ہنگامہ برپا ہوا کہ ضبطیِ کتاب کا مطالبہ ہونے لگا۔ مصنف نے اپنی کتاب کے مواد کے لیے ہزاروں میل کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر پیدل، بیل گاڑی، ہوائی جہاز اور کبھی کبھی اسٹریچر پر بھی ہوا۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں اس نے ہندو پریس کے عائد کردہ الزامات کی تردید میں اپنی پوزیشن اس طرح صاف کی:

''یہ برطانوی پروپیگنڈا نہیں، نہ اس میں سرکاری نقطۂ نظر کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس کا محرک انڈیا آفس بھی نہیں ہے۔ اس امر پر زور دینے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ جس دن سے میں نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، یہاں کے قوم پرست (ہندو) اخبارات نے میری انتہائی لاعلمی اور حیرت کے باوجود مجھ سے ایسا سلوک کیا ہے جیسے میں برطانوی شہنشاہیت کا نمائندہ ہوں یا بھیس بدلے ہوئے ایک قاصد ہوں جو تمام اقسام کے پوشیدہ ملکی ہتھیاروں سے مسلح ہو''۔

(مرتب)

---

## ہندو مذہب کے اصول

بیورلے نکلسن کے مطابق: ''ہندوستان کی ہر ساکن و متحرک چیز کے پس پردہ ہندو مذہب کی روح کارفرما ہے۔ ہندو مذہب ایک عقیدہ ہے، جس پر آپ کو اپنے قلب اور روح کے ساتھ یقین رکھنا چاہیے۔ قدیم ہندوستان میں چھوت چھات کا احساس بہت زیادہ تھا۔ اگر اونچی ذات والا کسی

نچلی ذات یا کسی دوسرے مذہب والے سے چھو بھی جاتا تو وہ ناپاک ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے اور مل جل کر رہنے سے تو گویا دھرم ہی خطرے میں آ جاتا تھا۔ ذات پات کا یہ امتیاز ہندو دھرم کی خصوصیت ہے۔ اگر یہ خصوصیت نہ ہوتی تو ہندو دھرم زیادہ محکم اور مضبوط مذاہب میں اپنی انفرادیت قائم نہ رکھ پاتا۔"

بیورلے نکلسن نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ "ہندومت میں چار ورن ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے برہمن ۔ یہ خاندانی مقدس اشخاص ہوتے ہیں، البتہ ان کے ساتھ کوئی کلیسا نہیں ہوتا۔ طوفانی اور ذہین پنڈت نہرو ایک برہمن ہیں اور عقل کی بات یہی ہے کہ ان کے برہمن پن کو کبھی فراموش نہ کیجیے۔ ان کا ہارورڈ اور کیمبرج میں تعلیم پانا، ان کے وزن میں اتنا اضافہ نہیں کرتا جتنا کہ ان کا برہمن نژاد ہونا ان کے وزن کو بڑھاتا ہے۔ سی آر۔ راج گوپال اچاریہ سابق وزیر اعظم مدراس بھی برہمن ہیں۔ اسی طرح انتہا پسند ہندوؤں کے لیڈر پنڈت مالویہ اور کانگریس کے اکثر بڑے لیڈر برہمن ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں برہمنوں نے وہی کام کیا ہے جو برطانیہ میں قدیم ایٹونین نے کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ برہمنوں کے ساتھ منظم عمال نہیں جو ان کو نظم و ضبط میں رکھ سکیں۔ برہمن جہاں تک نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں، بڑی حد تک ان کی اپنی حاکمانہ شان ہی نظر آتی ہے، البتہ جب وہ پیچھے مڑ کر مسلمانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں ان کو اپنی یہ شان نظر نہیں آتی"۔

اچھوتوں کی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بیورلے نکلسن لکھتا ہے: "وہ ان کنوؤں سے پانی نہیں لے سکتے جن سے اونچی ذات والے لیتے ہیں۔ انہیں اپنے مخصوص کنوؤں پر ہی انحصار کرنا ہوتا ہے۔ ان کے بچے اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ باہر بیٹھنے پر مجبور ہیں، چاہے برسات یا کوئی اور موسم ہو۔ وہ کسی اشنان گھاٹ کے قریب نہیں پھٹک سکتے، کیونکہ وہ پیدائشی اور تسلیم شدہ نجس ہیں۔ مندروں کے دروازے ان پر بند ہیں جو ان پر چھوت چھات کی سب سے کاری ضرب ہے۔ اگر تم ایسے لوگوں سے جو اس قدر محرومیوں میں غرق ہوں، ان کا مذہب بھی چھین لو تو گویا تم نے ان سے آخری وجہ تسلی بھی چھین لی۔ یہ تسلیم کہ پچھلے چند سال میں چند روشن دماغ حکمرانوں اور رہنماؤں کی طرف سے ایک یا دو مہمیں بھی چلائی گئیں، جس کی وجہ سے کچھ مندروں کے دروازے کھول دیے گئے لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ جیسے ہی اچھوت مندر میں داخل ہوئے، کٹر مذہبی فوراً باہر چلے گئے اور مندر اچھوتوں کا مندر ہو کر رہ گیا، کیونکہ اونچی ذات والوں کے لیے وہ آلودہ اور غیر مقدس ہو

گیا تھا۔ اچھوتوں پر جو پابندیاں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حجام ان کی حجامت نہیں بنا سکتا اور دھوبی ان کے کپڑے نہیں دھو سکتا۔ ہاں ایک اچھوت یہ ضرور کر سکتا ہے کہ زمین دوز پاخانوں میں گھسے اور غلاظتوں کو اُٹھا کر لے جائے۔ ٹوکرے غلاظتوں سے ٹپکتے ہیں۔ ہندوؤں میں چار بڑی ذاتیں ہیں۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سب سے اونچے برہمن جن کے ذمہ قوم کی رہنمائی اور دھرم کرم کے کام ہوتے ہیں۔ دوسرے کشتری (چھتری) جن کا کام ملک کی حفاظت کرنا ہے، گویا یہ جنگجو طبقہ ہوتا ہے۔ تیسرے ویش، جو سماج میں کاروبار کرتے ہیں اور چوتھے نمبر پر شودر یعنی اچھوت، جنہیں سماج میں سب سے کمتر اور حقیر سمجھا جاتا اور سارے چھوٹے کام ان کو کرنے پڑتے تھے۔''

جب اس سلسلے میں بیورلے نکلسن سے گاندھی جی کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے اور سر کے جھٹکے کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ ''گاندھی جی بار بار اچھوت پن سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اپنے آشرم میں اچھوتوں کو جگہ دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک اچھوت بچہ گود بھی لیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ اچھوت پن کے باقی رہنے کے مقابلے میں وہ ہندو دھرم کا ختم ہو جانا پسند کرتے ہیں، لیکن اس قسم کے بار بار کئے ہوئے اعلانات حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اچھوت پن فی الحقیقت ہندو دھرم کا اسی طرح جز ہے، جیسے سامیت دشمنی نازیوں کا جز لاینفک ہے۔ اچھوت پن کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ذات پات کا پورا نظام ہی ختم ہو جائے گا اور ذات پات ہی تو وہ مسالہ ہے جو ہندو دھرم کے ڈھانچے کو سنبھالے ہوئے ہے''۔ جب اس بارے میں ڈاکٹر امبیڈکر سے اُن کی رائے پوچھی گئی تو اُنہوں نے کہا: ''گاندھی جی ہم سے کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر بھروسہ رکھو۔ مگر حالات کے پیش نظر ہمارا جواب نفی میں ہے اگر ہم پر اعتماد نہیں کیا جائے گا تو ہم دوسروں پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں۔''

## تاریخی حقیقت

ہندو مذہب کیا ہے؟ اب بیورلے نکلسن اپنے سوال کو پھر دہراتا ہے اور اس کے تنگ و تاریک غاروں کے اندر جھانک کر بتاتا ہے: ''یہاں نہ کوئی کلیسا ہے نہ انجیل اور نہ کوئی پوپ۔ سب سے بڑھ کر یہاں کسی تاریخ کا نشان تک نہیں ملتا۔ صرف قدیم نوشتوں، گیتوں اور لوک کتھاؤں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جنہیں معتبر ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہندوؤں کی کوئی مرکزی کتاب نہیں ہے جسے

توثیق کے لئے فیصلہ کن معیار واستناد تسلیم کیا جا سکے۔ یہ آپ کی پسند پر ہے کہ جس پر چاہیں، ایمان لے آئیں اور جس کا چاہیں انکار کر دیں۔ غرض دنیا کے مذاہب میں ہندو مذہب ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ذات پات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بہت سے مورخ ایسے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا انکار کر سکتے ہیں، لیکن شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا، جس نے آپ کے تاریخی وجود سے سرے ہی سے انکار کیا ہو۔"

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک پر تو تاریخی شہادتوں کا ایک طویل اور مستحکم سلسلہ موجود ہے۔ اس سے کم سہی، لیکن مہاتما بدھ کے وجود پر بھی تاریخ موجود ہے۔ رہا ہندو دھرم، تو یہ اگرچہ تمام تر تخیلات و تمثیلات کے بتوں سے بھرا پڑا ہے لیکن اس بت کدے میں بھی رام اور کرشن موجود ہیں جنہوں نے بشر کی حیثیت سے تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دیئے ہیں۔"

قدیم ہندوستان کی مذہبی روایات میں گنیش جی بھی ہیں، جن کا سر ہاتھی کا اور سواری چوہے کی ہے۔ ایک طرف کرشن جی ہیں جو بانسری بجاتے ہیں اور محبت کی روایات کو زندہ رکھتے ہیں تو دوسری طرف فنا کے دیوتا شیو جی کا بھی دبدبہ ہے۔ پھر اندر اور ورونا بھی ہیں جو بارش اور پانی کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ ان ہندو دیوتاؤں کے معبود و مسجود ہونے کی حیثیت پر بحث کرنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ لیکن تاریخی اور واقعاتی پس منظر میں یہ سب ہندو مذہب کی شناخت آج بھی ہیں۔

ہندو مذہب کی اصل پہچان کے لیے ہیورلے نکلسن نے دو تمثیلات پیش کی ہیں، شاید اُن کے موازنے سے کوئی حل ممکن ہو سکے۔ وہ لکھتا ہے۔

"آیئے، ان دو مجسموں پر ایک غائر نظر ڈالیں۔ صلیب پر حضرت مسیح علیہ السلام کی تصویر عیسائیت کی علامت ہے۔ یہ ایک کامل انسان کی تصویر ہے، جس کے لئے اگر ہم اُن کی الوہیت کا عقیدہ نہ بھی رکھیں تو بھی انہوں نے دنیا کو ایک بہترین اور بلند ترین لائحہ عمل عطا کیا ہے"۔

## گنیش جی کا مجسمہ

"اب ہندو مت کی علامت ملاحظہ ہو یا یوں کہیئے کہ اُس کے بہت سے پوجے جانے والے دیوتاؤں میں سے ایک اہم دیوتا کا مجسمہ دیکھیے۔ یہ گنیش جی کا مجسمہ ہے۔ نصف ہاتھی اور نصف آدمی۔ آیئے ذرا گنیش جی کے قریب سے اُن کا دیدار کریں۔ گنیش مندر میں پہلی بار میرا داخلہ مجھ

سے کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔ یہ بنگلور کا واقعہ ہے۔ ہم ایک مقدس پہاڑی پر مغرب کے وقت پہنچ گئے۔ ہندوستان میں شفق کا منظر نہایت دلفریب ہوتا ہے۔ سورج کی آخری کرنیں ایک تھیٹر کا سا ڈرامائی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ یہ کرنیں محلاتی اینٹوں کی ایک چھوٹی سی عمارت پر پڑ رہی تھیں اور اس عمارت میں ایک چمکدار سیاہ پتھر سے تراشا ہوا ایک مجسمہ تھا۔ وہ گمنام بت تراش، جس نے صدیوں پہلے چٹان سے یہ بت تراشا ہوگا، وہ اپنے فن میں ماہر تھا۔ اُس نے گنیش جی کی تخلیق میں اپنی صلاحیتوں کو جگایا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں گنیش جی کے مجسمہ سے عجب پراسرار ماحول بنا ہوا تھا۔ گنیش جی کی پراسراریت کی وجہ سے ہی مہاراشٹر میں گنیش اتسو بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور یہ ہندو دھرم کے حوالے سے ہندوؤں میں ان کی مقبولیت کو ثابت کرتا ہے۔"

ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل شری سی راج گوپال اچاریہ اس فیل نما دیوتا کے بارے میں فرماتے ہیں: "اہل مغرب شاید گنیش جی کی مورتی میں کسی حسن و جمال کو نہ پائیں اور یہ کہہ دیں کہ یہ مورتی تو مضحکہ خیز ہے، یہ تو تماشے کا پتلا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے لئے گنیش جی وحدتِ کائنات کی ایک تصویر ہے، جس میں حسن اور بدصورتی کی یکجائی ناقابل تعین یکجائی ہے۔ ان کا جسم ایک موٹے آدمی کا ہے، سر ہاتھی کا اور سواری چوہے کی۔ وہ اچھے کھانوں کے بڑے شائق ہیں، لیکن وہ کمزور دماغ نہیں ہیں، جیسا کہ اہلِ مغرب یا کسی اور مذہب والے کا خیال ہو سکتا ہے۔ ہم ہندو ایک نادر اور عجوبہ قوم ہیں۔ ہمیں عجائباتِ عالم ہی کی حیثیت میں رہنے دیجئے۔ یہی میری التجا ہے"۔

## عورت کی حیثیت

عورت کی حیثیت و مرتبت پر، جو انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کی تکمیل کا ایک افضل ترین اور محترم جزوِ اعظم ہے، اسلام نے خاص توجہ کی اور اسے ذلت کی گہرائیوں سے نکال کر ایسے بلند و ممتاز مقام پر جگہ دی، جہاں سے وہ پہلی بار ایک ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی واجب التعظیم حیثیت میں دنیا سے روشناس ہوئی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت ماں کے قدموں میں ہے"۔ یہ اس لئے کہ عورت ہی اپنی تربیت سے آئندہ نسلوں کی سیرت تعمیر کرتی ہے۔ عورت ہی کی پیشانی پر انسانیت کی تقدیر کا خط کھنچا ہوا ہے اور اسی کی تقدیس، طہارت اور پاکیزگی سے اخلاق و

معاشرت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اسلام میں ازدواجی زندگی میں عورت کو مساوی حقوق عطا کئے گئے ہیں۔ نکاح کی بنیاد باہمی رضامندی اور معاہدے پر رکھی گئی ہے۔ نامساعد حالات میں عورت کو خاوند سے علیحدگی کا پورا حق دیا گیا ہے۔ عورت کا بہترین زیور عصمت وعفت ہے اور اسلام میں عورت کی عصمت وعفت کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے۔

ہندو مذہب میں بھی عورت کی بڑی اہمیت ہے۔ ماں کا درجہ بہت بڑا ہے۔ لیکن بیورلے نکلسن کا مشاہدہ کچھ اور ہی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ عورت کا استحصال ہر دور اور ہر زمانے میں کیا گیا ہے۔ عورت خاندان کی بنیاد ہے اور ہندو دھرم میں بھی اسے ''جننی'' کا درجہ حاصل ہے لیکن مردوں والے سماج میں وہ ہمیشہ دباؤ میں رہی۔ بیورلے نکلسن کا کہنا ہے: ''میں خود بنارس کے ہنومان مندر میں موجود تھا، جہاں لڑکیوں کی ایک قطار لگ جاتی تھی جو مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہوں گی۔ یہ مورتیوں کی برکت حاصل کرنے کے لئے لائی جاتی ہیں، تاکہ ان میں بلوغت کے آثار جلد پیدا ہوں۔ اُن کے چہرے بے وقت کے جنسی تعلقات کے باعث وحشت زدہ تھے اور ان کے بدن مارے شرم کے سمٹے جاتے تھے۔ میں نے ایسی ہی کم سن لڑکیاں کلکتہ کے کالی مندر میں بھی دیکھی ہیں جو اپنے سیاہ بالوں سے کچھ بال کتر کر ناگ پھن کی مقدس شاخوں میں لپیٹ دیتی تھیں اور اس اثناء میں برہمن پجاری اُن کے جلد حمل کے لئے منتر پڑھتے رہتے تھے۔''

قدیم ہندوستان میں دیوداسیوں کا بھی ایک طبقہ ہوتا تھا۔ پیدائش کے بعد لڑکیوں کو والدین مذہبی خدمت کے لیے مندروں کو دے دیتے تھے، جہاں وہ زندگی کی آخری سانس تک رہتی تھیں۔ بیورلے نکلسن اس بارے میں کہتا ہے: ''دیوداسیاں وہ ہیں جنہیں عہد طفلی ہی سے زائرین اور پجاریوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ آپ معروف مقامات کو چھوڑ کر ذرا غیر معروف مقامات پر جایئے جو جنوبی ہند کے قلب میں واقع ہیں، وہاں آپ ان داسیوں کو مندر کے اطراف، کہروں میں اور دروازوں کے قریب بیٹھی ہوئی پائیں گے۔ ان کے بال معطر اور ناخن رنگین کئے جاتے ہیں۔ زائرین ان کے پاس سے گزرتے ہیں... پاؤں گرد آلود، نگاہیں گرم، ہاتھ میں ریزگاری کی فرسودہ تھیلی اور چلتے چلتے اپنی پسند کی لڑکی کے سامنے ٹھہر جاتے ہیں۔ اکثر وہ محض کم سن لڑکی ہوتی ہے۔ اب وہ مسکراتی ہے۔ اُٹھ جاتی ہے۔ زائر تعاقب کرتا ہے۔ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ دیوتاؤں کی خوشی حاصل کی جاتی ہے۔''

بیورلے نکلسن کی یہ معلوماتی کتاب 1944ء میں چھپی تھی، جب جدوجہد آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ہندوؤں کے شاستروں میں جو حقائق درج ہیں، وہ انتہائی دل سوز اور غور طلب ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ستی کی رسم اور فحاشی کی شرمناک حرکتیں، جبریہ بیوگی اور حیا سوز واقعات دھرم کے نام پر سامنے آتے تھے تو مغل حکومت ان پر پابندیاں لگاتی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اس معاملے میں ذرا بھی نرمی اور رعایت روا نہ رکھی تھی۔ غالباً وہ اسی وجہ سے ہندوؤں کی نظر میں بدنام اور معتوب ہے جبکہ وہ ہندو دھرم میں بھی اصلاح چاہتا تھا۔ اس کے بعد جب انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں ان غیر انسانی امور کے متعلق قوانین بنانے چاہے تو ہندو مذہب اور دھرم کے نام پر اس کوشش کی شدید مخالفت کی گئی۔ ہندو دھرم، انسانیت کا دھرم مانا جاتا ہے۔ کوئی چاہے ایک بھگوان کو مانے یا کئی کو، ہندو رہ سکتا ہے، بس اسے اپنے رسوم و رواج کی پیروی کرنی ہوگی۔

پاکستان میں متعینہ ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش نے 13 نومبر 1948ء کو تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ہال میں ''ہندومت: ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے'' تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے، جس پر سماج کی بنیاد رکھی جا سکے، وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت میں انسانی زندگی کے لئے ہر موقع اور ہر مقام کے لحاظ سے اصول وضع کئے جاتے ہیں جو جو ایک دوسرے سے متضاد بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً وہ سماج کے ایک طبقے (برہمنوں) کو عدم تشدد کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقے (چھتریوں) کو قتل و خونریزی سکھاتا ہے یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو، لیکن تجارت پیشہ (ویش) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہو سکتا ہے، اس لئے وہ انہیں واضح الفاظ میں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ ایک برہمن کو سنیاس (ترکِ دنیا) کی اجازت ہے، لیکن وہی برہمن جب گرہست آشرم (گھریلو زندگی) بسر کر رہا ہو تو سنیاسی نہیں بن سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ اگر ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تلقین کرتا ہے تو دوسرے قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہندومت میں ہر مصلحت اور ہر موقع کے لئے الگ الگ اصول ہیں۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر صرف سچائی اور دیانت سے کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ کچھ ایسی تعلیم نہیں دیتا جو

ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بناء پر ہندومت ہزار ہا سال سے مختلف حالات اور متضاد ماحول میں زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔"

اب آخر میں ہندوستان کے ایک نامور اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر کے تاثرات بھی یہاں ریکارڈ ہو جائیں تو ہمارے اس موقف کو تقویت ملے گی کہ ہندوستان میں چھوٹی بڑی تمام اقلیتوں کے خلاف ظلم وشر کی ابتداکاری ہمیشہ اکثریت (ہندوؤں) کی جانب سے ہوئی اور اقلیتوں نے ہمیشہ اپنی مدافعت کی۔

## ڈاکٹر امبیڈکر کا المیہ

ڈاکٹر امبیڈکر ہندوستان کی جہد آزادی کے ایک رہنما تھے۔ اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف اور مسلم لیگ کے ہم نوا تھے۔ ایک اچھوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ لاء کالج بمبئی کے پرنسپل تھے۔ 1930ء اور 1931ء کی گول میز کانفرنسوں میں اچھوتوں کی نمائندگی کی۔ 1939ء میں جب قائداعظم نے مسلمانوں سے کانگریس کی وزارتوں سے چھٹکارا پانے پر "یوم نجات" منانے کی اپیل کی تو ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا کہ غیر کانگریسی ہندوؤں اور اچھوتوں کو بھی یوم نجات منانے میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ اکتوبر 1956ء میں ہندومت کو مسترد کر کے بدھ مت اختیار کر لیا۔ دو ماہ بعد دسمبر میں انتقال ہو گیا۔ 1997ء میں شیو سینا نے بال ٹھاکرے کی رہنمائی میں اس عظیم رہنما کے مجسمے کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈال دیا جس پر ہندوستان بھر کے اچھوتوں نے مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے ہندومت کے بارے میں سخت بیانات دیئے ہیں۔ ایک بیان ملاحظہ ہو:

"آج بھی اچھوت پن، انسان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کا تاریخ میں سب سے زیادہ بدترین نمونہ ہندومت معاشرت میں پورے استحکام کے ساتھ موجود ہے۔ تقریباً ہر وہ کوشش جو اسے ختم کرنے کے لئے کی گئی، ناکام رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پچھلے برسوں میں اس میں دس فی صد کمی ہو گئی ہے تو یہ اندازہ بھی مبالغہ آمیز ہوگا۔ انگلستان اور امریکہ میں سب لوگ گاندھی جی کے پروپیگنڈے سے دھوکا کھا کر یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ مرض اب کم ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس طریقے کی ناپسندیدگی کا مہاتمائی اعلان تحسین کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہوگا۔ انہوں نے وہ تصویر بھی دیکھی

ہوگی، جس میں گاندھی جی ایک اچھوت کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑے ہیں، اور انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ گاندھی جی نے اپنے اخبار میں جو ملک کے اعلیٰ اور با اختیار لوگوں کے حلقے میں جاتا ہے، اچھوتوں کو ''ہریجن'' (خدا کے بچے) کے لقب سے نوازا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ اس روشن زمانے میں اتنا زبردست نمونہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اچھوتوں کا گاندھی سے بڑھ کر ہندوستان میں کبھی کوئی 'دشمن' پیدا نہیں ہوا۔ گاندھی جی ہم سے کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اعتبار کرو۔ مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم لوگ تم پر اعتماد نہیں کر سکتے، کیونکہ تم لوگ ہمارے ازلی دشمن ہو''۔



# ہندو تاریخ میں نہیں تو، اپنے گریبان میں جھانکے

از: عابد فاروقی

اگر ہندوستان کے آج کے دانشور اپنی ہی تاریخ کو ایک نظر دیکھ لیں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری اور دوستی کا طریقہ نبھایا ہے یا دشمنی اور سازش کا۔ لیکن بھلا کیا وکیل اور بحث سے بھی کبھی مسائل کے حل نکلے ہیں۔ برہمنی ہندو دھرم نے ہمیشہ اور کھلم کھلا مسلمانوں کو ''یاون'' یعنی غیر ملکی، بدیشی، ملیچھ اور اچھوت سمجھا۔ کیونکہ ہندو سماج کی اپنی بنیادیں ذات پات میں ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کا ان رسومات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ہندو اور مسلم عموماً ایک ہی شہر یا قصبے میں الگ الگ محلوں میں ملتے تھے۔ آر سی. مجمدار لکھتا ہے: ''مسلم قوم کی اکثریت کو الگ تھلگ رکھنا ضروری تھا کیونکہ ہندوؤں کے عادات داطوار اور سماجی قوانین کی رو سے مسلمان ناصاف، اپوتر یعنی پلید اور ملیچھ تھے۔ ہندو ان کے ساتھ شادی بیاہ تو دور کی بات ہے کھانے پینے کا روادار بھی نہ تھا اور مسلمانوں کے چھو جانے سے یا ان کی غذا کی خوشبو تک ہندو کو ناپاک کر دیتی تھی''۔

یہ تو تھے اعلیٰ ترین ہندو برہمن طبقے کے خیالات جسے آر. سی. مجمدار نے کوزے میں دریا کی طرح بند کر کے دکھایا دیا۔ یہ ہندو سماج کا اجتماعی فیصلہ تھا جو آپ نے پڑھا اور اب ذرا مسلمانوں کا حال بھی سن لیجئے۔ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے دور میں (اسلامی نہیں) ہمیشہ مذہبی اور سماجی رواداری کی مستقل روایت ملی۔ محمود غزنوی جس کو بت شکن کہا گیا اُس نے اپنے دارالحکومت غزنی میں آباد ہندوؤں کو مورتی پوجا کی اجازت دی ہوئی تھی۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین نے ہندوؤں کو ریاست میں آباد کیا اور ان پر سے جزیہ موقوف کر دیا۔ محمد بن تغلق تو ہندو اور جینی جوگیوں سے اپنے پر تجسس سوالوں کے جواب پوچھا کرتے تھے۔ بلکہ اُن کے مراقبوں وغیرہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ بہلول لودھی نے کورکھیت کے تالاب سے مسلمانوں کو پانی لینے کی ممانعت کر دی کیونکہ وہاں سے ہندو پانی لیتے تھے۔ شیر شاہ سوری نے جو شاہراہیں تعمیر کروائیں اُن پر ہندوؤں کے لئے علیحدہ سرائیں اور کنوئیں کھدوائے حالانکہ اس عمل سے خود مسلمانوں کے لئے ہتک کا پہلو نکلتا تھا۔ ان سراؤں میں حکومت کے خرچے پر ہندوؤں کو پانی اور بھوجن مہیا کرنے کے لئے برہمن ملازم رکھے گئے تھے۔

اگرچہ شیر شاہ سوری میاں نواز شریف جتنا امیر نہیں تھا مگر اُس کے بتائے ہوئے ''موٹروے'' پر مسلمانوں کے لئے نہیں، ہندوؤں کے لئے بھی مفت بھوجن ملتا تھا۔ (مسلمانوں کے لئے بھوجن نہیں بلکہ ''کھابے'' دستیاب تھے)۔

مذہبی رواداری نے مغلوں کے عہد میں آسمانوں کو چھولیا۔ مشہور مؤرخ ٹیری لکھتا ہے: ''یہاں ہر شخص کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی ہے''۔

اور پیٹرو ڈیلا ویلے کے بقول عہدِ جہانگیری میں ہندو اور مسلمان نہایت اطمینان سے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور دونوں کو فوجی اور غیر فوجی ملازمتوں کے مواقع برابر ملتے تھے۔

ہندو مورخ راجندر پرشاد کا ارشاد ملاحظہ کریں: ''مسلمان فاتحین کا انداز مجموعی طور پر روادارانہ تھا اور کچھ مسلمانوں کے متعصبانہ رویے کے باوجود جس کا اظہار کبھی کبھی کچھ لوگوں نے کیا۔ اس کے سوا یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی دورِ حکومت ہی سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ برابر منصفانہ سلوک کرنے کی کوشش کی''۔

ہندوؤں کا ایک بہت بڑا اعتراض یہ بھی رہا ہے کہ مسلمانوں نے مندروں کو گرایا اور مساجد کی تعمیر کروائی اس ضمن میں بھی ہندوؤں کے وکیل راجندر پرشاد کی رائے تازہ ہوا کی مانند ہے۔ کہتے ہیں: ''اگر کوئی صاحب علم ہمت کر کے اُن تمام احکامات کی فہرست شائع کر دے جو مسلمان بادشاہوں نے مندروں اور متبرک مقامات کے لئے اوقاف اور وظائف کے سلسلے میں صادر کئے یا بخشے تھے اور اُس کے ساتھ اُن مندروں کی فہرست بھی شامل کر لے جو اُنہوں نے منہدم یا خراب کئے تو یہ ایک انتہائی مفید اور کارآمد خدمت ہوگی''۔

''ہندوؤں نے جب کبھی بغاوت کی یا کوئی ہندو حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اُس نے مسجدوں کی بے حرمتی اور ''ان کو منہدم کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ماہی پال نے جب لاہور فتح کیا تو اُس نے اس کو تاخت و تاراج کیا۔ تاریخ کے علاوہ صوفی تذکروں میں ملتا ہے کہ مسلمانوں کا قتل عام، مسجدوں کو گرانا اور ان کی جگہ مندروں کی تعمیر عام واقعات ہیں''۔

مسجدوں کے انہدام اور ہندوؤں کے مظالم کی شکایت مجدد الف ثانی ؒ نے بھی کی۔ اٹھارویں صدی میں سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کا معمول بن گیا تھا کہ جہاں مسلمان ملیں اُنہیں قتل کر دو۔ ہندو مذہب کے بہت بڑے ترجمان جادو ناتھ سرکار کے مطابق ''بدن سنگھ کی سرکردگی میں جاٹ اور ہندو

آگرے میں دندناتے پھرتے تھے اور مکانوں، باغوں اور مسجدوں کو صرف اس غرض سے تہس نہس کیا کرتے تھے کہ شاید کہیں کوئی تانبے کا دستہ، سنگ مرمر کا کوئی ٹکڑا، یا چاندی کا پترا ہاتھ آ جائے۔" اوپر جتنے بھی حوالے آئے ہیں یہ سب ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ہیں اور کوئی بھی شخص ان حوالوں سے اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ اور یہ تمام مورخین مقابلتاً بہت ثقہ اور مستند و معتبر ہیں۔

یہاں میں بحث کو سمیٹتے ہوئے دو حوالے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی پیش کروں گا:

البیرونی جس نے ہندو مذہب اور تنگ نظری کو معقول اور مفاہمانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی اور بہت مایوس ہوا، لکھتا ہے: "ہندومت کی عصبیت اور تشدد کا پورا رُخ اُن لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اُن کے اپنے نہیں ہوتے، غیر ملکی ہوتے ہیں۔ وہ اُنہیں ناپاک سمجھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ رشتے داری تو دور کی بات ہے، کسی قسم کا ربط وضبط مثلاً ساتھ اُٹھنا، بیٹھنا، خورد ونوش تک مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس طرح وہ خود اپوتر یعنی ناپاک ہوجاتے ہیں۔ انہیں کسی بھی غیر ہندو کے استقبال کی اجازت نہیں۔ گو وہ شخص اس بات کا خواہش مند ہو اور اُس کا رجحان بھی اُن کے مذہب کی طرف ہو۔"

ہندوؤں کے خیال میں کوئی قوم اُن کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔ وہ خود پسند، احمقانہ حد تک مغرور، خودغرض اور بے حس اور ٹھس لوگ ہیں۔ اور جو کچھ جانتے ہیں اُسے دوسروں کو بتانا فطرتاً انتہائی برا سمجھتے ہیں۔ اُن کا غرور اور خود بینی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اگر آپ کسی مسلمان عالم یا سائنس کے بارے میں بتائیں تو وہ آپ کو جھوٹا اور جاہل سمجھیں گے۔

البیرونی کے پانچ سو سال بعد ابوالفضل بھی اسی مشکل سے دوچار ہوتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ "برہمن اپنے مذہب اور علوم کے اسرار و رموز کبھی نہیں بتاتے"۔

ان وجوہات کی بنا پر ہندوؤں کا مذہبی اور معاشرتی انداز نظر تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ اور اس طرح ان کی اجتماعی ترقی اور مسلمان حکومت کے ساتھ وابستگی میں اندر ہی اندر حائل رہا اگرچہ مسلم دور میں انتظامیہ کی قریب قریب ساری ہی نچلی سطح کو ہندو ہی چلاتے رہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی علیحدگی پسندی مسلمانوں کے دوش بدوش چلنے کی عادت تو ہو گئی تھی لیکن ہندو دھرم کی رُوح اجتماعی سطح پر مسلمانوں سے برگشتہ ہی رہی۔ اور مسلمانوں کی صلح کل اور وسیع مشربی کا جواب ہمیشہ نفرت اور کراہت سے دیا گیا۔

□ □ □

# ہندتو کی علمبردار تحریک: آر.ایس.ایس

## تعارف و تجزیہ

6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد مرکزی حکومت (کانگریس) نے راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (R.S.S.)، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور اسلامک سیوک سنگھ (I.S.S.) کے ساتھ جماعت اسلامی ہند پر بھی پابندی عائد کر دی تھی۔ ملک بھر میں اس کے دفاتر پر تالے لگائے گئے۔ اور ان کے ممبران اور عہدیداران کو حراست میں لیا گیا۔ مرکزی حکومت کی اس پابندی سے آر.ایس.ایس اور اس کی انتہا پسند اور دہشت گرد ذیلی تنظیموں پر بظاہر کوئی اثر محسوس نہیں ہوا، حتیٰ کہ مدھیہ پردیش کے ہائی کورٹ نے آر.ایس. ایس سے پابندی ہٹا دی۔ خود مرکزی حکومت کا جماعت اسلامی ہند جیسی پر امن اور اصلاح پسند تنظیم پر پابند عائد کرنا بھی بد دیانتی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جماعت اسلامی ہند کا تعلق کسی بھی طرح کے فساد اور تشدد سے کبھی نہیں رہا۔ اس کے برعکس یہ تنظیم ملک میں ہمیشہ پر امن ماحول کو فروغ دینے کی خواہاں رہی ہے۔ جماعت اسلامی ہند پر پابندی سے سب سے بڑا نقصان ملت اسلامیہ ہند کا ہوا کیونکہ دہشت گردوں کے ذریعہ بابری مسجد شہید کرنے کے بعد جہاں اس المناک واقعے کے سبب عالمی سطح پر ملت کی آنکھیں اشک آلود تھیں، وہیں مسلمانِ ہند کو دوسرا جھٹکا جماعت اسلامی ہند پر پابندی کی شکل میں دیا گیا تا کہ مجموعی طور سے مسلمانانِ ہند ذہنی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے معذور ہو جائیں۔ (مرتب)

### بابری مسجد کی شہادت میں آر.ایس.ایس کا کردار

آر.ایس.ایس کے خاکی چڈی والے جو فرقہ وارانہ کبڈی کھیلتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تاہم 6 دسمبر 1992ء کو اس تنظیم کے سربراہان نے کہا تھا کہ مسجد گرانے میں ان کا ہاتھ نہیں۔ دوردرشن پر خود آر.ایس.ایس کے ورکروں اور کارسیوکوں کو روکتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ آر.ایس.ایس والے دراصل ان لوگوں کو اندر جانے سے روک رہے تھے جنہوں نے مسجد توڑنے کی ریہرسل نہیں کی تھی۔ جو کارسیوک اجودھیا میں یہ ریہرسل کر چکے تھے

انہیں آر.ایس.ایس والوں نے نہیں روکا یہ سب کچھ ایل.کے.اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، پرمود مہاجن (بی جے پی)، اشوک سنگھل (وشو ہندو پریشد)، مورنیشور ساوے (شیو سینا ایم پی) سادھوی رتھامبرا، سوامی دھرمیندر، مہنت اویدھ ناتھ، سوامی وامدیو وغیرہ کی موجودگی میں ہوا۔ آر.ایس.ایس.نے ان سب سے ساز باز کر رکھی تھی، اور وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے اپنی پولس کو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ کوئی ایکشن نہ لے۔

آر.ایس.ایس پر مرکزی سرکار نے تیسری بار پابندی لگائی تھی۔ پہلی بار اس پر 1948ء میں پابندی عائد کی گئی تھی۔ جب اس کے ایک ممبر ناتھورام گوڈسے نے مہاتما گاندھی کے سینے میں تین گولیاں اُتار دی تھیں۔ ان دنوں آر.ایس.ایس پاکستان سے ہندوستان آنے والے شرنارتھیوں اور ریفیوجیوں میں فرقہ پرستی کا زہر داخل کر رہی تھی۔ ایل.کے.اڈوانی اسی وقت کی پیداوار ہیں۔ وہ راجستھان میں آر.ایس.ایس کے سرچالک تھے۔ چند مہینوں میں تقریباً 20000 آر.ایس.ایس والوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اور اس پابندی کے خلاف 60000 خاکی چڈی والوں نے احتجاج کیا تھا۔ دوسری بار 1975ء میں مسز گاندھی نے اس ٹولے پر پابندی عائد کی تھی۔ اس وقت آر.ایس.ایس نے جے پرکاش نرائن کی تحریک ''سمپورن کرانتی'' کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ آر.ایس.ایس کے اس دعویٰ کو جھٹلانا مشکل ہے کہ اس طرح کی پابندی سے اس کی کارکردگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کم از کم پچھلے دو تجربات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر پابندی کے بعد آر.ایس.ایس کی قوت بڑھی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور ملک بھر میں اس کی ہزاروں شاخیں ہیں۔ دوئم یہ کہ حکومت صحیح معنوں میں آر.ایس.ایس کی بیخ کنی نہیں کر سکی۔ ایسا لگتا ہے کہ خود کانگریس میں بھی آر.ایس.ایس کی ذہنیت کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ دوسری سیاسی جماعتیں بھی اس سے پاک نہیں اور آر.ایس.ایس نے جو طاقت حاصل کی ہے اس کے لئے کانگریس آئی حکومت کی ناعاقبت اندیش پالیسی بھی ذمہ دار ہے۔ اب آیئے آر.ایس.ایس کی تحریک اور طریقِ کار پر نظر ڈالیں۔

## طریقۂ کار اور تنظیمی ڈھانچہ

راشٹریہ سویم سنگھ کی بنیاد ڈاکٹر ہیڈ گیوار نے 27 ستمبر 1925ء کو وجے دشمی کے دن ناگپور میں

ڈالی تھی۔ ناگپور کے علاقے شکرواڑی کے ایک چھوٹے سے گھر میں کیشو بلی رام ہیڈگواڑ کے ساتھ دس لوگ جمع تھے۔ آج اس تنظیم کے پاس ریشم باغ کے علاقے میں ایک تین منزلہ عمارت وجیہ دشمی ہے۔ آر.ایس.ایس کے کم وبیش 27 لاکھ سے زائد والنٹیرس ہیں۔ 25000 شاکھائیں اور 2500 سے زائد پرچارک ہیں۔

جون 1940ء میں ڈاکٹر ہیڈگوار پرلوک سدھارے تو آر.ایس.ایس کی گدی گولوالکر نے سنبھال لی۔ یہ 'گروجی' کے نام سے بھی مشہور ہوئے۔ 1973ء میں ان کے دیہانت کے بعد بالا صاحب دیورس کے ہاتھوں میں آر.ایس.ایس کی کمان سونپی گئی تھی۔ جب بالا صاحب دیورس صحت کی خرابی کے سبب سنگھ چالک کے منصب سے الگ ہوگئے تو مارچ 1994ء میں اس کے چوتھے سنگھ چالک پروفیسر راجندر سنگھ عرف رجّو بھیا مقرر کئے گئے۔ جب رجّو بھیّا بھی خرابی صحت سے پریشان رہنے لگے تو اپنی جگہ پر مارچ 2000ء میں کے.ایس.سدرشن کو آر.ایس.ایس کا پانچواں سرسنگھ چالک مقرر کیا۔ جن کے ہاتھ میں ابھی بھی آر.ایس.ایس کی کمان ہے۔ سدرشن جی نے ٹیلی کمیونی کیشن میں انجینئرنگ کی ڈگری لی ہے اور ہندوستان کی کئی زبانوں سے واقف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ بھی کیا ہے اور مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو یہاں کے Mainstream میں شامل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن سدرشن کی شہرت اس وقت زیادہ ہوئی جب انہوں نے چرچ کو ہندوستانی بنانے، مسلمانوں کے دین و مذہب کی اصلاح وتبدیلی اور اس کے ساتھ ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کے درمیان ایک Epic-war کی پیش گوئی کی۔ ہر وہ چیز جوان کی نظر میں غیر ملکی ہے وہ اس کو ہندو بنانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں سے ان کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی کتب کی نئی توضیح (Re-Interpret) کریں اور اپنے رہنماؤں کو بدل دیں۔

بابری مسجد کو شہید کرنے سے قبل آر.ایس.ایس کی تمام 25000 شاکھائیں فعال تھیں۔ ان کی ہندوستان بھر میں ہفتے میں دوبار دس ہزار سبھائیں ہوا کرتی تھیں۔ ملک کے تقریباً 15 لاکھ گاؤں میں ان کے دفاتر موجود ہیں۔ یہی نہیں اب تو غیر ملکوں میں بھی آر.ایس.ایس کے مراکز کھل چکے ہیں۔

شاکھاؤں کی ایک خاص بات ہے۔ یہ صرف احتجاج کرواتی ہیں جن کا کوئی ریکارڈ یا رجسٹر نہیں ہوتا۔ جہاں شاکھا میٹنگ بلاتی ہے اُسے 'سمپرک استھان' کہتے ہیں۔ شاکھا کے سویم سیوکوں کا لیڈر 'گنانا یک' کہلاتا ہے۔ اس کے اوپر 'شاکھشک' اور 'مکھیہ شکشک' دو بڑے عہدیداران ہوتے ہیں۔

چند شاکھاؤں کے سکریٹری بھی ہوتے ہیں جو 'کاریہ واہا' کہلاتے ہیں۔ سویم سیوک اپنی عمر کے مطابق چار گروپوں میں تقسیم کردئے جاتے ہیں۔

❶ پرودھا شاکھا (40 سال اور اس سے زیادہ عمر والے)

❷ ترن شاکھا (14 سے 40 سال تک) ❸ بال شاکھا (14 سے کم عمر)

شاکھاؤں کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

❶ پربھات شاکھا ❷ سیام شاکھا ❸ راتری شاکھا

جو ہفتہ وار شاکھا ہوتی ہے اسے 'سپتاہک شاکھا' کہتے ہیں۔ ہر شاکھا کی میٹنگ میں ممبران کے لئے سفید قمیص، خاکی چڈی، اور کالی ٹوپی پہننا لازمی ہے۔ صبح جو ڈرل کرائی جاتی ہے اس میں شرکاء کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہوتے ہیں۔ ہر صبح جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے۔ منتر پڑھے جاتے ہیں۔ ورزش کی جاتی ہے، جب الوطنی کے نغمے گائے جاتے ہیں اور پھر مباحثے ہوتے ہیں۔ تمام پرچارک خالصتاً رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ کوئی تنخواہ نہیں لیتا۔ پرچارک کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہو۔ خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ سرسنگھ چالک، ان سب کا لیڈر ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہ سکتا ہے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ زندگی کے دوسرے اہم شعبوں میں ان خاکی چڈی والوں نے ملک گیر سطح پر کیسے گھس پیٹھ کی ہے اور وہ کتنے کامیاب ہیں۔ آر.ایس.ایس کی کئی اور تنظیمیں ہیں جو مختلف قسم کے مکھوٹے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے ممبران اندر ہی اندر کام کرتے ہیں اور اپنے ممبران کی تعداد بڑھاتے ہیں۔

گذشتہ دس برسوں کے دوران بھارتیہ کسان سنگھ کے ممبران میں 50 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ بھارتیہ مزدور سنگھ کی ممبر شپ ایک لاکھ ساٹھ ہزار (160000) سے بڑھ کر ایک لاکھ ستر ہزار (170000) ہوئی ہے۔ یعنی اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔

اکھل بھارتیہ ودیارتھی سنگھ کے ممبران پانچ لاکھ سے بڑھ کر ساڑھے سات لاکھ ہو گئے ہیں۔ راشٹریہ سیوک سمیتی میں عورتوں کی تعداد پچاس ہزار سے ساٹھ ہزار تک جا پہنچی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اضافہ نوجوانوں کی تعداد میں ہوا ہے۔ دس سال پہلے "بھتایوا مورچہ" کے ممبران کی تعداد صرف

چالیس ہزار تھی۔ آج یہ تعداد ساڑھے تین لاکھ ہے۔ 1999ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت کے چھ ہزار ''ودیا بھارتی'' اسکولوں میں 12 لاکھ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جبکہ اساتذہ کی تعداد 40 ہزار تھی۔ 1997ء کی رپورٹ کے مطابق اس کے 13 ہزار تعلیمی اداروں میں 73 ہزار اساتذہ اور 17 لاکھ طلباء تھے۔ اس وقت سب سے زیادہ اسکول اتر پردیش میں اور اس کے بعد مدھیہ پردیش کا نمبر آتا ہے۔

ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آر.ایس.ایس کتنی طاقتور اور مؤثر ہے اور اسے ختم کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ شاید اسی لئے ناگپور میں آر.ایس.ایس کے سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس آر.ایس.ایس پر پابندی لگنے کے باوجود خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ ان کی تنظیم اُن کی ہدایتوں کے بغیر بھی کام کر سکتی ہے۔ اس وقت بالا صاحب دیورس نے وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی تعریف و توصیف کی تھی۔

آر.ایس.ایس کو سب سے زیادہ اعتماد اس کی سیاسی شاخ بھارتیہ جنتا پارٹی پر ہے۔ 1984ء میں لوک سبھا میں صرف 2 ممبر بی جے پی کے تھے۔ 1989ء میں 86 ہو گئے اور 1991ء میں 121 اور 1996 کے الیکشن میں ان کی تعداد 163 ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔



آر.ایس.ایس کی اہم ذیلی تنظیمیں:

# ایک نظر میں

گذشتہ تین دہائی میں آر.ایس.ایس کی مختلف شاخیں ملک اور بیرونِ ملک میں قائم ہو چکی ہیں۔ اس نے ملک کے تقریباً تمام ہی شعبوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا ہے۔ اس تنظیم کو ملک کی سب سے بڑی ہندو تنظیم ہونے پر فخر حاصل ہے اور اس کے 5000 ہمہ وقتی کارکنان دن رات تنظیمی کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اس کی ذیلی تنظیموں سے ملک میں آر.ایس.ایس کی قوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ واضح ہو کہ ذیل کی فہرست آر.ایس.ایس. کی شاخوں کی نہیں بلکہ ان کی تنظیموں کی ہے جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔ ان تنظیموں کا ڈھانچہ، طریقۂ کار اور شاخیں آر.ایس.ایس. سے الگ ہیں یہ تنظیمیں بلا واسطہ آر.ایس.ایس. کے مقاصد کو پورا کر رہی ہیں۔

آر.ایس.ایس کی ذیلی تنظیمیں:

1. اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد (ABVP): طلبہ تنظیم، اس کے سیکڑوں ہمہ وقتی کارکنان ہیں اور اس کی شاخیں ملک کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں میں قائم ہے۔
2. بھارتیہ مزدور سنگھ (B.M.S.): مزدور ونگ، ملک کی دوسری بڑی ٹریڈ یونین آرگنائزیشن ہے۔ جس کے ممبران کی تعداد تقریباً 20 لاکھ ہے۔
3. بھارتیہ کسان سنگھ (B.K.S.): کسانوں کی تنظیم ملک کی تمام ریاستوں میں شاخیں۔
4. بھارتیہ ونواسی کلیان آشرم (BVKA) : یہ تنظیم آدیواسیوں اور ونواسیوں کی ترقی کے لیے کام کرتی ہے۔ اس تنظیم نے شمال، مشرق میں ایک دوسری تنظیم "Indian Tribal Cultural Forum" کے نام سے بنائی ہے جس کے تحت 182 آدیباسی جماعتوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ BVKA ملک کی 175 ون واسی اضلاع میں سے 191 اضلاع اور 4155 ون واسی گاؤں میں فعال رول ادا کر رہا ہے۔ اس کے تحت 303 مراکز چلائے جا رہے ہیں جن میں 75 ون واسی طلباء کے ہوسٹل، 118 فری میڈیکل ہیلپ سنٹر، 102 اسکول اور 37 ووکیشنل سنٹرز قائم ہیں۔

5. وِدّیا بھارتی: اس کے تحت ملک میں 1800 اسکول اور دو درجن کالج چلائے جا رہے ہیں۔
6. دیویکا نند راک میموریل کمیٹی (VRMC): اس کے تحت آدی باسی اور مسلم علاقوں میں تعمیری پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔
7. دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (DRI): آر۔ایس۔ایس کا تحقیقی ادارہ، اس کے تحت گونڈا پروجیکٹ اور دیگر ترقیاتی مراکز، اتر پردیش، اڑیسہ اور مہاراشٹر میں قائم ہیں۔ یہ ادارہ دین دیال میڈیکل ایڈمشن (Medical Aid Mission) بھی چلاتا ہے۔
8. بھارتیہ ویچار کیندر (BVK): آر۔ایس۔ایس کا دوسرا تحقیقی ادارہ جو بالخصوص تریوندرم، کیرلہ میں فعّال ہے۔
9. سیوا بھارتی (S.B.): یہ تنظیم بالخصوص مسلم علاقوں میں کام کرتی ہے۔
10. وشو ہندو پریشد (VHP): اس تنظیم کا کام عالمی سطح پر ہندوؤں کو متحد کرنا ہے۔ اس کے تحت 300 سماجی خدمات کے مراکز چلائے جا رہے ہیں۔ اس تنظیم نے "اِکتما تا یاترا" منظم کرائی جس نے گنگا جل کے ساتھ 85,875 کلومیٹر کی یاترا مکمل کی۔
11. ویراٹ ہندو سمیلن (VHS): یہ ادارہ مختلف ہندو تنظیموں کو آرگنائز کرتا ہے۔
12. بھارتیہ شکشن منڈل (BSM): پورے ملک میں یہ ادارہ اساتذہ (Teachers) کو آرگنائز کرتا ہے۔
13. اتیہاس سنکلن یوجنا (ISY): یہ ادارہ قدیم ہندوستان کی تاریخ کو از سرِ نو تحریر کر رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کرتا ہے۔
14. سنسکار بھارتی (S.B.): ہندوستانی فنونِ لطیفہ پر مبنی تنظیم ہے۔ اس کا کام ہندوستانی ثقافت پر نمائش اور فلم وغیرہ آرگنائز کرنا ہے۔
15. بھارت وکاس پریشد (BVP): ہندوستانی چیمبر آف کامرس کا آر۔ایس۔ایس ایڈیشن۔
16. اوتار راشٹریہ سہیوگ پریشد (ARSP): بیرونِ ملک رہنے والے ہندوستانیوں کا ایک فورم۔
17. فرینڈز آف انڈین سوسائٹی (F.I.S.): یہ ادارہ U.K. اور U.S.A. میں مقیم ہندوستانیوں

کے درمیان کام کرتا ہے۔

ہر بڑی تحریک کا اپنا لٹریچر ہوتا ہے لیکن آر.ایس.ایس نے اس سلسلے میں کوئی پیش قدمی نہیں کی ہے تاہم اس کے تحت پورے ملک میں 22 طرح کے اخبارات اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ جو IENS کے ممبر بھی ہیں۔ RNI کی رپورٹ کے مطابق ملک میں آر.ایس.ایس واحد تنظیم ہے جس کے تحت شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل کے قارئین سب سے زیادہ ہیں۔ آر.ایس.ایس کے زیرِ انتظام بنگلور میں راشٹریہ ساہتیہ، راجستھان میں گیان گنگا پرکاش اور دہلی میں سروجنی ساہتیہ کے نام سے تین بڑے اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ تین روزنامہ سودیش اور دھرم یگ ہندی میں اور 'ترون بھارت' مراٹھی میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی سے ہندی میں 'پانچ جنیہ' اور انگریزی میں "Organiser" آر.ایس.ایس کے قومی سطح کے ترجمان ہفت روزہ اخبارات ہیں۔ اس کے علاوہ ملیالم میں ''جنم بھومی'' کنڑ میں ''وویک'' آسامی میں ''آلوک''، تیلگو میں ''جاگرتی'' اور تمل میں ''سادھنا'' کے نام سے اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔

(بشکریہ: Probe India Nov, 1985)

نوٹ: مذکورہ صورت حال چونکہ 1985ء کی رپورٹ کے مطابق ہے لہٰذا موجودہ صورت حال میں آر.ایس.ایس. کی قوت اور کام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ 15 سے 20 برسوں کے درمیان آر.ایس.ایس. نے بہت سے خفیہ منصوبے بھی بنائے ہیں۔ اس منصوبہ میں علمی اور ثقافتی امور پر بھی درجنوں تنظیمیں ملک وبیرونِ ملک میں سرگرمِ عمل ہیں۔

(مرتب)



# رام مندر تحریک اور آر.ایس.ایس

از: حارث بشیر

زیرِ نظر مضمون میں مضمون نگار نے آر.ایس.ایس. کی حکمت عملی اور کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور بابری مسجد کی شہادت میں اس کے گھناؤنے کردار کو ترتیب وار بیان کیا ہے۔ تاہم مضمون نگار کے بعض تاثر سے اختلاف کی گنجائش بھی برقرار رہتی ہے۔ (مرتب)

## ایشوز کی تلاش و تیاری

آر.ایس.ایس. کو ہندو ووٹ بنک کی تیاری کے لیے ہندوؤں کا ذہن بدلنا ضروری تھا۔ تاکہ ان کے اندر اپنی محرومی اور اپنے اوپر ہونے والے حقیقی یا خیالی حملے کا احساس اُبھرے، وہ 'دشمن' کے ظلم سے واقف ہوں، اس کی تلافی کے لیے مشترکہ طور پر عمل کریں، یہاں تک کہ وہ سیاسی طور پر متحد ہو کر بھی ہندو مفاد کے لیے کام کرتے نظر آئیں۔ ان سب کے لیے مناسب ایشوز کی ضرورت تھی، جو اس مہم میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ ایسے وقت میں میناکشی پورم میں ہریجنوں کے قبولِ اسلام کا واقعہ پیش آ گیا، جس نے مہمیز کا کام کیا اور ہندو قوم پرستوں کو متحد کر دیا۔

میناکشی پورم: 19رفروری 1981 میں جنوبی ہند (تامل ناڈو) کے ایک گاؤں میناکشی پورم میں ایک ہزار ہریجنوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ تمام لوگ اچھے پڑھے لکھے اور باروزگار تھے۔ ان کا ایک خاص مقصد درجہ بندی والی ذاتوں کے نظام (Hierarchy of Castes) سے نجات تھی۔ وہ مسلم سوسائٹی سے بھی متاثر تھے اور اس کو ہندو سماج سے بہتر سمجھتے تھے۔[1]

پریس کی طرف سے قبولِ اسلام میں پٹروڈالر اور بین الاقوامی سازش، کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔ وزارت داخلہ کی ایک خفیہ نوٹ میں اس علاقہ میں جماعت اسلامی ہند اور دوسرے احیائی گروپس کی سرگرمیوں کو موردِ الزام قرار دیا۔ ان تنظیموں کو پچھلے 2یا3 سالوں میں مسلم ممالک اور بین الاقوامی اسلامی اداروں سے ملنے والی امداد کا تذکرہ کیا گیا۔[2] ان رپورٹس میں جماعت اسلامی ہند کی قوت کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا تھا۔ تمل ناڈو میں یہ جماعت بہت کمزور تھی۔ 2002ء میں بھی اس کے ممبران کی تعداد سو سے کم تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کی، افرادی لحاظ سے، اس سے کئی گنا بہت

زیادہ بڑی تنظیم تبلیغی جماعت ہندوؤں میں کسی طرح کے کام کا کوئی پروگرام ہی نہیں رکھتی۔ بہرحال ان غیر ذمہ دارانہ رپورٹوں نے ہندوؤں کے ایک طبقے کے اندر بے انتہا بے چینی پیدا کر دی۔ مسلم خطرہ ان کو حقیقی نظر آنے لگا اور ہندو سماج کے نرغے میں ہونے کا احساس مضبوط ہوا۔

1980ء کے دہے میں اس طرح کے متعدد واقعات نے ان کے اس خدشے کو نہ صرف جگہ دی بلکہ بہت سے ہندوؤں میں غلط طور پر اپنے کمزور ہونے کا احساس ابھرنے لگا۔ 1983 میں پنجاب میں بھنڈران والے کی سکھ 'خالصہ تحریک' کروڑوں بنگلہ دیشیوں کی آمد کا ہوا وغیرہ۔ اس ماحول میں سنگھ پریوار نے 1986 میں پوپ کا ہندوستان کا سفر، شاہ بانو کیس میں سپریم کیس کورٹ کا فیصلہ اور اس کے غیر مناسب تبصروں کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی طرف سے چلائی جانے والی پر امن تحریک (جو بالآخر 1986ء میں حکومت کے ذریعہ قانون سازی پر ختم ہوئی)[3]، اکتوبر 1988ء میں سلمان رشدی کی کتاب Satanic Verses پر راجیو گاندھی حکومت کی پابندی وغیرہ کو اپنے مطلب کے لیے خوب اچھالا، اس کو مسلمانوں کی منھ بھرائی اور مسلم ووٹ بنک کی سیاست قرار دیا۔ کہا گیا کہ ہندوؤں کو بھی جاگنا چاہئے اور اپنی بے حسی و بے بسی کو ختم کر کے وطن اور سماج کا بھلا کرنا چاہئے۔ ہندوؤں کو منظم کرنے اور مبینہ خطرات سے بچانے اور مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے جس ایشو کو چنا گیا وہ انتہائی جذباتی اور ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینے والا تھا۔ ہماری مراد اس سے رام جنم بھومی، بابری مسجد یا ایودھیا تحریک سے ہے۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

ہندو سماج کو درپیش خطرات سے واقف کرانے کے لیے جگہ جگہ (پہلے جنوبی ہند پھر شمالی ہند) ہندو اتحاد (Solidarity) کانفرنس کا اور ہند کانفرنس کا انعقاد 1981ء تا 1983ء میں کیا گیا۔ جس میں سوامی، شنکر آچاریہ اور سادھوؤں نے نمایاں طور پر شرکت کی۔ اس دوران 1988ء میں کیرالا اور تمل ناڈو میں جہاں BJP بہت کمزور تھی ہندو ووٹ کو منظم کرنے کے لیے 'ہندوستانی' کے نام سے ایک ہندو فرنٹ قائم کیا گیا جس نے الیکشن میں بھی حصہ لیا۔

## بابری مسجد/رام جنم بھومی

شمالی ہند میں اتر پردیش کے شہر اجودھیا میں ایک قدیم مسجد بابری مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ جس کو 1528ء میں میر باقی نے بنایا تھا۔ مسجد سے ملحق قبرستان بھی تھا۔ 1850ء کے دہے سے مسجد

سے باہر ایک چبوترے پر ہندو پوجا کرتے تھے۔ اس مسجد میں برابر نماز ہوتی تھی کہ 22/23 دسمبر 1949ء کی درمیانی شب کو اس میں رام للا اور دوسری مورتیاں رکھ دی گئیں۔ واقعات کے تسلسل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عمل پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی مسجد سے باہر قبرستان میں واقع مسلم مقبروں اور قبروں کو توڑ دیا گیا تھا اور مسجد سے باہر رام چرتر مانس (رامائن) کا 9 دنوں کا مسلسل پاٹھ کیا گیا تھا۔ یہ پاٹھ کل ہند (اکھل بھارتیہ) رامائن مہا سبھا کے تحت انجام دیا گیا جس میں ہندو مہا سبھا کے لیڈر بھی شامل تھے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی واضح ہدایت اور 26 دسمبر کو وزیر اعلیٰ گووند دلبھ پنت کے حکم کے باوجود ضلع مجسٹریٹ کے۔کے۔ نائر نے مورتیاں وہاں سے ہٹانے سے انکار کر دیا۔ ان کی اہلیہ شکنتلا نائر نے اکھنڈ کیرتن (مسلسل کیرتن) کے ذریعہ وہاں سے مورتیاں ہٹانا بے انتہا مشکل بنا دیا۔ بعد میں شکنتلا نائر 1952ء میں گونڈا سے ہندو مہا سبھا کے ٹکٹ پر ایم۔ پی بنیں۔ 1967ء میں وہ جن سنگھ کے ٹکٹ پر ایم۔ پی بنیں۔ کے۔کے۔ نائر کو ان کے معاون گرودت سنگھ کے ساتھ عہدہ سے ہٹا دیا گیا۔ کچھ دن کے بعد وہ جن سنگھ کے ٹکٹ پر 1965ء میں ایم۔ایل۔اے بنے اور 1967ء میں جن سنگھ کے ہی ایم۔ پی منتخب ہوئے۔ ایک محقق Harold Gould 1966 کے اندازہ کے مطابق یہ دونوں آر۔ایس۔ایس کے ممبر تھے اور اس میں براہِ راست شامل تھے، لیکن تفصیلی منصوبہ ان کے ذہن میں نہیں تھا۔[4]

آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا دونوں نے اس معاملے کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ 25/دسمبر 1949ء کو آریہ سماج، فیض آباد نے اجتماعی طور پر ایک قرار داد پاس کی کہ تمام مذہبی اداروں کو جن کو توڑ کر مسجدوں میں بدل دیا گیا ہے، ہندوؤں کو واپس کرنا چاہئے۔[5] ہندو مہا سبھا کا کردار تو واضح تھا۔ مورتیاں رکھنے کے فوراً بعد پارٹی کے جنرل سکریٹری وی۔جی۔دیش پانڈے دو بار اجودھیا گئے اور مہا سبھا کے تمام کارکنوں کے نام سرکلر جاری کیا گیا کہ 27/مارچ 1950ء کو اس بار رام نومی (یومِ پیدائش رام چندر جی) کو 'یوم رام جنم بھومی' منایا جائے، اس کی پرارتھنا مندروں میں کی جائے۔ یہ قرار داد جگہ جگہ منظور کی جائے کہ یہ یادگار جہاں رام پیدا ہوئے تھے ہندوؤں کے پاس ہی رہے۔ اس دن کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔ 16/جنوری 1950ء کو ہندو سبھا اجودھیا کے سکریٹری گوپال سنگھ وشارد نے فیض آباد دیوانی عدالت میں ایک Suit فائل کیا جس کے ذریعہ اس کی اجازت چاہی کہ وہ وہاں بغیر کسی رکاوٹ اور گڑبڑی کے پوجا کر سکتے ہیں اور جا سکتے ہیں، اور

یہ کہ مورتیوں کو وہاں سے نہ ہٹایا جائے۔ چنانچہ ایک وقتی حکم کے ذریعہ سے کورٹ نے یہ دونوں باتیں مان لیں۔ یہ طے کیا گیا کہ صحن اور اندرونی گیٹ میں تالا لگا دیا جائے، جس کی چابی 'رسیور' کے پاس رہے۔ اجودھیا میونسپل بورڈ کے چیرمین کو اڈیشنل شہر مجسٹریٹ نے 29/دسمبر 1949ء، ریسور مقرر کیا۔ 'بھوگ' اور پوجا کے لیے بہرحال ایک سنتری اس کا تالا کھولتا تھا۔

1950ء میں سردار پٹیل کی موت کے بعد ہندو قوم پرستوں کے حوصلے کمزور ہوئے۔ اتر پردیش کے اہم ہندو قوم پرست لیڈر ٹنڈن بے اثر بنا دیے گئے۔ دوسری طرف پاکستان سے شرنارتھیوں کی آمد نے بھی آبادکاری کا بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اس مسئلہ کو بھول گئے۔

## 1980 کے دہے میں نئی شروعات

بابری مسجد رام جنم بھومی یا اجودھیا تحریک کی شروعات آر.ایس.ایس کی نئی سیاسی سوچ سے شروع ہوتی ہے۔

میناکشی پورم میں دلتوں کے قبول اسلام کے بعد ہندو قوم پرستوں میں ایسے ایشوز کی تلاش وجستجو شروع ہوگئی تھی جس کے ذریعہ وہ ہندوؤں کو متحد و منظم کر سکیں اور ہندو دھرم کے خطرے میں ہونے کا احساس دلا کر ایک مضبوط ہندو ووٹ بنک قائم کریں۔ اس میں سابق کانگریسیوں نے خاص کردار ادا کیا۔

میناکشی پورم میں تبدیلیٔ مذہب کے ردعمل میں ستمبر 1981ء میں جموں وکشمیر کے سابق مہاراجہ اور سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کرن سنگھ نے 'وراٹ ہندو سماج' قائم کیا۔ اس کے بڑے ذمہ دار سنگھ کے لوگ تھے۔ جیسے ہنس راج گپتا، او.پی.تیاگی (نائب صدور)، وی.ایچ.ڈالمیا (خزانچی)، اور اشوک سنگھل (جنرل سکریٹری)۔ اس سماج نے جگہ جگہ (دہلی، متھرا، پٹنہ وغیرہ) متعدد جلسے کیے، جس میں کانگریسی اور سنگھ دونوں شریک تھے۔ اس میں ہزار ہا افراد نے شرکت کی۔ چھوا چھات، باہری پیسے کی آمد اور یکساں سول کوڈ پر نعرے لگائے گئے۔

اتر پردیش کے ایک بزرگ کانگریسی لیڈر داؤ دیال کھنہ نے سب سے پہلے ویشو ہندو پریشد کو رام جنم بھومی مہم چلانے کی ترغیب دی۔ اس وقت سنگھ کو اس کو شروع کرنے میں تردد تھا[6]۔ کھنہ نے اندرا گاندھی کو بھی خط لکھ کر اجودھیا، بنارس اور متھرا کے مندروں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

کے.آر.ملکانی کے مطابق اجودھیا تحریک کو ایک عوامی تحریک بنانے پر غور وخوض 1983ء میں مظفرنگر (اتر پردیش) کی ایک میٹنگ میں کیا گیا تھا۔ جس میں سنگھ کے رہنما پروفیسر راجندر سنگھ سابق وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ اور داؤدیال کھنہ موجود تھے۔ نندہ نے اجودھیا کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے یہ کیا کہ ہر وہ چیز جو قومی وقار (National Honour)، قومی خوداعتمادی کے لئے ضروری ہو کرنا چاہئے۔[7]

گلزاری لال نندہ 1982ء میں پریشد میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں 1983ء شری رام جنم اتسو سمیتی بنائی تھی۔ رام نومی کے موقعے پر بشمول سنگھ ہندوؤں کی مختلف تنظیموں کو دعوت دی گئی۔ اگلے سال اسی طرح کی تقریب میں پریشد سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ رام کی جائے پیدائش ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے۔ اس تقریب میں کرن سنگھ، کھنہ اور سنگھل موجود تھے۔[8]

جیسا کہ پریشد کے تعارف میں عرض کیا جا چکا ہے، مرکزی سطح پر اس نے دو اجتماعی ادارے بنائے تھے۔ ایک مرکزی مارگ درشک منڈل (مارگ درشک کے معنی رہنمائی کرنے والا) دوسرا ادارہ 'دھرم سنسد' سنسد کا اجلاس غیر متعین وقفہ سے خاص مسائل پر غور وفکر کے لئے ہوتا ہے۔ اس طرح سادھو، سنت، آچاریوں سے پختہ رابطہ قائم کیا گیا۔ ان اداروں کی تشکیل میں کیتھولک عیسائی اور سکھوں کی مذہبی تنظیم کے اثرات معلوم ہوتے ہیں۔

## مہمات

(I) اکتمتا یاترا: (مفہوم اتحادی سفر) یہ یاترا یا سفر نومبر 1983ء میں کٹھمنڈو سے شروع ہو کر تامل ناڈو میں رامیشورتک، دوسری یاترا بنگال میں گنگا ساگر سے شروع ہو کر گجرات میں سومناتھ تک اور تیسری یاترا اتر پردیش میں ہری دوار سے شروع ہو کر تامل ناڈو میں کنیا کماری تک کی گئی۔ درمیان میں یہ یاترائیں ناگپور میں یکجا بھی ہوئیں۔ اس سفر میں مذہبی علامات کا استعمال کھل کر کیا گیا۔ منتظمین نے دو علامات کو خاص طور سے اس یاترا کو کامیاب بنانے کے لیے منتخب کیا۔ رتھ یا جلوس والی گاڑی پر ان ہندو علامات کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ ایک علامت تھی گنگا (ماتا) اور دوسری بھارت ماتا۔ بوتلوں میں گنگا اور دوسرے مقدس دریاؤں کا پانی فروخت کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھارت ماتا کی چھوٹی مورتیاں بھی خوب فروخت ہوئیں۔ یہ یاترائیں خلاف معمول ہندو عوام

میں بہت کامیاب رہیں۔

اس سے قبل ہندو قوم پرست گائے کا استعمال اجتماعی اور سیاسی مقاصد کے لیے کرتے تھے۔ سنگھ نے 1952ء اور 67-1966 میں گائے کے نام پر مہم چلائی تھی۔ ہندو دھرم میں دریائے گنگا کو مقدس مانا جاتا ہے جس میں غسل کرنا اور جس کا پانی پینا گناہوں کو دھو ڈالتا ہے۔ لیکن اس طرح اس کی مورت کو پوجنا غالباً ایک بالکل نیا واقعہ تھا۔ اسی طرح بھارت ماتا کی مورت بنا کر عوامی مہم چلانا بھی ایک نیا واقعہ تھا۔ سنگھ کا مقدس جغرافیہ یا مقدس سرزمین اور مادر وطن ایک نام بھارت ماتا کی شکل میں پوجا جا رہا تھا۔ پریشد نے ان کے لیے نئے مذہبی رسوم ایجاد کیے۔ اور انہیں ہندو اتحاد کی علامت بنا دیا۔

خیال ہے کہ سنگھ کے 50000 ممبران ان یاتراؤں کے انتظام و انصرام میں لگے تھے، جس کی وجہ سے پابندی وقت اور پلاننگ کے مطابق یہ انجام پذیر ہوئیں۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کی مدد بھی نہیں لی گئی۔[9] بلکہ اس میں تمام سیاسی پارٹیوں پر تنقیدیں کی گئیں۔ یہاں 'ہندو ووٹ' کی تعمیر ہو رہی تھی۔ جس کے ذریعہ کسی بھی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے، تاکہ وہ اکثریتی طبقہ کے مفاد یا سنگھ کے مفاد کو پورا کر سکیں۔

(II) ابھی تک اجودھیا میں رام مندر کی تحریک کو چلانے کی باقاعدہ منظوری نہیں دی گئی تھی۔ اپریل 1984ء میں پریشد کی پہلی دھرم سنسد نے متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کر کے اجودھیا میں رام جنم بھومی کی 'آزادی' کا مطالبہ کیا۔[10]

اس طرح سنگھ نے مسجد کو مندر میں بدلنے کا اپنا یہ ایجنڈہ باقاعدہ طور پر وشو ہندو پریشد کو سونپ دیا۔ اس کے بعد پریوار کی تمام پارٹیاں پریشد کے اس کام میں تعاون و مدد دیتی، جس کا باقاعدہ اعلان حسب موقعہ کیا جاتا۔

(III) 1984ء میں ہی پریشد نے بجرنگ دل کی بنیاد ڈالی۔ جس کے ذمہ دار ونئے کٹیار بنائے گئے، جو 74-1970ء میں اتر پردیش بی۔جے۔پی کے ریاستی سنگھ کے پرچارک بنے تھے۔ موصوف 2002ء میں اتر پردیش بی۔جے۔پی کے ریاستی صدر بنائے گئے۔ یہ پریشد کا لڑاکو دستہ تھا۔ وہ تمام نوجوان جو روزانہ کی شاکھا میں نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے ممبر بنائے گئے ان کا ٹریننگ کیمپ الگ لگایا جاتا۔

(IV) جولائی 1984ء میں مہنت اوید ناتھ کی سربراہی میں ایک الگ کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا نام 'شری رام جنم بھومی مکتی یگنا سمیتی' رکھا گیا۔ سمیتی کا کام 'رام جنم بھومی' کی مکتی یا آزادی ہی تھا۔

سمیتی یا کمیٹی نے ایک مہم بشکل جلوس سیتا مڑھی (بہار) سے 25 ستمبر کو شروع کی۔ سیتا مڑھی کو رام چندر کی اہلیہ سیتا کی جائے پیدائش مانا جاتا ہے۔ یہ جلوس اجودھیا پہنچ کر لکھنؤ ہوتا ہوا دسمبر 1984ء میں دہلی پہنچا۔ (جنوری 1985ء کے الیکشن سے کچھ پہلے) اس لمبے جلوس میں رام چندر جی اور سیتا کی بڑی بڑی مورتیاں شامل تھیں۔ جس کے نیچے بھارت ماتا کی جے لکھا تھا۔ کمیٹی کی اس تحریک میں بڑی تعداد میں سادھو شامل تھے۔ یہاں تقریروں میں بار بار کہا جاتا کہ آپ انہیں ووٹ دیں جو ہندوؤں کو ان کے مبینہ مقدس مقامات واپس دِلا سکیں۔ سیاسی مقاصد رکھنے والی اس مہم کے دوران ہی اکتوبر 1984ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کو گولی ماردی گئی۔ نتیجے میں مذکورہ کمیٹی کے سارے پروگرام چوپٹ ہو گئے۔ اور اس کا سیاسی فائدہ بھی نہ ہو سکا۔ اگلے الیکشن میں بی. جے. پی کو صرف 2 سیٹیں پارلیمنٹ میں حاصل ہوئیں۔ 1984ء اور 1985ء کے الیکشن میں کانگریس کی کامیابی نے پریشد کی مہم کو کچھ وقت کے لیے روک دیا۔ لیکن 1985ء کے اختتام تک یہ پھر شروع ہو گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت نے ان کے مطالبے کو مان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ 31 اکتوبر کو پریشد نے دوسری دھرم سنسد کا انعقاد کیا، جس میں پوجا کے لیے بابری مسجد کا تالا کھولنے کا مطالبہ کے ساتھ یاترا اور جلوس نکالنا طے پایا۔

(V) جنوری 1986ء میں اجودھیا کے ایک وکیل نے جو کہ 1950ء کے دیوانی مقدمہ کا فریق بھی نہیں تھا، منصف مجسٹریٹ کی عدالت میں بابری مسجد کے گیٹ کا تالا کھولنے کے لیے ایک اپیل دائر کی تاکہ وہاں پوجا اور درشن بغیر روک ٹوک ہو سکے۔ کورٹ نے رکارڈ کے موجود نہ ہونے کی بنیاد پر جو کہ ہائی کورٹ کے پاس تھا، اس درخواست کو سننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس وکیل نے ضلع و سیشن جج (فیض آباد) کے یہاں 31 جنوری 1986ء کو اپیل دائر کی، جس کو یکم فروری 1986ء کو جج نے مان لیا اور تالا کھولنے کا حکم جاری کر دیا۔ وہاں کے ڈی. ایم اور اتر پردیش کے کانگریسی وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ سے پریشد کی گفتگو دسمبر سے ہو رہی تھی۔ درخواست کنندہ کا اس مقدمہ میں پارٹی نہ ہونے، اور اس مقدمہ کا اونچی عدالت میں زیر غور ہونے کے باوجود ضلع جج کا اس درخواست کو فوری طور پر مان لینا، اس فیصلہ کے سیاسی رخ کو ظاہر کرتا ہے۔ فیصلے کے 40 منٹ کے اندر ضلع مجسٹریٹ

(ڈی.ایم) نے مسجد کے راستے کی طرف رکاوٹیں ہٹا دیں اور قومی ٹیلیویژن، دور درشن پر اس کی تصویریں دکھائی گئیں۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی کی کابینہ کے ایک اہم سابق وزیر ارون نہرو کے مطابق 1986ء کے آغاز میں ہی مسلم کارڈ کھیلنے کے لیے مسلم خواتین بل اور ہندو کارڈ کھیلنے کے لیے اجودھیا مسجد کا تالا کھولنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ [11] اس کے فوراً بعد 5رجنوری 1986ء کو بابری مسجد ایکشن کمیٹی (BMAC) بنائی گئی۔ جس میں سید شہاب الدین، امام بخاری اور دیگر مسلم لیڈر شامل تھے۔

آل انڈیا بابری مسجد کانفرنس 22رد سمبر 1986ء میں دہلی میں منعقد ہوئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ وشو ہندو پریشد اور وزارت داخلہ کے درمیان اس مسئلہ پر سنجیدہ گفتگو ہو۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر گفتگو ناکام ہوئی تو 26رجنوری 1987ء کو یوم جمہوریہ کی تقریبات کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ (جس کو بعد میں واپس لے لیا گیا) یکم فروری کو بند، 30رمارچ کو دہلی میں ستیہ گرہ اور پھر اجودھیا مارچ (کوچ) کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ دہلی کی ستیہ گرہ میں لاکھوں مسلمانوں نے شرکت کی۔ مارچ کرنے کی بات ٹلی۔ ایک سال بعد بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے 14راکتوبر 1988ء کو اجودھیا مارچ کا اعلان کیا۔ پریشد نے 11راکتوبر کو ہی شری رام مہا یگن شروع کر دیا۔ ملک کا ماحول بہت خراب ہو گیا۔ کئی جگہ (علی گڑھ، مظفر نگر، فیض آباد وغیرہ) میں فسادات شروع ہو گئے۔ چنانچہ وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے مارچ کو ملتوی کرنے کا دباؤ مسلم لیڈروں پر ڈالا اور اس کے بدلے میں یہ طے ہوا کہ اس پورے مسئلہ کو حکومت الٰہ آباد ہائی کورٹ میں لے جائے گی۔ لیکن اجودھیا کوچ نہ کرنا آپسی اختلافات کا باعث ہو گیا۔ کمیٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایکشن کمیٹی امام بخاری کے ساتھ رہی باقی افراد نے شہاب الدین کی کنوینر شپ میں بابری مسجد مومنٹ کو آرڈینیشن کمیٹی (BMCC) بنا لی۔

ہندو قوم پرستوں کو اس فیصلہ (کورٹ میں جانے) سے دھکا لگا۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا غصہ ان کے لیے مفید تھا۔ معاملہ پھر عدالت میں چلا گیا۔ جس سے سنگھ بچنا چاہتا تھا۔ بہر حال مسلمانوں کے عمومی احتجاج سے پریشد نے فائدہ ہی اُٹھایا اور ماحول کو گرم رکھا۔

پریشد نے الہ آباد میں تیسرے دھرم سنسد کا فروری 1989ء میں انعقاد کیا۔ جس میں دو اہم قرارداد پاس کی گئیں۔ ایک میں پبلک زندگی کو ہندوانے کا مطالبہ، الیکشن میں ہندوؤں کے حمایتی افراد کو منتخب کرنے کے اعلان سے کیا گیا۔ دوسرے میں اجودھیا میں بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا مطالبہ کیا گیا جس میں مندر کی تعمیر کے لیے اینٹوں کی پوجا اور شیلا نیاس (بنیاد رکھنا) طے کیا

گیا۔ رام مندر کا موڈل دکھایا گیا، جس کی تعمیر میں رقم اکٹھا کرنے کے لیے مہم چلانا طے پایا۔ اینٹیں جس میں رام کندہ تھا اس کی پوجا کا سلسلہ طے کیا گیا۔ یہ رام شیلا پوجن کہلایا۔ پریشد کے پاس نئے خیالات کی کمی نہیں تھی۔

اینٹوں کا یہ جلوس مختلف جگہوں سے نکل کر 9/نومبر 1989ء کو اجودھیا پہنچ کر مندر کی تعمیر شروع کرتا۔ پارلیمنٹ کے الیکشن ہونے ہی والے تھے۔ ہندو ووٹوں کو مضبوط کرنا ہی تھا۔

موقعہ اور ماحول دیکھ کر BJP نے جون 1989ء میں اپنی نیشنل کونسل کی میٹنگ منعقدہ پالم پور (ہماچل پردیش) میں کھل کر اور باقاعدہ اس مہم کی حمایت کا اعلان کیا اور مطالبہ کیا کہ رام جنم بھومی یعنی بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح بی. جے. پی باقاعدہ اور کھلے عام رام مندر کی حمایت میں سامنے آ گئی۔

## رام شلا پوجن

اینٹوں کو گاؤں گاؤں سے لانے کے لیے تفصیلی پروگرام بنایا گیا اور اس کی تیاری مئی 1989ء سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ سنگھ اور پریشد کا باہمی تعاون گہرا تھا۔

سنگھ کے منجھے ہوئے پرچارک گوروپنت پنگلے جو پریشد کے ایک ٹرسٹی بھی تھے۔ اور ناگپور میں دونوں تنظیموں کے بیچ لنگ کا کام کرتے تھے، انہوں نے مئی، جون اور جولائی میں پورے ملک کا دورہ کیا۔ پریشد کے 3820 کنوینر سے ملاقاتیں کیں۔ انہیں ہی تحصیل کی سطح تک رام شلا پوجن کا انعقاد پورے ملک میں کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ان اینٹوں کی اجودھیا منتقلی (Transportation) کا بڑا انتظام سنگھ کے ایک اہم لیڈر راجیہ.وی شیشادری کے ذمہ تھا جو یہ کام لکھنؤ سے انجام دے رہے تھے۔[12]

## فسادات

رام شلا پوجن کی مہم تصادم (Confrontation) اور لوگوں کو اپنی طرف لانے (Mobilization) دونوں کے لیے استعمال ہوئی۔[13] ان جلوسوں کے ساتھ ہندو قوم پرستوں کے دوسرے پروگراموں نے پورے ہندوستان میں ستمبر 1989ء سے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ماضی میں یہ فسادات زیادہ تر مقامی رہے تھے۔ لیکن پریشد کے جارحانہ جلوسوں، نعروں اور تقریروں نے اس کو پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا دیا۔ پہلے سے رکارڈ کئے ہوئے اشتعال انگیز کیسٹ

لاؤڈ اسپیکر پر سنائے جاتے۔ یہ بھجن اور جنگجویت دونوں کا ملن تھا۔ اس میں پریشد کے مرکزی مارگ درشک منڈل کی ممبر سادھوی رتھمبرا کی تقریریں مسلمانوں کے خلاف آگ اگلنے والی تھیں۔ ان گنت فسادات میں سب سے زیادہ بھیانک اور تباہی والا فساد بہار کے شہر بھاگلپور کا تھا، جو 24/اکتوبر 1989 کو رام شلا کے جلوس کے دوران ہوا۔ اس میں سرکاری ذرائع کے مطابق 1000 کے قریب افراد کی ہلاکت ہوئی۔ یہ فسادات راجستھان (کوٹا میں 14/ستمبر 1989ء کو سب سے پہلے) مدھیہ پردیش کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں شمالی ہند میں اتر پردیش، گجرات اور بہار میں ہوئے، جس میں سیکڑوں مسلمان مارے گئے اور کروڑوں روپئے کی املاک تباہ ہوئیں۔

## شلا نیاس

پورے ملک سے اینٹوں کو اجودھیا بظاہر اس لیے لایا جا رہا تھا کہ رام مندر کی تعمیر ہو سکے، ورنہ کم از کم اس کی بنیاد رکھ دی جائے۔ بنیاد کا رکھنا 'شلا نیاس' کہلایا۔ اس کی تاریخ پریشد نے پہلے ہی 9/ نومبر طے کر دی تھی۔ مرکز اور اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت نے پہلے ہی اس کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا گمان اس لیے ہوتا ہے کہ وزیر اعلیٰ نارائن دت تیواری کی حکومت نے اتر پردیش کے بعض علاقوں میں بعض کاموں کے لیے اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کا بل اسمبلی میں پیش کیا۔ جو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو صوبہ اتر پردیش میں 1947ء سے قبل سرکاری اور غیر سرکاری کاموں میں کثرت سے استعمال ہوتی تھی۔

1947ء کے خاتمہ پر اس وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ پنڈت گوبند ولبھ پنت نے ہندی کو عدلیہ اور انتظامیہ کی زبان بنانے کا اعلان کیا۔ 1951ء میں ہندی کو صوبہ میں سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ جب کہ اردو بولنے والے طبقے کو کوئی راحت یا سہولت الگ سے نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر سمپورنا نند کی وزارت اعلیٰ کے دور (1956 تا 1960) میں بھی یہ صورت حال برقرار رہی۔ موصوف پرانے مہا سبھائی تھے اور اُردو کے مخالفین میں سے تھے۔ اس زمانے میں اور بعد میں بھی جن سنگھ، جس کے اثرات شمالی ہند میں تھے، اردو کی مخالفت میں بہت آگے تھی اور اس کو دیش مخالف سمجھتی تھی۔ چنانچہ اس وقت سے ہی اُردو کا صوبے کی نہ صرف انتظامیہ بلکہ سرکاری تعلیمی اداروں سے بھی اخراج ہو گیا۔ یہ صورت حال اجودھیا تحریک کے موقع پر بھی باقی تھی۔ حکمت عملی یہ تھی کہ ایک طرف مسلمانوں

(جن کی بڑی تعداد صوبے میں اردو کی حمایتی رہ گئی تھی) کو اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دے کر خوش کر دیا جائے دوسری طرف ہندو کارڈ بھی کھیلا جائے۔

الہ آباد نے ایک فیصلہ میں اجودھیا کا معاملہ جوں کا توں (Status Quo) برقرار رکھنے کا حکم دیا۔ اس کے باوجود ایک فیصلہ کن میٹنگ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نارائن دت تیواری نے لکھنؤ میں بلائی جس میں مرکزی وزیر داخلہ بوٹا سنگھ، اشوک سنگھل، سابق کانگریسی داؤ دیال کھنہ اور مہنت اویدناتھ شریک تھے۔ اس میں پریشد نے وعدہ کیا کہ وہ عدالت کے ہر فیصلہ کے مطابق جائداد کے مالکانہ حقوق (Property Rights) کا احترام کرے گی بدلے میں شلانیاس کی (بنیاد رکھنے کی) اجازت دے دی جائے گی۔[14] لیکن 2/نومبر 1989ء کو شیلانیاس انجام پائی۔ وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اپنے ایک الیکشن جلسے میں اس پر اطمینان کا اظہار کیا کہ سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب پرامن طور پر انجام پائی۔[15]

شلانیاس کے معا بعد ہونے والے الیکشن میں کانگریس کو فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی بدنامی ہوئی۔ بی۔ جے۔ پی کو شمالی ہند میں تین صوبائی حکومتیں (مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش) اور پارلیمنٹ میں 85 نشستیں ملیں۔ (اس میں آدھے سے زیادہ وہ مقامات تھے جہاں مسلم مخالف فسادات ہو چکے تھے) وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی قیادت میں جنتا دل (کل نشستیں 14) کی اقلیتی سرکار مرکز میں بنی، جس کو بی۔ جے۔ پی اور کمیونسٹوں کے 52 ممبران کی حمایت حاصل تھی۔

## منڈل اور رتھ یاترا

وزیر اعظم وی۔ پی۔ سنگھ کی حکومت کو بی۔ جے۔ پی کی حمایت ایک سال کے اندر ہی واپس لے لی گئی۔ وی۔ پی۔ سنگھ نے 7/اگست 1990 کو منڈل کمیشن رپورٹ کی سفارشات کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے تحت مرکزی انتظامیہ اور پبلک کارپوریشن سفارشات میں 27% ملازمت و عہدے دوسری پچھڑی ذاتوں (OBC) کے لیے مختص (Reservation) کئے گئے۔ یہ کمیشن بی۔ جے۔ پی منڈل کی صدارت میں 1974ء میں سماجی اور تعلیمی طور پر پچھڑے کلاسوں کو متعین (Define) کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ جس نے 1980ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ اس کو کئی حکومتوں نے سرد بستہ میں ڈال رکھا تھا۔ OBC کے تحت ▪▪ ذاتیں آتی تھیں جو اگرچہ مندرجہ فہرست قبائل اور مندرجہ

فہرست ذاتوں (جن کو عرف عام میں ہریجن یا اچھوت یا دلت کہا جاتا تھا) میں شمار نہیں کی جاتی تھیں لیکن جو ہندو سماج کی اونچی ذاتیں (جیسے برہمن، چھتری، ویش)) بھی نہیں تھیں بلکہ پچھڑی ذاتیں یا شودر کہلاتی تھیں۔ آبادی میں ان کی اکثریت (52%) تھی۔ اس گروہ کے لیے ریزرویشن منظور کیا گیا۔ اس میں کچھ ہم پیشہ مسلمانوں کو بھی پہلی بار شامل کر لیا گیا تھا۔ اس منڈل رپورٹ کے خلاف بالعموم اعلیٰ ذات کے ہندو تھے۔ سنگھ اس طرح کے ریزرویشن کا سخت مخالف رہا تھا۔ اس کے مطابق وی. پی. سنگھ ہندوؤں کو آگے (Forward) پچھڑے (Backward) اور ہریجن لائن پر تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔[16]

لیکن کسی سیاسی پارٹی کے لیے کھل کر ریزرویشن کی مخالفت کرنا سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔ اور اس کی حمایت کرنے سے اونچی ذات والے ناراض ہو جاتے جو کہ BJP کو بنیاد فراہم کرتے تھے۔

چنانچہ ایل. کے. اڈوانی جو اس وقت BJP کے صدر و سربراہ تھے، نے معاشی بنیادوں پر ریزورویشن کی حمایت کا اعلان کیا نہ کہ ذات کی بنیاد پر۔ اور ساتھ ہی انہوں نے VHP کے تحت چلائی جا رہی ستمبر و اکتوبر کی مہم کی حمایت کا اعلان کیا، جس میں ہندوؤں سے مندر کے لیے ایودھیا جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ 12 رستمبر 1990ء کو اڈوانی نے اپنی رتھ یاترا کا اعلان کیا جو 25 رستمبر کو سومناتھ سے شروع ہو کر 30 راکتوبر کو اجودھیا میں ختم ہونی تھی، جہاں وہ کارسیوا کا افتتاح کرتے، اڈوانی نے 10000 کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ ان کے ساتھ رتھ کی شکل کی گاڑی تھی۔ جس میں کمل کا پھول (BJP کا انتخابی نشان) اور اوم بنا تھا۔ مائک سے انتہاپسند ہندو نعرے لگائے جاتے۔ آٹھ ریاستوں کا سفر کیا گیا۔ جن میں دو ریاستیں مہاراشٹر اور کرناٹک میں کانگریس کی حکومت تھی، لیکن راجیو گاندھی نے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ وی. پی. سنگھ حکومت نے مصالحت کی بڑی کوشش کی، لیکن نتیجہ صفر رہا۔ بلکہ اڈوانی نے اعلان یا کہ اگر رتھ یاترا کو روکا گیا، تو وہ اقلیتی حکومت کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں گے۔ لالو پرشاد یادو وزیر اعلیٰ بہار کے حکم سے رتھ یاترا کو 23 راکتوبر کو روکا گیا اور اڈوانی کو بہار میں گرفتار کر لیا گیا۔

## فسادات کا ایک طوفان

پریشد کی مہم اور اڈوانی کی رتھ یاترا کے دوران ہندو مسلم فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع

ہو گیا۔ پریشد نے 'رام جیوتی یاترا' (جس میں ایودھیا سے مشعل لے کر متھرا اور کاشی (بنارس) کے مندر ہوتے ہوئے پورے ملک میں گشت کا پروگرام بشکل جلوس نکالا، جس کے نتیجے میں 'رام شلا پوجن' کے ہی انداز میں لیکن اس سے زیادہ شدت کے ساتھ فسادات ملک میں پھیل گئے۔ اڈوانی کی گرفتاری کے ساتھ فسادات کا یہ سلسلہ عروج پر پہنچ گیا۔ اس میں سیکڑوں مسلمان ہلاک ہوئے اور کروڑوں اربوں کی املاک تباہ ہوئیں۔ ملکی معیشت کا نقصان الگ ہوا۔

فسادات اور اتر پردیش میں وزیرِ اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کے حکم امتناعی اور بڑے پیمانے پر ہوئی گرفتاریوں کے باوجود 30/اکتوبر کو ہزاروں افراد ایودھیا میں 'کارسیوا' کے لیے پہنچ گئے۔ صوبہ بہار اور مغربی بنگال سے آمد و رفت میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ اتر پردیش کی پولس اور پی. اے. سی کا رویہ 'کارسیوکوں' کے لیے ہمدردانہ تھا۔ بہر حال اس دن دوپہر تک ان انتہا پسندوں نے بابری مسجد کا گیٹ زبردستی کھول دیا، مسجد کے گنبد پر چڑھ گئے اور بھگوا جھنڈا وہاں لہرایا۔ مسجد پر حملے بھی شروع کر دیے۔ لیکن انڈو تبت فورس اور تمل ناڈو فورس نے انہیں مار بھگایا۔ حکومت کے مطابق اس دن چھ افراد وہاں مارے گئے، جبکہ پریشد کے مطابق مرنے والے 'سیوکوں' (خدمت کاروں) کی تعداد 50 تھی۔ نئے وزیر اعظم چندر شیکھر کے بیان کے مطابق 30/اکتوبر اور 2/اکتوبر 1990ء کو پولس فائرنگ میں مرنے والے (کارسیوکوں) کی تعداد 15 تھی۔ اتر پردیش کے ہندی اخبارات نے یہ تعداد بڑھا کر 100 کر دی تھی۔[17] اس کے اثرات ہونے تھے۔ پورے شمالی ہند میں اس کا غصہ مسلمانوں پر اُترا۔ یو. پی. کے درجنوں شہر فسادات کا شکار ہوئے۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کو ''ملا یادو'' کا خطاب دیا گیا۔ پولس کارروائی کا ویڈیو کیسٹ جے. کے. جین اسٹوڈیو نے ہندی میں تیار کیا جو ایک رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ کی تعداد میں فروخت کیا گیا۔[18]

پریشد نے اس موقعہ کو استعمال کرنے کے لیے پورے ملک میں دو پروگرام اور چلائے (الف) مرنے والوں کی راکھ کا جلوس (استھی کلش یاترا) اور (ب) کارسیوکوں کی عزت افزائی کا اجتماعی پروگرام۔

## 1991ء کی پارلیمانی الیکشن

بی. جے. پی کی حمایت واپس لینے کے بعد وی. پی. سنگھ پارلیمنٹ میں اعتماد کا ووٹ نہیں حاصل

کر سکے اور مستعفی ہو گئے۔ پھر چندر شیکھر کانگریس کی حمایت سے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ جو 6 مارچ 1991ء کو اس کی حمایت واپس لینے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ صدر جمہوریہ نے پارلیمنٹ تحلیل کر دی اور نئے الکشن کا اعلان کر دیا۔ راجیو گاندھی کو نئے الیکشن سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ دوسری طرف بی۔جے۔پی ایودھیا کے معاملات سے پورے سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھی۔

مئی رجون کے وسط مدتی الکشن کے دوران راجیو گاندھی کے قتل کے بعد ایک ہمدردی کی لہر کانگریس (آئی) کے لیے چلی، جس سے اس کو تناسبی اکثریت حاصل ہوئی اور پی.وی نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہوئے۔ جب کہ بی۔جے۔پی کی تعداد لوک سبھا میں 85 سے 120 ہو گئی اور کل ہندو ووٹوں کا فیصد 11.30% سے 20.08% ہو گیا۔ ووٹوں کے اس اضافہ میں گجرات، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہماچل اور یو۔پی کا تناسب زیادہ تھا۔ اتر پردیش کے ودھان سبھا کے الیکشن میں اس کو 425 میں سے 211 نشستیں ملیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی جنوبی اور مشرقی ہند میں اس کو کم ووٹ ملے۔ ووٹ کے باوجود راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہماچل میں اس کو اپنی حکومت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ جب کہ یو۔پی میں بی۔جے۔پی کی حکومت بنی اور کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ بنے۔

## بابری مسجد کی شہادت

اتر پردیش میں بی۔جی۔پی کی حکومت خود پارٹی کے لیے ایک چیلنج تھی۔ ایک طرف سپریم کورٹ کے حکم کی پابندی لازم تھی دوسری طرف پریشد اور اس کے حامیوں کے مطالبات تھے۔ حکومت بہر حال پریشد کے ساتھ تھی۔ پریشد نے جولائی 1991ء میں مطالبہ کیا کہ مندر کی تعمیر کے سلسلہ کی قانونی اور دیگر رکاوٹوں کو 18 رنومبر سے قبل دور کر دیا جانا چاہئے۔ جب کہ پارلیمنٹ نے اس دوران عبادت گاہوں کے مقامات کا بل Places of Worship (Special Provisions) پیش کیا جس میں 15 راگست 1947ء سے قبل کی عبادت گاہوں کو قانونی حفاظت عطا کی گئی تھی۔ اس سے صرف بابری مسجد رام جنم بھومی کو مستثنیٰ رکھا گیا۔ یو۔پی کی حکومت نے ستمبر 1991 میں قانونی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے مسجد سے متصل 12.77 ایکڑ آراضی کو ٹورسٹ کمپلکس اور زائرین کی سہولیات کے نام پر حاصل (acquire) کر لیا۔ اس کو ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ اکتوبر میں پریشد نے درج بالا اراضی پر زمین برابر کرنے اور مندر کی تعمیر کی تیاری شروع کر دی۔ اور کارسیوکوں کو

مندر کی تعمیر شروع کرنے کی دعوت دی۔ اسی ماہ کے آخر میں (25/اکتوبر 1991ء) کو ہائی کورٹ نے صوبائی حکومت کو مذکورہ بالا اراضی پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی لیکن کسی مستقل تعمیر (Erecting any Permanent Structure) کرنے سے منع کر دیا۔ اس دوران آر.ایس.ایس اور پریشد نے اجودھیا میں پچھلے سال فائرنگ میں مرنے والوں کی برسی منائی۔ 31/اکتوبر کو بابری مسجد پر حملہ ہوا گنبد پر بھگوا جھنڈا پھہرایا گیا اور مسجد کی باہری دیواروں کو نقصان پہنچایا گیا۔

9/جولائی 1992ء کو کارسیوکوں اور سادھوؤں نے ہائی کورٹ اور اس کی تائید کرتی 15/نومبر 1991ء کو سپریم کورٹ کے آرڈر کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں کنکریٹ کے ایک چبوترہ کی تعمیر شروع کر دی۔ نتیجہ میں سپریم کورٹ نے 11/جولائی 1992ء کو یہ واضح آرڈر پاس کیا کہ کسی طرح کی بھی کوئی مستقل تعمیر یا اس کا ارادہ حاصل شدہ Acquired زمین پر نہیں کیا جائے۔ اس دوران وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور پریشد کے دوران راست مذاکرات شروع کرائے جو آخر اکتوبر میں آخر الذکر کے 6/دسمبر کو مندر تعمیر کرنے کے اعلان سے ٹوٹ گئے۔ 27/نومبر کو سپریم کورٹ نے اتر پردیش کی حکومت کو یہ ہدایت جاری کی کہ وہ اس کا وعدہ کرے کہ کارسیوا کا انعقاد نہیں کیا جائے گا۔ کلیان سنگھ نے اس کی مثبت طریقہ سے پیروی کرتے ہوئے صرف 'علامتی کارسیوا' کی اجازت غیر متنازعہ زمین پر ہونے دینے کا اعلان کیا۔ چنانچہ 5/دسمبر کو 75 ہزار سے ڈیڑھ لاکھ لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ایودھیا میں آر.ایس.ایس، پریشد، بی.جے.پی اور سنگھ پریوار کے تقریباً تمام لیڈر 6/دسمبر کو جائے واقعہ پر موجود تھے۔

12/بجے دن میں مسجد پر شر پسندوں نے حملہ شروع کر دیا۔ رسیوں کی مدد سے وہ گنبد پر چڑھ گئے۔ جرنلسٹ جو اس واقعہ کی تصویریں لے رہے تھے ان پر زبردست حملہ کیا گیا ان کے کیمرے توڑ دیئے گئے اور انہیں مار بھگایا گیا۔ پولیس اور نیم فوجی دستے خاموش تماشائی بنے رہے۔ اس دوران مورتیوں کی حفاظت کی گئی اور مسجد مکمل طور پر توڑ کر گرا دی گئی۔ 6:45 بجے شام مورتیاں اس جگہ پر جہاں بابری مسجد تھی دوبارہ نصب کی گئیں۔ 7:30 بجے شام مورتیوں کے لیے غیر مستقل ڈھانچہ (Temporary Structure) تیار کرنے کا کام شروع ہوا۔[19]

اس کے بعد کلیان سنگھ مستعفی ہو گئے اور اتر پردیش میں صدر راج قائم کر دیا گیا۔ پولس کی اس جگہ پر مداخلت 7, 8 دسمبر کی شب میں ہی ہوئی۔ کانگریس کی مرکزی حکومت نے ایودھیا میں اس

جگہ غیر مستقل مندر کی تعمیر کو بالکل نہیں روکا۔

## فسادات کا پھر ایک لامتناہی سلسلہ

بابری مسجد کی شہادت ہندو مسلم فسادات اور نفرت کا ایک لامتناہی سلسلہ لائی۔ مختلف ٹی. وی چینل پر مسجد کی شہادت کا منظر ساری دنیا نے دیکھا۔ مسلمانوں کے غصہ اور مایوسی کے دوران ہندوؤں کی فتح کے جلوس نکالے گئے۔ ان فسادات میں ایک اندازہ کے مطابق ہزاروں افراد قتل کیے گئے۔ مسجد کی شہادت کی ساری دنیا میں مذمت کی گئی۔ سنگھ کے مخالف ہندوؤں نے بھی اس کی شدید مذمت کی۔

بابری مسجد کی شہادت کے چند دن بعد وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی حکومت نے آر. ایس. ایس، وی. ایچ. پی. اور بجرنگ دل پر Unlawful Activities (Prevention Act 1967) کے تحت دو سال کے لیے پابندی لگا دی اور توازن کے لیے دو مسلم تنظیموں 'جماعت اسلامی ہند'، اور کیرالا کی 'اسلامک سیوک سنگھ' پر بھی پابندی لگا دی۔ حالانکہ آخر الذکر دو تنظیموں کا تعلق مسجد گرانے سے بالکل نہیں تھا۔ غالباً کانگریس کو یہ دکھانا تھا کہ وہ ہندوؤں کی مخالف نہیں ہے۔ درج بالا پابندی کو ہائی کورٹ کے جج کی سربراہی میں قائم ٹریبونل کو صادر کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ہندو تنظیموں پر پابندی کی جانچ کے لیے دہلی ہائی کورٹ کے جسٹس پی. کے. باہری (P.K. Bahri) کو ٹریبونل کا جج مقرر کیا گیا جس نے پریشد پر پابندی کو صادر کیا اور سنگھ اور بجرنگ دل کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ جبکہ ایک دوسرے ٹریبونل نے مسلم تنظیموں پر پابندی کو صادر کر دیا۔ جماعت اسلامی ہند نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جہاں مذکورہ پابندی ختم کر دی گئی۔ اس دوران بابری مسجد کی جگہ بنائے گئے نئے مندر میں بتوں کے درشن کو لے کر کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ جس کا معاملہ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں چلا گیا جہاں کورٹ نے ان بتوں کے درشن و پوجا کی یہ کہہ کر اجازت دی کہ رام ایک 'دستوری شخصیت' ہیں اور ہمارے 'قومی کلچر اور فیبرک (Fabric)' کی حقیقت (Reality) ہیں۔ دلیل یہ تھی کہ ہندوستان کے دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے 1949ء میں جس دستور کی کاپی پر اپنے دستخط ثبت کئے تھے اس پر رام کی تصویر تھی۔ کانگریس کی مرکزی حکومت نے کورٹ کے اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج نہیں کیا۔

11/دسمبر 1992ء کو الہ آباد ہائی کورٹ نے کلیان سنگھ کو حکومت کے 2.77 ایکڑ زمین حاصل کرنے کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ 27/دسمبر 1992 کو مرکزی حکومت نے ایک صدارتی آرڈیننس جاری کیا۔[20] جس کے ذریعہ اجودھیا میں تمام متنازعہ (Disputed) زمینوں کو مرکز نے لے لیا۔ (Acquisition)۔ یہ کل زمین 67.7 ایکڑ تھی۔ جس پر تجویز تھی کہ دو مختلف ٹرسٹ، مندر اور مسجد بنے۔ جبکہ دسمبر 1992ء میں ہی مرکز نے صدر جمہوریہ سے درخواست کی کہ وہ دستور ہند کی دفعہ (1) 141 کے تحت سپریم کورٹ سے اس پر رائے لے کہ آیا رام جنم بھومی، بابری مسجد کی تعمیر سے قبل کیا وہاں کوئی ہندو مندر یا ہندو مذہبی ڈھانچہ موجود تھا۔ نرسمہا راؤ حکومت کے سوال کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ کس کی حمایت کی جارہی ہے۔

24/اکتوبر 1994ء کو سپریم کورٹ نے درج بالا امور پر اپنے فیصلہ میں صدارتی سوالنامہ کو غیر ضروری قرار دے کر بغیر جواب دیئے واپس کر دیا۔ دوسری طرف کورٹ کی اکثریت نے اجودھیا کی 67 ایکڑ متنازعہ زمین پر قبضہ کو جائز قرار دیا۔ لیکن اس سے متعلق تمام مقدمات کو ختم کرنے کو غیر دستوری قرار دیا۔ اس طرح الہ آباد ہائی کورٹ کے تمام مقدمات دوبارہ تازہ ہو گئے۔ جس کے فیصلہ تک مذکورہ زمین پر کوئی بھی تعمیری کام نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی طرح کلیان سنگھ حکومت کو اس کا مجرم قرار دیا کہ اس نے کورٹ کے فیصلہ کے خلاف وہاں مستقل اسٹرکچر قائم کرنے دیا۔

پریشد پر دو سالہ پابندی 9/دسمبر 1994ء کو ختم ہو گئی۔ 14/جنوری 1995ء کو اس پر دوبارہ پابندی لگائی گئی۔ لیکن یہ کاغذی رہی۔ پریشد اپنے کاموں میں لگی رہی۔ یہ ہندو سنگم کے نام سے کام کرتی رہی۔ پریشد کے معاون جنرل سکریٹری اچاریہ گری راج کشور نے پھر مطالبہ کیا کہ وارانسی اور متھرا کا 'متنازعہ ڈھانچہ' (جس سے مراد وہاں واقع مسجد ہے) ہندوؤں کے حوالے کیا جائے۔[21] سرسنگھ چالک راجندر سنگھ نے اس کی بھرپور تائید کی۔ اٹل بہاری باجپئی نے کہا متھرا اور وارانسی ان کی پارٹی کے ایجنڈے میں نہیں ہے۔ لیکن موصوف نے اس مطالبہ کی کسی طرح کی مذمت یا تنقید نہیں کی۔ تقسیم کار کے اصول پر ''پریوار'' کا ہر یونٹ اپنے کاموں میں لگ گیا۔

رام مندر تحریک کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ہندو ووٹ بنک مضبوط ہوا۔ متعدد جگہ بی.جے.پی کی سربراہی میں حکومتیں بنیں۔ 1996ء میں 13/دن اور 1998ء میں 18/پارٹیوں کے ساتھ اور 1999ء میں جنرل الیکشن کے بعد 24 پارٹیوں پر مشتمل نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (NDA) کے تحت

مخلوط حکومت مرکز میں بنی، جس کے سربراہ یعنی وزیر اعظم سنگھ کے قدیم پرچارک اٹل بہاری باجپئی بنائے گئے۔ مرکزی حکومت میں متعدد اہم وزارتیں (ڈپٹی وزیر اعظم، داخلہ، فروغ انسانی وسائل (HRD)، خارجہ، فائنانس وغیرہ) اس کے قبضے میں آئیں۔ یہ صوبوں کے گورنر بنے اور دیگر اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کا ووٹنگ کا فیصد کل ہند سطح پر 25% تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ لیکن کانگریس کی خودغرضیوں اور حزب اختلاف کی حماقتوں نے کافی مواقع بی۔ جے۔ پی کے لیے پیدا کر دیے ہیں۔ نتیجہ میں اس دوران سنگھ پریوار کافی مضبوط ہوا ہے۔

## حوالہ جات:-


1. اس واقعہ کی تحقیق کرنے والے عبدالملک مجاہد نے ان کی تعداد کا اندازہ تین ہزار سے بائیس ہزار لگایا ہے۔ صحیح تعداد کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ دیکھیں
   Conversion to Islam: Untouchables' Stratergy for Protest in India-Chambersburg, PA: Anima Books, 1998, Page 8.
2. Statesman, Delhi, 20 July 1981, Times of India, 21 July, 1981, for Secret Note: Muslim India 1 (2) Feb, 1983 pp 89-91, leaked in 1982.
3. Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Act 1986.
4. The Hindu Nationalist Movement in India (MMI) Page 94, See Footnote 76.
5. Ibid, Page 94, See Footnote 7 for Reference.
6. Organiser, 25 September 1983, 27 November 1983, Depawli Special 1983, Page 27.
7. K.R. Malkani: The Politics of Ayodhya and Hindu-Muslim Relation, Delhi, Har-Anand, 1993, Page 12.
8. Organiser, 29 April, 1984, Page 10.
9. MMI, Page 362.
10. Organiser, 22 April 1984, Page 1-2.
11. Statesman, Delhi 17 August 1989.
12. MMI, page 397.
13. Times of India, 6 November 1989, Page 6.
14. White Paper on Ayodhya, G01; February 1993, Page 42.
15. Indian Express, 10 November 1989.
16. Organiser, 26 August 1990, Page 15; 'Rajas' Cast War'.
17. Statesman, Delhi, 21 February 1991, Prob. December 1990, Page 7.
18. Economic Times, Delhi, 23 November 1990.
19. Hindustan Times, Delhi, Sunday, 10 December 2000, Page 11.
20. Made Act Later as 'Acquisition of Certain Areas at Ayodhya Act 1993.

# آر.ایس.ایس (.R.S.S) کی مکارانہ پالیسی اور چیلنجز

آر.ایس.ایس. کے سامنے جو حقیقی چیلنج ہے اس سے قطع نظر زیر نظر مضمون میں اس کے بعض سیاسی چیلنجز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تا کہ مجموعی طور پر آر.ایس.ایس. کی مکارانہ پالیسی کا اندازہ کیا جاسکے۔ (مرتب)

راشٹریہ سیوم سنگھ (.R.S.S) کو قائم ہوئے تقریباً اسی سال ہونے جارہے ہیں۔ اپنے اثرات، اثر ورسوخ کے پہلو سے یہ عروج کی بلندیوں کو چھورہا ہے۔ ہندوستان کا وزیر اعظم امریکہ میں جاکر اعلان کرتا ہے کہ اس کی وزارت عظمیٰ ختم ہوسکتی ہے لیکن اس کا 'سیوم سیوک' ہونا ختم نہیں ہوسکتا۔ وہ ویشو ہندو پریشد کے سادھوؤں اور لیڈروں کے دوران برسرِ عام اس کا اعادہ کرتا ہے، ہم لوگ، اپنے خوابوں کا ہندوستان اس وقت بناسکیں گے جب عوام ہمیں دو تہائی اکثریت دے دیں گے۔[1]

بات صرف ووٹوں تک محدود نہیں ہے۔ مطلوبہ قوت کے حصول کے لیے سنگھ ہر میدان میں متحرک ہے۔ تیاریاں کئی پہلوؤں سے ہو رہی ہیں۔ سنگھ میں 'نرم' اور 'سخت' بے معنی ہے، کاموں اور رویّوں میں فرق حکمت عملی کا حصہ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ کسی طرح سنگھ کی آڈیولوجی کو فروغ دیا جائے۔ اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ سنگھ کا خطرہ حقیقی ہے اور یہ صرف سیاسی نہیں ہے۔

بابری مسجد کی جگہ مندر کی تحریک سیاسی قوت کے حصول کے لیے تھی۔ اس تحریک سے نہ صرف ہندو ووٹ بنک کی تعمیر ہوئی بلکہ اس میں زبردست مضبوطی آئی۔

دوسری طرف کانگریس کی دوغلی پالیسی کی وجہ سے لوگوں کا اس پر سے عمومی اعتماد اُٹھ گیا۔ اُس نے ایسا خلاء پیدا کر دیا جس کو سیکولر متبادل اپنی آپسی چپقلش سے پر نہ کر سکا۔ حالانکہ مسجد کی شہادت کے بعد عام ہندوؤں میں سنگھ پریوار کے لیے ولولہ باقی نہ رہا تھا۔ ان حالات میں سنگھ کی سیاسی تنظیم بھارتیہ جنتا پارٹی (BJP) نے سنگھ کی منظوری سے، اپنے متنازعہ ایجنڈے (یکساں سول کوڈ، دفعہ 370، رام مندر) کو عارضی طور پر خیر باد کہہ کر دیگر پارٹیوں کو حکومت میں شرکت کی دعوت دی، جس میں اس کو واضح کامیابی ملی۔ مندر کی تحریک کے نتیجے میں 1984ء کی دو سیٹوں سے بڑھ کر یہ تعداد

پارلیمنٹ میں 1989ء میں 86، 1991ء میں 121 اور 1998ء کے الیکشن میں 163 ہوگئی تھی جب کہ 13 دن کی اپنی حکومت کے دوران اس نے مذکورہ ایجنڈا کو اختیار نہ کرنے کا اعلان کیا۔ یہ تعداد متحدہ محاذ (United Front) کی حکومت کی ناکامی اور کانگریس کے دوہرے کردار کے پس منظر میں 1998ء کے الیکشن میں 180 ہوگئی جس سے BJP نے ایک الائنس بنایا جس کی حکومت 13 ماہ چلی۔ 1999ء میں اس نے National Democratic Alliance (NDA) کے مشترکہ (Common) ایجنڈا کے تحت الیکشن لڑا جس میں الائنس کو واضح اکثریت ملی۔ لیکن BJP کے ممبران پارلیمنٹ کی تعداد 182 ہی رہی۔ پارٹی کو اپنی سادہ اکثریت کے لیے مزید 100 ممبران کی ضرورت ہوگی جب کہ اس کو اپنے خوابوں کی تعمیر کے لیے دو تہائی اکثریت چاہیے۔ ان اعداد وشمار سے اس کے سیاسی مخالفین مطمئن لگتے ہیں کہ ایسی اکثریت BJP کے لیے قابل حصول نہیں ہے۔ یہ سوچ سادگی اور سہولت پسندی کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیونکہ سنگھ نے دل ودماغ پر قبضہ کے لیے صرف سیاست کو ذریعہ نہیں بنایا ہے۔ بلکہ زندگی کے ہر میدان میں وہ داخل ہو رہا ہے اور کام کر رہا ہے۔ اس کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ سماجی زندگی کا کوئی شعبہ شائد ہی اس سے بچا ہوا ہو۔ یہ سب مل کر سنگھ کو مضبوط کرتے ہیں۔

## سنگھ کو درپیش چیلنج اور آئندہ کی حکمت عملی

سنگھ کو بنیادی طور پر اس وقت چار چیلنج درپیش ہیں۔[2]

① روزانہ کی شاکھاؤں میں حاضری کی کمی ایک بڑا مسئلہ ہے جس کو سنگھ کے ذمہ دار محسوس کر رہے ہیں۔ ان شاکھاؤں میں کم عمر لڑکے سنگھ کی آئیڈیالوجی کو جذب کرتے رہے ہیں اور پھر تربیت کے بعد کم عمری میں ہی 'پرچارک' بنائے جاتے ہیں آج نئی نسل کو زیادہ خود اعتمادی حاصل ہے، وہ مغربی کلچر اور روایات سے خوفزدہ نہیں بلکہ اس کو خوش آمدید کہہ رہی ہے اور اس لائف اسٹائل کو اپنانے کے لئے بے چین ہے۔ اپنی ذات اور اپنی زندگی کی اسے سب سے زیادہ فکر ہے ان میں سنگھ کی اپیل کم ہو رہی ہے۔

② تربیت یافتہ سیوم سیوکوں کی تعداد اور اس کی ذیلی تنظیموں (Front Organisations) میں آنے والے غیر تربیت یافتہ افراد کی تعداد میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ شاکھاؤں میں تربیت پانے والے افراد کی کمی سے بڑے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ڈسپلن اور کنٹرول ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے۔

③ بھارتیہ جنتا پارٹی سے اس کے تعلقات۔ سیاسی عمل میں سنگھ کا عمل دخل اندرونی ٹینشن پیدا کرتا ہے۔ جمہوری عوامی سیاست کے اپنے حدود (Limitation) ہیں، اس کا سنگھ کو احساس ہو رہا ہے۔ مختلف اونچے عہدوں پر سنگھ کے افراد کی تقرریوں سے سہولیات اور اقتدار کا مزہ مل رہا ہے۔ سنگھ کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ کہیں اس کے لیڈر کا بی۔ جے۔ پی یت (BJP-lisation) نہ ہو جائے۔ حقیقت ہے کہ یہاں سیاسی جوڑ توڑ بڑھا ہے۔ یو۔ پی۔ میں بابری مسجد کیس کے اہم ملزم ساکشی مہاراج الگ ہو کر ملائم سنگھ جیسے آدمی سے مل گئے ہیں تو گجرات میں سنگھ/ بی۔ جے۔ پی۔ کو بلندیوں تک لے جانے والے شنکر سنگھ واگھیلا کانگریس میں چلے گئے ہیں۔

④ سنگھ کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہندوستانی کثیر جہتی (Pluralism) بھی ہے۔ بھارت مختلف Ethnic Groups جیسے لسانی، قبائلی اور مذہبی گروہوں کا الحاق (Federation) رہا ہے۔

یہاں یہ بار بار بھارت اور ہندو اسٹیٹ کے مطالبات ٹکراتے محسوس ہوتے ہیں۔

## نئی حکمت عملی

اس ضرورت کا کھلے عام اظہار لال کرشن اڈوانی نے کیا ہے۔[3] حکمت عملی کا مطلب 'ہندتو' یا سنگھ کی آئیڈیالوجی کو چھوڑنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی سواری (Vehicle) جو رام مندر ایشو کے علاوہ ہو اور ہندتو کو آگے لے جا سکے۔ سواری کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ اس پر غور و فکر اور تجربات بھی ہو رہے ہیں۔ لیکن غالباً اس پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا ہے۔ اس تلاش و جستجو میں کبھی قومی سلامتی کے مسئلہ کو اُبھارا جاتا ہے تو کبھی دہشت گردی (Terrorism) اور پوٹو (Poto) ایشو بنتا ہے۔ دو مسئلہ ایک ایسے ملک کو شامل کرتا ہے جس کو امریکہ کی حمایت حاصل ہے اور ذرائع کے مطابق بھارت امریکہ مخالف رخ نہیں اختیار کر سکتا۔ BJP نے اس کو اتر پردیش کے الیکشن میں استعمال بھی کیا تھا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ عیسائیت مخالف رخ بھی اپنایا گیا تھا۔ لیکن یہ اہلِ مغرب کو اپنا مخالف بنانا ہوگا جس کا تجربہ عیسائی پادری اسٹینس کے زندہ جلائے جانے کے گھناؤنے واقعہ کے بعد ہو چکا ہے۔ دیگر زیرِ غور ایشوز یہ ہیں:

یکساں سول کوڈ (علیحدہ پرسنل لاء کا خاتمہ)، مسلمانوں کی سلامتی کا انحصار ہندوؤں کے خیر سگالی (Goodwill) پر ہے اس لیے انہیں اس کے لیے کوشاں رہنا چاہئے۔

اجودھیا کے ساتھ متھرا اور بنارس (کاشی) کی مسجدوں کا مسئلہ اُٹھانا وغیرہ۔ یہ طے ہے کہ مذکورہ حکمت عملی مسلم، کمیونسٹ اور سیکولر مخالف ہوگی۔ اس مہم کا اصل ذریعہ وشو ہندو پریشد ہی ہوگا اسی نے بلا خوف اور وفاداری کے ساتھ پہلے بھی مندر تحریک چلائی تھی۔ آج بھی اس کا وہی رنگ ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس حکمت عملی کا نشانہ کیا ہے، سواری کی منزل کیا ہے۔ اس کا پہلا نشانہ اپنی سیاسی قوت کو مضبوط و مستحکم کرنا ہے تاکہ ہندتو کی طاقتوں کو ڈھال فراہم کیا جا سکے۔ دوسرا مقصد ہے سماج کی تخریبی قوتوں کو کچلنا اور بے اثر بنانا، تبھی وہ ہندوستانی سماج میں ضم ہو سکیں گی۔

سنگھ اس پر مطمئن ہے کہ ہندوؤں اور مخالف ہندوؤں (Anti-Hindus) میں مہابھارت ازم ہے۔[4] اس لیے جنگی تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ پریشد اپنے کیڈر کو (بشمول بجرنگ دل) جنگی اور فوجی تربیت پچھلے دس سالوں سے دے رہی ہے۔ پورے ملک میں ایسے 30 لاکھ تربیت یافتہ افراد تیار کرنے کا منصوبہ زیر عمل ہے۔[5] اس کی عملی مشق و تجربہ صوبہ گجرات کے فسادات میں ایک عرصہ سے کیا جارہا ہے۔[6] لیکن کیا یہ تجربہ کامیاب کہا جائے گا۔ پہلا نقصان تو یہ ہے کہ اس سے ملک کی تصویر پوری دنیا میں بہت خراب ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ امن و قانون کی خراب صورتحال کی وجہ سے غیر معمولی معاشی نقصان ہوا ہے۔ اس کے پورے ملک میں پھیلنے سے باہری سرمایہ کاری بند یا بہت کم ہو جائے گی جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے۔ بدحالی سیاسی غلامی کا باعث بن سکتی ہے، ماضی میں ایسا ہو چکا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مذکورہ تخریبی قوتیں، منظم و متحرک ہو سکتی ہیں۔[7]

درج بالا صورتحال میں ہندوستانی ریاست اور ہندو ریاست میں ٹکراؤ ناگزیر ہو جائے گا۔ قوم پرستوں کو دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوا۔ یہ اگنی پریکشا، آسان نہ ہوگی۔ سماج اپنے سماج سے ٹکرائے گا۔ تب پورے سماج پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سنگھ پوری بھارتی تاریخ میں خود سب سے بڑی تخریبی قوت تھی۔ افسوس ہے کہ اتنی کثیر افرادی قوت اور صلاحیتوں کی بے وقعتی و بربادی اس کے غلط نظریات و ذہنی تعصبات کی وجہ سے ہوگی۔ کیا کبھی اپنی غلطی ان پر واضح ہو سکے گی؟ کبھی وہ نئی آئیڈیالوجی اور نظریہ حیات پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں؟

1. PM or no PM, I'll remain a swayamsevak-1st Page news story, 11 September 2000,

Dateline, New York, Hindustan Times, New Delhi-1

2. شروع کے تین چیلنج بھارت بھوشن کے ایک مضمون اور چوتھا پریم شنکر جھا کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

The Hindustan Times, Delhi, 7 October 2000 Challenging Times for the RSS by Bharat Bhusan and the Hindustan Times, Delhi, 10 March 2000. Between India and a Hindu State by Prem Shankar Jha.

3. Times of India, New Delhi, 21 March 2002, new item 'Advani asks RSS to look for New Hindutava Agenda.

4. The Hindustan Times, Delhi, 17 March 2000, Editorial 'Sudarshan's war.'

5. Times of India, New Delhi, 19 June 2001, news item 'Bajrang Dal' held arms training camps in Bengal too, outed by state general secretary of the VHP, Ajay Kumar Nandi of the VHP Ajay Kumar Nandi

Also Times of India, 16 May 2001 news VHP Plans 'TIrishul Training' for Kar Sewaks and news item in Indian Express, Delhi 10 April 2002 pp 1-2.

6. سورت اور گجرات کے دیگر شہروں میں 2000 کے فسادات پر قومی اقلیتی کمیشن اور اخبارات کے تبصروں کے لئے دیکھیں۔

The Hindustan Times, Delhi, Editorials dated 4 August 2000 (words and Deeds) and 9 August 2000 (Parivar's lab).

7. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سنگھ جلدی میں ہے۔ مہابھارت کا بیان اپنے کیڈر کو متوجہ اور مطمئن کرنے کے لیے ہے۔ آئندہ چند سال بہت اہم ہوں گے۔ سنگھ کی کوشش و خواہش ہوگی کہ مسلمانوں میں معتدل عناصر کی جگہ لیڈر شپ جذباتی لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ تبدیلی مہابھارت کے لئے ضروری ہوگی۔ وہ وقت مسلم لیڈر شپ کے لئے سخت امتحان کا ہوگا۔ اپنے انسانی، دستوری اور قانونی حقوق کے دفاع کے ساتھ ساتھ انہیں انتہا پسندی سے بچنا ہوگا۔

بشکریہ آر.ایس.ایس: ایک مطالعہ

مصنف: حارث بشیر

ناشر: کوسموس بکس، نئی دہلی

# سنگھ پریوار اور ہندتو کا سامراجی ایجنڈا

از: فیصل انور اگ

سنگھ پریوار کے سامراجی ایجنڈا کے ذیل میں سیکولرزم کے تجزیے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ تاہم زیر نظر مضمون میں مضمون نگار نے 'ہندتو' سامراجی ایجنڈے پر کسی حد تک روشنی ضرور ڈالی ہے۔ (مرتب)

نازی جرمنی کی طرح بھارت میں بھی فسطائی فرقہ پرست طاقتیں جمہوریت کو ختم کر کے ایک انتہا پسند آمرانہ حکومت کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ یہ طبقہ ملک کی آزادی، خود اعتمادی اور اس کے مفادات کو بھی امریکہ کے ہاتھوں گروی رکھنے کے لئے نہ صرف آمادہ ہے بلکہ امریکی سامراجیت کے آگے سربسجود ہو چکی ہے۔ محنت کش قوانین میں تبدیلی، صنعتوں کا زوال اور ملک کی رنگا رنگ تہذیب و ثقافت پر حملے اس کی امریکہ نواز پالیسی کا ہی حصہ ہے جو دراصل موجودہ حکمراں ٹولی جس میں سماج واد کی علمبردار پارٹیاں بھی ہیں، 1857ء میں ہندوستانی قومیت کا جو تصور اُبھرا تھا اسے ختم کر کے دورۂ غلامی کے سامراجی دستاویزوں کو قانونی شکل دینے میں لگی ہیں۔

1992ء میں بابری مسجد کی شہادت 2002ء میں گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام دراصل ایک سیاسی تجربہ تھا جس کے پیچھے بھی دھرم کے بجائے، اسی سرمایہ دارانہ نظام سیاست کی کارفرمائی تھی، جو مذہبی اقلیتوں پر حملے کر کے اور آدیباسیوں، دلتوں اور دیگر طبقات کی شناخت اور تہذیبی و ثقافتی پہچان کو مٹا کر ان کا ہندو کرن کر کے ملک کے سیکولر نظام کو ختم کرنا ہے اس کے بغیر ہندو راشٹر کا دیرینہ خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

ہندو راشٹریہ کے پیچھے محض ایک مذہبی تصور ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی سے کہیں زیادہ اس کے معاشی اور سیاسی اسباب ہیں جن کا تجزیہ بھی ضروری ہوگا۔

1947-1952ء میں جن کو حاشیہ پر ڈال دیا گیا تھا بلکہ ہندوستانی سیاست میں جن کا کوئی قابل ذکر وجود ہی نہیں تھا، 1967ء کے بعد وہ ہندوستانی سیاست Main Stream کا حصہ بن گئے اور دو

قومی نظریہ کے تصور کے خالق اور انگریزوں سے معافی مانگنے والے ساورکر کے مجسمہ کو پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں لگا دیا گیا۔ آزاد ہندوستان کی سیاست میں یہ ایک غیر معمولی حادثہ ہے۔ ساورکر نے انگریزوں سے معافی مانگنے کے بعد منڈے اور ہیڈگوار سے مل کر بھارت میں ہندو راشٹر کے قیام کا عہد کیا تھا۔ اور منڈے کو اٹلی اور جرمنی کے دورے پر بھیجا تھا کہ وہاں کی فسطائی اور نازی تحریکوں اور حکومتوں کا مطالعہ کر کے اور اسی کی بنیاد پر بھارت میں ہندو راشٹر کی خمیر تیار کی جا سکے۔

1925ء سے 1967ء تک سنگھ حاشیہ پر رہی، لیکن غیر کانگریسی اتحاد اور اندھی اور بے شعور سیاست نے فاشسٹوں کے عزائم کو نظر انداز کرتے ہوئے جو سیاسی محاذ بنایا اس نے گاندھی کے قاتلوں کو سماجی مقام دلانے میں اہم کردار ادا کیا، اور وہ 1977-1974ء تک ایک طاقت بن کر اُبھرے، اس درمیان دلتوں اور پچھڑوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی تھی۔ اور ان کے کئی سیاسی رہنما اُبھر کر سامنے آ چکے تھے، دلت بیداری برہمنزم کے لئے زبردست خطرہ تھی۔ ہزاروں سال کی سیاسی و معاشی بالادستیوں پر اب ضربیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ہوا کے رخ کو پہچانتے ہوئے سنگھ پریوار نہایت چالاکی و عیاری کے ساتھ برہمنزم کے تحفظ کے لئے آگے آئی۔ 1989ء کے بعد سنگھ پریوار نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کچھ علاقائی اور سماج وادی پارٹیوں کو بھی ملا لیا اور انہیں ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ سماج واد اور سیکولرزم کے ان جھوٹے دعوے داروں نے خود اپنے اصولوں کی دھجیاں اُڑائیں اور فاشسٹوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے۔

سویت یونین کے زوال کے بعد امریکہ دنیا کا واحد سپر پاور بن کر اُبھرا۔ بھارت میں امریکی نظریات کی حکومت نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا۔ سنگھ پریوار ار بی۔جے۔پی نے اپنے امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، جدو جہد آزادی کے تمام مثبت اقدار کو پامال کر کے اور ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادوں پر حملے کر کے سنگھ پریوار نے فسطائیت اور نازیت کے اپنے چہرے کے ساتھ "سنسکرتک راشٹرواد" کا نعرہ دیا۔ سنسکرتک راشٹریہ واد ایک ایسا خطرناک تصور ہے، جس میں تہذیبی رنگا رنگی، مذہبی آزادی، تحمل اور اختلاف رائے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس راشٹریہ واد کے نشانے پر نہ صرف مسلمان اور کمیونسٹ بلکہ دلت، آدیباسی اور دیگر تہذیبی و ثقافتی طبقات ہیں اس لئے کہ امریکی مفادات کے تحفظ، برہمنزم کی بالادستی اور سنگھ پریوار کے عزائم کی تکمیل کے لئے ان کے وجود کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کا

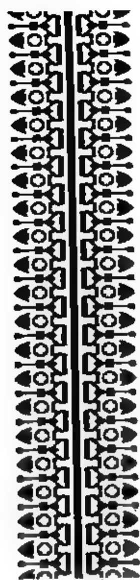
خواب یقیناً شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

سنگھ پریوار کے امریکی آقا بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ امریکی سامراجیت کا دبدبہ قائم کرنے کے لئے بھارت کی کثرت میں وحدت کی اس سماجی نظام کو توڑنا ہوگا جس کی جڑیں آج بھی کافی گہری ہیں جس کے لئے سنگھ پریوار اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اسی لئے امریکی سماج سنگھ پریوار کو بے تحاشہ فنڈ فراہم کرتا ہے۔ اس کے لئے جدید تجربے اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ساتھ ہی وی.ایچ. پی اور توگڑیا جیسی طاقتوں کی پرورش کرتا ہے، امریکی رہنمائی میں 8-9 سامراجی طاقتوں کے بھی یہی عزائم ہیں اور وہ بھی ہندوستان کی ان تخریب پسند طاقتوں کی ہر ممکن تعاون میں کبھی پیچھے نہیں رہتیں۔ تاریخ کو افسانہ بنانے اور افسانے کو تاریخی حیثیت دلانے، سائنٹفک سوچ کی جگہ توہمات وخرافات کو اعتبار دلانے کے پیچھے بھی دراصل اسی سامراجی سیاست کا ہاتھ ہے۔

ہیڈگوار، گولوالکر وغیرہ کی تحریکوں میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ اور نریندر مودی کے سیاہ کارنامے انہیں نظریات کو وسعت دینے اور عملی شکل میں پیش کرنے کا ہی ایک تجربہ ہے جو سیکولر بھارت کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے۔ ظاہر ہے ان خطرناک عزائم کو ناکام بنانے کے لئے ایک زبردست سیکولر قوت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے کسان، مزدور اور سماجی، معاشی اور سیاسی طور پر محروم عوام کے درمیان ایک طاقت ور اور اٹوٹ رشتہ قائم کرنا ہوگا۔ جو اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر ایک زبردست محاذ بنانے کی ضرورت ہوگی لیکن اس کے لئے ماضی کی غلطیوں کو بھی نظروں کے سامنے رکھنا ہوگا۔ آج بھی بھارت میں سیکولرزم کی جڑیں کافی گہری ہیں اور جمہوریت کے طرفداروں کی اکثریت ہے،ضرورت اس قوت کو یکجا کرنے کی ہے۔ اگر ایسا ہوگیا جو ناممکن نہیں اور ہندتو کے عزائم کو جاننے کے بعد یقیناً عوامی اتحاد کا امکان زیادہ روشن ہے، بشرطیکہ سیاسی رہنما کوئی غلطی نہ کریں تو آج بھی سنگھ پریوار اپنا بوریا بستر لپیٹ کر 52-1947 کی حالت میں پہنچ جائے گا۔

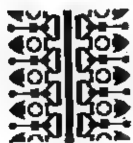
(پندرہ روزہ صدائے جھارکھنڈ، رانچی)








# بابری مسجد کی تاریخی حیثیت







"یوں تو بعض مصنفین اور سیاحوں کی تحریروں میں بھی اجودھیا کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی شری رام جنم بھومی کا ذکر نہیں ملتا، مرآۃِ مسعودی میں اس مندر کا ذکر نہیں ہے، ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اور بابر نامہ میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہاں ابو الفضل کی تحریر کردہ آئینِ اکبری میں یہ بات ضرور کہی گئی ہے کہ اجودھیا شہر کو رام جنم بھومی بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ یہ بات عام ہے کہ پوری اجودھیا رام جنم بھومی تھی اور اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ یہاں بہت سے مندر تھے لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یہاں شری رام جنم بھومی نام کا کوئی مندر تھا اور اسے توڑ کر مسجد تعمیر کی گئی۔"

از: سشیل کمار سریواستو

شعبہ تاریخ، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

# بابری مسجد: پس منظر، پیش منظر

بابری مسجد کی شہادت سے قبل لکھی گئی ایک اہم تحقیقی و تاریخی دستاویز

از: سیّد صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

## بابری مسجد کے کتبات

بابری مسجد کی تاریخی حیثیت اس کے کتبہ سے ظاہر ہوتی ہے، اس مسجد پر لکھے ہوئے کچھ اشعار تو یہ ہیں:

بفرمود شاہ بابر کہ عدلش بنائیست تا کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبط قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سال بنائش عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی 935ھ

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ بابر کے حکم سے جس کی عدل پروری کاخ گردوں سے ملتی ہے، اس کی بنا پڑی، سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر باقی نے اس کو بنوایا، جو اب فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے، خدا کرے یہ کارِ خیر باقی رہے، اسی لئے اس کی تعمیر کا سال ''بود خیر باقی'' (935ہجری)

دوسرے کتبہ میں یہ تین اشعار ہیں:

بنام آں کہ دانا ہست اکبر کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفےٰ بعد از ستائش کہ سرور انبیائے دو جہانی
فسانہ دو جہاں بابر قلندر کہ شد در دور گیتی کامرانی

ان اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کو دانا، اکبر، جملہ عالم کا خالق اور لامکاں کہا گیا ہے، پھر اس حمد کے بعد محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا گیا ہے اور آپ کو دو جہاں کا سردار کہا گیا ہے، پھر آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ بابر قلندر کا افسانہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس لئے وہ اس دنیا میں کامران رہے۔

اوپر کے چھ اشعار مسز بیورج کی بابر نامہ ضمیمہ یو میں درج ہیں، مگر رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر جناب حبیب الرحمٰن قاسمی نے اس مسجد کے پورے کتبات بڑی محنت سے حاصل کئے ہیں، ان کے

بیان کے مطابق ایک کتبہ پتھر کی دو میٹر لمبی اور 55 سینٹی میٹر چوڑی تختی پر ہے جو مسجد کے مسقف حصہ کے درمیان مرکزی در کے اوپر نصب ہے، اس پر بسم اللہ کے علاوہ تین سطروں میں آٹھ اشعار لکھے ہوئے ہیں، جن میں پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں بانی کا نام نسبت کی صراحت کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ اور آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع تعمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام آں کہ دانا است اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانے
درودِ مصطفٰے بعد از ستائش — کہ سرور انبیاء زندہ جہانے
فسانہ در جہاں بابر قلندر — کہ شد در دورگیتی کامرانے
چناں کہ مطلع کشور گرفتہ — زمیں را چوں مبارز آسمانے
دراں حضرت یکے سید معظم — کہ نامش میرباقی اصفہانے
مشیر سلطنت تدبیر ملکش — کہ ایں مسجد حصارِ مہتانے
خدایا درجہاں تابندہ ماند — کہ خیر و بخت وتخت زندگانے
دریں عہد و دریں تاریخ میموں — کہ نو صد پنج و سی بودہ نشانے

**نوٹ:-** دو سطروں میں عربی میں کچھ لکھا ہوا ہے جو پڑھا نہیں جاسکا۔ (مصنف)

مسجد کے اندرونی حصہ میں منبر کے پاس دائیں طرح کتبہ ہے۔

بمنشائے بابر خدیو جہاں — بسا بلکہ باکاخ گردوں عناں
بناکرد ایں خانۂ پائیدار — امیر سعادت نشاں میرخاں
بماند ہمیشہ چنیں بانیش — چناں شہر یار زمین و زماں

بائیں جانب یہ کتبہ ہے۔

بفرمود شاہِ بابر کہ عدلش — بنائیست باکاخ گردوں ملاقی
بناکر دہ ایں مہبط قدسیاں را — امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی و سالِ بنائش — عیاں شد چوں گفتم بود خیر باقی

جناب حبیب الرحمٰن صاحب کا بیان ہے کہ 27/مارچ 1934ء میں اجودھیا میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تو اس موقعہ پر فسادی آخری دونوں کتبوں کو اکھاڑ کر لے گئے۔ بعد میں منبر کے بائیں جانب والے کتبے کی ایک نقل تیار کر کے تہور خاں ٹھیکیدار نے نصب کرا دیا۔ البتہ دائیں جانب کی نقل وہ نہ کرا سکے، مگر ان تینوں کتبوں کی فلم اور اس کا فوٹو ضمیمہ فارسی و عربی ہندوستانی کتبات 1965ء ناگپور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کتبوں کے معانی ہم یہاں مسلسل طریقہ سے پھر لکھ رہے ہیں۔

اس نام پر کہ جو دانا اور سب سے بڑا ہے، اور جملہ لا مکانی کا خالق ہے، اس کی تعریف کے بعد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ہو۔ جو نبیوں کے سردار اور دنیا کے خلاصہ ہیں۔ بابر قلندر کا فسانہ دنیا میں ہے، اس لیے کہ وہ دنیا کے دور میں کامیاب رہے۔ جب انہوں نے ملک کے مطلع کو حاصل کیا تو زمین آسمان سے لڑنے لگی، اسی شہر میں ایک عظمت والے سیّد ہیں، ان کا نام میر باقی اصفہانی ہے وہ سلطنت کے مشیر ہیں، اور ان کی تدبیر سے یہ مسجد چاند کی جگہ اچھے لوگوں کا حصار بن گئی۔

اے خدا اس دنیا میں نیکی، بخت، تخت اور زندگی چمکتی رہے، اسی عہد میں اور اسی مبارک تاریخ میں 935ھ میں بنی۔

دنیا کے مالک بابر کی منشا سے جس کی عنان کاخ گردوں ہے، اس خانۂ پائیدار کی بنیاد امیر سعادت نشان میر خاں نے ڈالی، ایسے بانی ہمیشہ باقی رہیں، اور ایسے زمین و زماں کے شہریار بھی۔

بابر کے فرمانے پر جس کی عدل پروری آسمان کے محل سے ملتی ہے، اس کی بنیاد کی سعادت حاصل کرنے والے ایک امیر باقی نے فرشتوں کے اترنے کی جگہ کی بنیاد ڈالی، یہ نیکی باقی رہے، اس لئے اس کی بنیاد کے سال کی تاریخ اس سے ظاہر ہوئی، جب میں نے کہا ''بود خیر باقی''۔

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ اس مسجد کو بابر کے ایک امیر باقی نے بنوایا ہے ''بفرمود شاہ بابر'' اور ''بمنشائے بابر'' سے یہ ظاہر ہے کہ بابر کے کہنے یا اس کی خواہش پر یہ بنوائی گئی، یا بابر کے زمانے میں بنی، اس لئے یہ الفاظ تعظیماً یا رسماً لکھ دئے گئے ہیں۔

## غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد کی تعمیر ناجائز

ان کتبات کی سند کو کسی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جاتا، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد رام جنم بھومی کو

مسمار کر کے بنائی گئی ہے، اگر یہ اسی طرح بنائی گئی ہوتی تو اس زمانہ میں بابر یا اس کے حاکم اپنے فاتحانہ غرور اور پندار میں ضرور لکھ دیتے کہ شرک وکفر کی ایک جگہ کو منہدم کر کے یہ مسجد تعمیر کی گئی، اور اس وقت یہ لکھنے سے کون ان کو روک سکتا تھا، بابر کی طرف فقہ بابری منسوب ہے، اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کسی غاصبانہ قبضہ کی زمین پر مسجد نہیں بنائی جاسکتی ہے، اور اگر ایسی کوئی مسجد بنی تو علماء اور مفتیانِ وقت اس میں نماز پڑھنے کا فتویٰ نہیں دے سکتے۔ اور اسلام کی گزشتہ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر کسی عبادت گاہ کے کسی حصہ کو بھی زبردستی حاصل کر کے مسجد میں شامل کیا گیا تو بعد میں وہ توڑ دیا گیا۔ بنو امیہ کے زمانے میں ولید بن عبدالملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لئے زمین کی کمی پڑی، اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی، انہوں نے یہ کہہ کر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو نہیں دے سکتے، زبردستی اگر لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہو جائے گا۔ ولید کو غصہ آ گیا، اور یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آ گیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلفائے راشدین کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انہوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے وہ فوراً منہدم کر دیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر از سرِ نو ہو۔ (خطبات شبلی، صفحہ 75-74)

## غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے ساتھ رسول ﷺ کی رواداری

ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب کوئی ملک یا علاقہ فتح ہوا اور وہاں کے لوگوں نے آپ ﷺ کی حکومت تسلیم کر لی، تو ان کو آپؐ برابر یہ حقوق دیتے رہے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کا سفر، ان کی عورتیں اللہ کی امانت اور اس کے رسولؐ کی ضمانت ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے اور ان کے کسی حق میں دست اندازی نہ کی جائے۔ اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدے سے نہ ہٹایا جائے، جو بھی کم یا زیادہ ان کے پاس ہے، اسی طرح رہے گا۔ اس کے زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہیں لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہیں لی جائے گی اور نہ اس سے عشر لیا جائے گا، اور نہ اسلامی فوجیں ان کی پامالی کریں گی، ان میں سے جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس

کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔

(فتوح البلدان بلاذری، صفحہ 76، مطبوعہ مصر، اور دین رحمت مطبوعہ دارالمصنفین صفحہ 338-337)

اسی پر صحابۂ کرام کا عمل رہا، اور اگر تعصب کی عینک اُتار کر ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی روایت سندھ میں محمد بن قاسمؒ کی آمد سے بہادر شاہ ظفرؒ تک رہی۔ اور اگر مسلمان حکمرانوں کا یہی مذہبی فریضہ ہوتا کہ وہ مندروں کو مسمار کریں، بتوں کو توڑ کر ہندوستان کی سرزمین کو ان چیزوں سے پاک کر دیں تو شاید یہاں اتنے لاکھوں، کروڑوں مندر نہ دکھائی دیتے جو قدیم زمانہ سے اب تک موجود ہیں۔ اگر اسلام کی مذکورہ بالا تعلیمات کی کہیں اور کسی زمانہ میں کسی سے خلاف ورزی ہوئی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے جرم کا ارتکاب ہوا۔

## بابر کی رواداری

بابر کے متعلق یہ بھی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے یہاں آتے ہی مندروں اور مورتیوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا، کیونکہ جس سال یہ مسجد بنی ہے اسی سال اس نے ہمایوں کے لئے یہ وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ رکھا تھا۔

> ''اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو اور ہر مذہب کے طریقہ کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تمام ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں اس سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق بلاؤ، جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے، تا کہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے''۔
>
> یکم جمادی الاولیٰ 935ھ (انڈیا ڈیوائڈڈ، صفحہ 39، تیسرا ایڈیشن)

یہ تحریر اسی سال کی ہے جس سال بابری مسجد بنائی گئی، اگر یہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کر کے بنائی جاتی تو وہ اپنے لڑکے ہمایوں کو یہ وصیت نامہ کیونکر لکھ سکتا۔

اس وصیت نامہ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ڈیوائڈڈ (India Divided) میں درج کر کے بابر کو مذہبی تعصب سے بالاتر تسلیم کیا ہے۔

## مورخین کی شہادت

اسی طرح پروفیسر سری رام شرما کی کتاب مغل امپائر آف انڈیا (Mughal Empire of India) کی جلد اوّل کے صفحہ 55-54 پر بھی بابر کا وصیت نامہ درج ہے، اسی لئے پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا اور کسی ہندو کی ایذاء رسانی کی، محض اس لئے کہ وہ ہندو ہے۔ (صفحہ 55، 1945ء ایڈیشن)

## بابر اور مندروں کا احترام

بابر کی تزک بابری کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تو ہندوؤں کے مندروں کا ذکر لطف لے لے کر کرتا تھا، مثلاً جب وہ گوالیار کے قلعہ میں پہنچا تو وہاں کے عالی شان بت خانہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالی شان بت خانہ ہے، سلطان شمس الدین التمش نے اس بت خانہ کے پہلو میں ایک مسجد بنائی ہے، یہ بت خانہ اتنا بلند ہے کہ قلعہ میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں، دھول پور کے پہاڑ پر سے گوالیار کا قلعہ اور بت خانہ خوب نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ اس بت خانہ کا سارا پتھر وہاں کے تالاب کو کھود کر حاصل کیا گیا ہے۔

(اردو ترجمہ صفحہ 332، انگریزی ترجمہ بابر نامہ، صفحہ 610)

اگر بابر چاہتا تو گوالیار کے اس عالیشان بت خانہ کی تعریف کرنے کے بجائے اس کو منہدم کر دیتا، اس کے لیے اس ملک کے مندر اور بت خانے بالکل نئی چیز تھیں، اس لیے ان کو شوق سے دیکھتا رہا۔

گوالیار کے بت خانہ کے پہلو میں سلطان شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی ایک مسجد سے یہ ظاہر ہے کہ التمش نے بھی اس کے بغل میں بت خانہ کو منہدم کرنا پسند نہیں کیا۔

بابر پھر اوروا کی طرف جاتا ہے تو لکھتا ہے کہ اس کے اطراف کے پہاڑ کا ایک ٹکڑا تراش کر

چھوٹے بڑے بتوں کی مورتیں بنائی گئی ہیں، اس کے جنوب میں ایک بڑے بت کی مورت ہے، جو تقریباً بیس گز کی ہوگی، ان سب بتوں کو ننگا بنایا ہے، ان کے ستر کو ڈھکا نہیں گیا ہے۔

(اردو ترجمہ صفحہ 333، بابر نامہ صفحہ 612-611)

بابر چاہتا تو ان برہنہ بتوں کو مسمار کر دیتا، مگر ان کو اسی طرح رہنے دیا، پھر گوالیار کے بت خانہ کی سیر کرنے کو گیا، تو لکھتا ہے کہ بت خانہ میں بعض جائے دُہرے اور بعض جائے تہرے دالان ہیں، مگر اگلی وضع کے نیچے نیچے، ان کے دروازہ کے پتھر میں مجسّم بت کندہ کیے ہوئے ہیں بت خانہ کے بعض ضلعے مدرسوں کی وضع کے ہیں، صدر مقام میں ایک بڑا اونچا برج ہے، جس کے حجرے ایسے ہیں جیسے مدرسوں کے حجرے ہوتے ہیں، ہر حجرے کے اوپر پتھر کی تراشی ہوئی چھوٹی چھوٹی برجیاں ہیں، حجروں میں نیچے کی جانب کے پتھروں میں بُت تراشے ہیں، ان مقاموں کی سیر کر کے گوالیار کے غربی دروازہ سے نکل کر قلعہ گوالیار کے جنوب میں ہوتا ہوا رحیم داد کے چار باغ میں جو ہتھیا پول دروازے کے سامنے ہے، آ کر ٹھہرا۔ (اردو ترجمہ صفحہ 334، انگریزی ترجمہ بابر نامہ، صفحہ 614-613)

بابر نے ان مندروں اور بت خانوں کو توڑنے کے بجائے وہاں سیر کر کے ان سے لطف لیا، اور اپنی تزک میں ان کی تفصیل قلمبند کر کے ان کو تاریخی اہمیت دے دی ہے البتہ اس کا اعلیٰ اور بلند جمالیاتی ذوق اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ چمن بندی کے حسن کو بھدّی مورتیوں سے ضائع کیا جائے، اروا کا ایک چمن اس کو بہت پسند آیا، اور اس سے بڑی دلچسپی لی، لیکن اس کے خیال میں اس کا بڑا عیب یہ تھا کہ اس میں طرح طرح کی مورتیاں بنائی گئی تھیں، چمن کی خوبصورتی کی خاطر ان کو وہاں سے برطرف کرا دیا۔ (اردو ترجمہ صفحہ 233، بابر نامہ، صفحہ 612)

جناب رام پرشاد کھوسلہ پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، انہوں نے 1934ء میں مغل کنگ شپ اینڈ نوبیلٹی لکھی، اس میں بابر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں ہے اور نہ یہ ثبوت ہے کہ اس نے کفار کا قتل عام ان کے مذہب کی وجہ سے کیا، وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بری تھا۔ (صفحہ 207)

## آئینِ اکبری میں اجودھیا کا ذکر

اس قضیہ کا اجودھیا سے تعلق ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ مغلوں کی تاریخ میں اجودھیا کا ذکر کیسے

آیا ہے، ابوالفضل نے اپنی آئینِ اکبری جلد دوم، حصہ دوم میں اجودھیا کا نام نہیں لیا ہے، لیکن اودھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اودھ ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہے، اس کا طول البلد 118 درجہ 6 دقیقہ ہے، اور عرض البلد 27 درجہ 22 دقیقہ ہے، قدیم زمانہ میں اس کی آبادی 148 کوس طول میں اور 46 کوس عرض میں پھیلی ہوئی تھی، اودھ ہندوستان کی بہت بڑی تیرتھ ہے، سوادِ شہر میں زمان کھونے سے سونا نکلتا ہے۔ یہ شہر راجہ رام چندر کا مسکن تھا، رام چندر تریتا دور کے ظاہری و باطنی ہر دو عالم کے پیشوا مانے جاتے ہیں، شہر کے ایک کوس کے فاصلہ پر دریائے گھاگھرا، دریائے سرجو سے مل گیا ہے، اور قلعہ کے پاس سے گزرتا ہے، شہر کے قریب دو قبریں ہیں۔ جو سات اور چھ گز لمبی ہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ یہ حضرت شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام پیغمبروں کے مزارات ہیں۔ ان قبروں کی بابت عجیب وغریب افسانے ہیں، بعض اشخاص کا بیان ہے کہ رتن پور میں کبیر داس کی قبر ہے، جو سکندر لودھی کے زمانہ میں تھا۔ کبیر کی بابت مشہور ہے کہ اس پر روحانیت کا غلبہ ہوا تھا اور یہ مذہبوں کی پابندیوں سے آزاد ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ کبیر داس کے اشعار ہندی زبان میں ہیں، جن سے ان کی حق شناسی اور فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(آئینِ اکبری جلد دوم، صفحہ 78، رتن پور میں کبیر کی قبر نہیں ہے۔)

## اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی

اس اقتباس میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ بابر نے رام چندر جی کی جنم بھومی کے مندر کو توڑ کر ایک مسجد بنائی، اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ بابر کے زمانہ سے پہلے اجودھیا میں مسلمانوں کی آبادی ہو چکی تھی۔

اوپر آئینِ اکبری کے اقتباس سے ظاہر ہوا ہوگا کہ یہاں عام روایت کے مطابق حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کی قبریں بھی ہیں، ان کی اصلیت سے صرف نظر کرنے کے باوجود مسلمانوں کو اس جگہ سے جذباتی لگاؤ رہا۔ حضرت شیثؑ کی قبر کے احاطہ میں بہت سے بزرگانِ دین مدفون ہیں، یہاں سالار غازیؒ کے مجاہدین کی قبریں بھی ہیں۔ یہاں بخشی باباؒ، حضرت لعل شاہ باز قلندرؒ، حضرت سید علاؤ الدین خراسانی، حضرت جمال الدین قاضی قدوہؒ، حضرت سلطان موسیٰ عاشقانؒ، اور پیر کشادی کے جو مزارات ہیں ان کے حالات پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگانِ دین بابر سے پہلے اجودھیا

آ کر سکونت پذیر ہو چکے تھے، اور ان سے لوگ فیوض و برکات حاصل کرتے رہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا آبائی مکان اجودھیا ہی میں تھا، اور ان کی جائے پیدائش اجودھیا ہی میں بتائی جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے نام کے ساتھ اودھی لکھا جاتا ہے، وہ نسبتاً سادات حسینی میں سے تھے، اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اجودھیا میں اُس وقت سادات بس چکے تھے، ان مسلمانوں کے لئے ایک بلکہ ایک سے زیادہ مسجدیں بنائی گئیں تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

اب اس تنازعہ کو ذرا مقدمہ کی مثل کے ذریعہ سے ناظرین سمجھیں، پہلے ہم مقدمہ کی درخواستیں نقل کریں گے، پھر ان پر تبصرہ کریں گے، تاکہ صورت حال کی وضاحت ہو۔

## 1858ء کے مقدمہ کی ایک درخواست

نقل درخواست محمد اصغر، خطیب و مؤذن مورخہ 30/نومبر 1858ء مجریہ نمبر 884 محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا، عرضی ...دوبارہ کھڑا کرنے نشان در مسجد جنم استھان منعقدہ 15/دسمبر 1858ء

غریب پرور! سلامت، جناب عالی! سانحہ جدید سرزد ہوا ہے کہ مسمّیٰ بیگ سنگھ... ملازم سرکار دولت مدار با عوری بیراگیان جنم استھان کا بانیٔ فساد ہے، بیچ مسجد بابری واقع اودھ قریب محراب و منبر کے ایک چبوترہ مٹی کا بلندی چہار انگشت بنا کی... مامور کرکے... آتش کے مصروفیات ہے، چبوترہ مسجد اندر کٹہرہ اوپر چبوترہ کے چبوترہ جدید... مدد موقوف ہوئی ہے، بہ بلندی تقریباً سوا گز کا تیار کرکے نشان و تصویر بت استادہ کیا ہے، و برابر اس کے ایک گڑھا کھود کر منڈیر پختہ کروا اس کی تیار کرکے، آتش روشن کی ہے، پوجا دہوم میں مصروف ہیں، وجا بجا مسجد میں کوئلہ سے رام رام لکھا ہے، عادل رعایا یہ مقام انصاف کا ہے کہ صریح ظلم و زیادتی اہل ہنود اہل اسلام پر کرتے ہیں، وحضور پالک فریقین کے ہیں، مضمون... سے ہی صاف مترشح ہے کہ مذہب پر کوئی فریق تعرض نہ کرے... مبادرت کرنے گا تو سرکار سے سزایاب ہوگا۔

جناب عالی! مقام غور کا ہے، مسجد مقام عبادات مسلمانان ہے کہ بخلاف اس کے کچھ ہنود کی سابق میں قبل بلوہ عملداری سرکار مقام جنم استھان کا صدہا برس سے پریشان پڑا رہتا تھا اہل ہنود پوجا کرتے تھے، چبوترہ بہ سازش بنی غلام تھانہ دار اودھ کے بیراگیوں نے شبا شب میں تا صدر و رحکم سرکار کے واسطے مخالفت کے نافذ ہوا تھا، بہ بلندی ایک بالشت تیار کرا لیا، اس وقت جناب ڈپٹی کمشنر

بہادر کے بموجب حکم جناب کمشنر نے تھانہ دار کو موقوف کیا، و بیراگی پر جرمانہ بکی ہوا، اب فی الحال روشن چبوترہ کو ہی تخمیناً سوا گز تیار کرالیا ہے، اس صورت صریح زیادتی ثابت ہے، لہٰذا امیدوار ہوں کہ بنام مرتضیٰ خان کوتوال شہر صدور حکم ہووے کہ کوتوال بچشم خود معاینہ کرکے امورات جدید کھدوا ڈالیں و مرد مان ہنود کو بیرون مسجد کے کریں، واجب جان کر عرض کیا۔ بندہ محمد

خطیب و مؤذن مسجد بابری واقع اودھ مورخہ 30/نومبر 1858ء

(نوٹ اصل کاغذ جا بجا پھٹ گیا ہے)

## تبصرہ (Comment)

اس درخواست میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بیراگیوں میں سے ایک نے مسجد کے اندر محراب و منبر کے پاس مٹی کا ایک چبوترہ بنالیا ہے، اس کے برابر ایک گڈھا کھود کر پختہ منڈیر بھی تعمیر کر لی ہے، اور اس پر آگ روشن کر کے پوجا اور ہون کیا جاتا ہے، مسجد میں کوئلہ سے رام رام لکھ دیا گیا ہے، اس کی دادرسی طلب کی جاتی ہے، پھر اس درخواست میں یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ مسجد کے ملحق جنم استھان سیکڑوں برس سے خالی پڑا تھا، اور وہیں آکر ہندو پوجا کرتے تھے، لیکن بیراگیوں نے تھانیدار کی سازش سے وہاں پر ایک چبوترہ بنا لیا تھا، ڈپٹی کمشنر نے اس سلسلہ میں تھانیدار کو موقوف کیا اور بیراگیوں پر جرمانہ کیا مگر چبوترہ توڑا نہیں گیا بلکہ ایسا ہی رہنے دیا گیا، جس کے بعد اس کو بیراگیوں نے اور بڑھالیا، اس سے ظاہر ہے کہ جنم استھان کی جائے وقوع مسجد سے باہر تھی جہاں مسجد بنی ہے، وہ جگہ نہ تھی، اس مقدمہ میں جو فیصلہ ہوا وہ تو نہ مل سکا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے اندر جو چبوترہ بنا لیا گیا تھا وہ عدالت کے حکم سے منہدم کرا دیا گیا، کیونکہ آگے 1860ء میں جو درخواست خطیب اور مؤذن کی طرف سے دی گئی، اس میں مسجد کے اندر چبوترہ کا ذکر نہیں۔

## مسجد کا رجسٹریشن 1860ء

اس جھگڑے کی وجہ سے احتیاطاً 1860ء میں یہ مسجد باضابطہ رجسٹرڈ کرالی گئی، اور 1860ء کے مثل بندر جسٹرار کے یہاں یہ بابری مسجد کی حیثیت سے درج ہے۔

اس کے بعد 1860ء میں میر رجب علی خطیب بابری مسجد کی طرف سے نومبر 1860ء میں ایک

درخواست پڑی جس کی نقل ذیل میں درج ہے:

## 1860ء کے مقدمہ کی ایک درخواست

نقل درخواست میر رجب علی خطیب مسجد بابری مورخہ یکم نومبر 1860ء نمبر 115 محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا، میر رجب علی بہ نام اقبال سنگھ

مورخہ 9 مارچ 1861ء، میر رجب علی مسجد بابری ساکن اودھ

غریب پرور سلامت! عرضی ہذا جو چبوترہ نیا قریب مسجد بابری اقبال سنگھ...... کے بعد ملاحظہ مضمون......

واقع اودھ مدعیٰ علیہ نے بنایا ہے، بعد تحقیقات منہدم فرمایا جائے، و نیز مچلکہ مدعیٰ علیہ سے عدم مزاحمت واسطے دادرسی...... حلف لے لیا جائے، فقط مدعی...... مدعا علیہ کا مگر پاس حضور میں گذارش کروں کہ عرصہ قریب بیس روز کے ہوئے مدعیٰ علیہ نے ایک چبوترہ از راہِ زبردستی و خلاف عمل درآمد...... ملحقہ مسجد بابری میں پاس قبر قاضی قدوہ مرحوم کے بنالیا ہے، و ہر روز چبوترہ بڑھاتا جاتا ہے، حالانکہ اس کو منع کیا جاتا ہے، مگر کسی طرح باز نہیں آتا، بلکہ آمادۂ ہنگامہ و تکرار ہوتا ہے، فدوی بخوف سرکار طرح دیتا ہے، سابقاً عرصہ قریب ڈیڑھ برس کے ہوا ہوگا کہ ہری داس مہنت ہنومان گڑھی نے زبردستی مکان بنانا چاہا تھا کہ وہ مقدمہ دائر عدالت ہو کر ڈگری بحق ہم مدعی صادر ہوئی، و فیصلہ ضلع تا محکمہ عالیہ کمشنری بحال رہا، بلکہ مچلکہ عدم مزاحمت ہری داس مذکور سے کیا گیا، کہ وہ مثل سررشتہ میں موجود ہے، و بعہد ڈپٹی کمشنر جناب...... فورڈ صاحب بہادر مدعیٰ علیہ مذکور نے جھنڈا واسطے برپا ہونے نزاع کے قریب مسجد کے یعنی صحن میں نشست کیا تھا، کہ جناب صاحب محتشم بعد ملاحظہ جھنڈا نصب ساختہ مدعیٰ علیہ اُکھڑوا ڈالا، نیز فہمائش فرمایا تھا، لیکن...... مدعی علیہ از راہ عدول حکمی سرکار مرتکب امر ہوا ہے، اور ورثائے قبرستان...... بہت پریشان ہیں، علاوہ اس کے جب موذن مسجد میں اذان دیتا ہے تو وہ ناقوس یعنی سنکھ بجاتا ہے، تو عالی جناب! ایسا کبھی نہیں ہوا، اور سرکار حاکم دونوں فریق کے ہیں، لہٰذا درخوست ہذا حضور میں گذار کر امیدوار ہوں کہ مدعیٰ علیہ کو حرکت بیجا سے باز رکھا جائے، بعد تحقیقات چبوترہ، جدید تعمیر ساختہ مدعیٰ علیہ کہ جو کبھی وہاں نہ تھا، نیا

بنا لیا ہے، منہدم فرمایا جاوے، و نیز مقدمہ محلکہ سے عدم مزاحمت دی جائے، سنکھ وقت اذان مدعیٰ علیہ سے لے لیا جائے، ہم غریب مدعیٰ علیہ سے نجات پائیں، واجب جان کر عرض کیا،
میر رجب علی خطیب مسجد بابری مسجد واقع اودھ ساکن اودھ مورخہ یکم نومبر 1860ء

تبصرہ (Comment)

اس درخواست سے ظاہر ہے کہ اقبال سنگھ مدعا علیہ نے مسجد سے ملحق ایک چبوترہ بنالیا ہے، اور اس کو بڑھاتا جاتا ہے، اس کو عدالت سے روکے جانے کی درخواست کی گئی ہے، پھر اس میں یہ بھی ہے کہ ہنومان گڑھی کا مہنت ہری داس مسجد کے پاس ایک مکان بنانا چاہتا تھا، مگر سرکاری حکم سے اس کو روکا گیا، اس درخواست میں یہ بھی ہے کہ مسجد کے اندر ایک جھنڈا لہرایا گیا، لیکن سرکاری حکم سے یہ بھی اکھڑوا دیا گیا، اس سے ظاہر ہے کہ مسجد کو مسلمانوں کی مسجد تسلیم کر کے یہ جھنڈا وہاں سے اُکھڑوایا گیا اس درخواست میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب مسجد میں مؤذن اذان دیتا ہے تو اس وقت سنکھ بجایا جاتا ہے، جو پہلے کبھی نہیں بجایا جاتا تھا، درخواست میں التجا کی گئی ہے کہ چبوترہ وہاں نہ بننے دیا جائے، اور اذان کے وقت سنکھ بجانے سے روک دیا جائے، اس کے بعد معاملہ کی تفتیش کرائی گئی، اس رپورٹ کی نقل حسب ذیل ہے:

## 1860ء کے مقدمہ کی ایک رپورٹ

نقل رپورٹ مورخہ 19 ردسمبر 1860ء مقدمہ مثل نمبر 115 موقع محلہ کوٹ رام چندر اجودھیا میر رجب علی بنام اقبال سنگھ مفصلہ 18 رمارچ 1861ء

تعمیل حکم لہٰذا کریں کہ مسکن اقبال سنگھ مدعیٰ علیہ پر جا کر معاینہ کیا تو ایک کٹیا کے جس میں مدعیٰ علیہ رہتا ہے، بنی ہوئی ہے، اور آج کل کوئی جدید چبوترہ اس نے نہیں بنایا، اور اقبال سنگھ مذکور کو فہمایش کر دی گئی ہے کہ اب تا صدور حکم ثانی جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر اب بنیاد جدید نہ ڈالیں، نہ چبوترہ بڑھائیں، اور چوکی داران محلّہ کو تاکید کر دی ہے کہ اگر اب آئندہ یہ مدعیٰ علیہ چبوترہ وغیرہ جدید بناوے تو تھانے پر اطلاع کر کے بحضور بندگان۔۔۔۔ گزارش کیا جاوے اور وہ کٹیا جس میں مدعا علیہ رہتا ہے چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے اور مضمون پروانہ کا یہ ہے کہ اگر مدعا علیہ ہر روز بڑھاتا ہو یا اور بنیاد جدید چبوترہ پر ڈالے ہو تو بنانے سے باز رکھ کر اُٹھا دیوے، صاف کر دیوے۔

مدعا علیہ اب اگر جدید چبوترہ کی بنیاد ڈالے اور بڑھاوے تب مدعا علیہ کو اُٹھا دیوے یا جیسے کہ مدعا علیہ اپنی کٹیا میں جو چار مہینہ کی بنی ہوئی ہے، اور رہتا ہے اس میں سے اُٹھادیں، جیسا ارشاد ہو، اس موافق تعمیل ہو، رپورٹ ہٰذا ارسال حضور ہے، مورخہ 19 رو سمبر 1860ء

## 1861ء کے ایک حکم نامہ کی نقل

نقل امور احکام 7/ 1861ء 15/ مارچ 1860ء

آج پیش ہو کر حکم ہوا کہ تھانیدار کو لکھا جائے کہ پہلے دریافت کریں کہ جو کٹیا چار مہینہ سے مدعا علیہ نے بنایا ہے وہ اجازت سرکار سے حاصل کر کے بنایا ہے یا نہیں، اور اگر کوئی اجازت سے نہیں بنائی گئی تو کٹیا اُٹھوادیں۔ المرقوم 7/ فروری 1861ء

### تبصرہ (Comment)

تفتیش کے دوران یہ رپورٹ دی گئی کہ مدعیٰ علیہ نے کوئی نیا چبوترہ نہیں بنایا ہے، اور نہ اُس میں اضافہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چبوترہ پہلے بنایا گیا تھا، وہی برقرار ہے، اس کو کہہ دیا گیا ہے کہ سرکارِ حکم کے بغیر کوئی اضافہ کیا گیا تو اس کو وہاں سے ہٹا دیا جائے گا، محلّہ کے چوکیداروں کو بھی اس کی تاکید کی گئی کہ یہ کٹیا جو چار مہینوں کی بنی ہوئی ہے اس کے لیے حکم کیا گیا کہ اس میں اضافہ نہ ہونے پائے، اور اگر اس میں اضافہ کیا جائے تو مدعیٰ علیہ کو ہٹا دیا جائے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابری مسجد کو مسجد تسلیم کر کے یہ حکم جاری کیا گیا، کیونکہ چبوترہ اور کٹیا سے جھگڑا پیدا ہونے کا احتمال تھا، پھر ایک جھگڑا مسجد کی دیوار اور پھاٹک کیلئے ہوا، اس سلسلہ میں حسب ذیل درخواست کورٹ میں دی گئی۔

## 1870-1877 کے مقدمہ کی ایک درخواست

نقل درخواست محمد اصغر 1870ء رگھوبیر منعقدہ 22/ جنوری 1884ء محمد اصغر خطیب و مؤذن مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ

در جواب صدور حکم جائے دروازہ متعلق سائل... تیار کیا ہے تو اس کا... سائل... نامنظوری دے دیا جائے... دروازہ سے متعلق نہیں ہے۔

عادل زمان، غریب پرور سلامت... مسجد بابری واقع جنم استھان اودھ میں حکم... دروازہ جدید جانب اتر... تیار ہو رہا ہے... دیوار اس کی شکست کروا دی گئی ہے، اب بہ نظر چالا کی کے... دکھن منھ چبوترہ واسطے قائم کرنے ملکیت اسی دیوار مسجد کی طرح تیار کی... پاس ہے،... منصب خاندانی سائل ... خلاف عمل درآمد قائم ہوئی ہے، کیونکہ لکھیم داس مہنت و دیگر مہنتان ماسبق کو سوائے چبوترہ کے دوسرے میں مداخلت نہیں ہے، دیوار احاطہ مسجد کی ہے، کچھ چبوترہ کی نہیں ہے، اس میں اکثر احکام عدالت ہیں کہ کوئی امر جدید نہ ہونے پائے، اس صورت میں مدعی علیہ کو حکم ہوئے کہ وہ کنارہ کش دروازہ کے ہوویں، وسائل کو اجازت موجود ہووے کہ دروازہ و کنجی و دروازہ پاس سائل کے رہے کہ وقت کثرت میلہ آمد و رفت دروازہ کھول دیا کریں، واگر ضرورت جانیں تو سائل سے دلوایا جائے ورنہ... سے دیا جائے، تاکہ باعث رفع تکرار کا ہو جائے، لیکن کنجی متعلق سائل سے رہے، مہنت سے نہ رہے، واجب جان کر عرض کیا۔

فدوی سید محمد اصغر خطیب و متولی مسجد بابری واقع اودھ مورخہ 3/ اپریل 1877ء

## تبصرہ (Comment)

اس درخواست سے معلوم ہوتا ہے کہ مہنتوں نے کوشش کی کہ مسجد کی ایک دیوار کو توڑ کر اپنی ایک دیوار بنالیں، اور اس میں ایک دروازہ لگا دیں، کیونکہ میلے کے موقع پر پورب سے آنے جانے میں مزاحمت کا اندیشہ ہے، اس لیے مسجد کے اتر طرف ایک دروازہ بنالیں، اس کے بنانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ چبوترہ مہنتوں کی ملکیت میں آ جائے، مسجد کے خطیب اور مؤذن کی طرف سے یہ درخواست پڑی کہ یہ دیوار مسجد کی ہے، مہنتوں کا اس پر کوئی حق نہیں، انہوں نے اس کی پیش کش کی کہ دروازہ مسجد کا ہو اور اس کی کنجی مسجد کے خطیب کے پاس رہے، میلہ کے موقع پر وہ دروازہ کھول دیا کرے گا، تاکہ کوئی تکرار نہ ہو، اس پر جو حکم نامہ صادر ہوا وہ نہیں مل سکا، یہ درخواست بہ ظاہر 1870ء کی معلوم ہوتی ہے۔

## پی کارنیگی کی رپورٹ 1870

اس مقدمہ بازی کے درمیان انگریزوں کی سامراجی حکومت قائم ہو کر مضبوط ہو چکی تھی، ان کو اب موقع تھا کہ ہندوستان میں باہمی نفرت پیدا کرنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی تدبیریں اختیار کریں،

انہوں نے اجودھیا میں مسجد اور مندر کا جھگڑا کھڑا کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے دور کر ہی دیا تھا، اب بابری مسجد اور جنم استھان کا قضیہ جاری تھا، اس کو اور ہوا دینا تھا، جنم استھان کو مسمار کرنے کا کوئی تاریخی ثبوت ہندو اور نہ انگریز پیش کر سکے تھے، انگریزوں کو تحریری ثبوت پیش کرنے کی فکر ہوئی۔ 1870ء میں فیض آباد تحصیل کا بندوبست ہونے لگا۔ تو اس کے سٹلمنٹ افسر اور قائم مقام ڈپٹی کمشنر پی۔کارنیگی نے ایک رپورٹ پیش کی، جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

''مقامی طور سے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حملہ کے وقت یہاں تین اہم مندر تھے، جن میں تھوڑے سے پجاری رہتے تھے اجودھیا اس وقت ویران ہو چکا تھا، تین مندر یہ تھے: جنم استھان، سورگ دوار مندر (جو رام دربار بھی کہلاتا تھا) اور تیرتا کا ٹھاکر جنم استھان وہ جگہ ہے جہاں رام چندر پیدا ہوئے۔ سورگ دوار وہ پھاٹک ہے جس سے وہ بیکنٹھ میں گئے، ممکن ہے کہ یہ وہ جگہ ہو جہاں وہ جلائے گئے، تریتا کا ٹھاکر وہ مقام ہے جہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی، اس کی یاد میں یہاں اپنی تین مورتیاں اور سیتا کی ایک مورتی رکھوائیں، بابر کی تزک کے لیڈن کے نسخہ کے مطابق یہ شہنشاہ سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر جو اجودھیا سے دو یا تین کوس پر ہے۔ 28/مارچ 1528ء میں قیام پذیر ہوا۔ وہ یہاں ایک شکارگاہ کا ذکر کرتا ہے، جو اودھ سے سات آٹھ کوس پر سرجو کے ساحل پر تھی، یہ بات قابل توجہ ہے کہ بابر کی تزک کے جتنے نسخے ہیں ان میں اجودھیا میں بابر کے آنے کا ذکر نہیں، اس کے وہ اوراق مفقود ہیں، بابری مسجد میں دو جگہوں پر وہ تاریخ لکھی ہے، جب یہ بنائی گئی، یہ 925 ہجری مطابق 1528ء ہے، یہ پتھر پر کھدی ہوئی ہے، اس کے کتبے میں بابر کی شان و شوکت کا ذکر ہے، جنم استھان ہنومان گڑھی سے چند سو قدم کے فاصلہ پر ہے، 1855ء میں ہندو مسلمان دونوں میں سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا، لیکن مسلمانوں نے جنم استھان پر تسلط کر لیا، مسلمان ہنومان گڑھی کے زینہ تک ضرور پہونچے، مگر وہ کافی نقصان کے ساتھ نیچے ڈھکیل دیے گئے، ہندوؤں نے کامیابی کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، تیسری بار جنم استھان پر قبضہ کر لیا جس کے پھاٹک پر پچھتر مسلمان مارے گئے، اور وہ گنج شہیداں میں دفن کیے گئے، بادشاہ کے کئی فوجی دستے اس سانحہ کو صرف دیکھتے رہے، ان کو حکم تھا کہ وہ مداخلت نہ کریں، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اس مسجد مندر میں عبادت اور پوجا کرتے رہتے تھے، برطانوی حکومت کے زمانہ سے بیچ میں سلاخیں ڈال دی گئیں، تاکہ جھگڑا نہ ہو، مسجد میں مسلمان

نماز پڑھیں، سلاخوں سے باہر ہندو اس چبوترہ پر پوجا کریں، جو انہوں نے تعمیر کیا ہے۔
(ترجمہ از: اقتباس انگریزی، شائع کردہ مسلم انڈیا انگریزی، مارچ 1986ء صفحہ 119)

## رام جنم استھان کا چبوترہ

یہ چبوترہ کب بنا، اس کی صحیح تاریخ کسی مستند تاریخ سے نہیں بتائی جا سکتی ہے، پانیر (Pioneer) اخبار لکھنؤ مورخہ 11-10 رجنوری 1986ء میں اس کے ایک کالم نگار نے لکھا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ہندو اس جگہ پر بیس مرتبہ حملہ آور ہوئے تو اس نے راجہ ٹوڈرمل اور بیربل کو اجودھیا بھیجا، دونوں نے وہاں کے مہنتوں سے گفتگو کی، اور اس پر سمجھوتہ ہوا کہ مسجد کے بائیں جانب ایک چبوترہ رام مندر کے نام سے بنایا جائے تاکہ ہندو وہاں آ کر پوجا اور درشن کر سکیں۔ کالم نگار نے اس کا حوالہ اکبر کے زمانہ کی ایک کتاب 'دیوانِ اکبری' کا دیا ہے۔ ایسی کوئی کتاب اس زمانہ میں نہیں لکھی گئی اور اگر اس سے مراد 'آئینِ اکبری' ہے تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی روایت نہیں، یہ محض من گھڑت واقعہ ہے، اگر آئینِ اکبری میں ایسی کوئی بات لکھی ہوتی تو انگریز مورخین اور اہلِ قلم اس سے پورا فائدہ اُٹھا کر اس فتنہ کو آگے بڑھاتے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نواب واجد علی شاہ کے زمانہ میں انگریزوں نے ایک بدھسٹ نجومی کو ایک بات کے لئے تیار کیا کہ وہ ایک زائچہ کے ذریعہ سے جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر کو بابری مسجد کے اندر دکھائے اور ہندو ان جگہوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں، واجد علی شاہ کا وزیر نقی علی خاں انگریزوں کا ایجنٹ تھا اس نے واجد علی شاہ کو اس پر راضی کر لیا کہ حدودِ مسجد سے باہر رام جنم استھان اور سیتا رسوئی گھر کے لئے جگہ دے دی جائے۔ چنانچہ مسجد کے مسقف حصہ کے بالمقابل دائیں سمت احاطہ سے متصل سیتا رسوئی کے لئے اور صحن مسجد سے باہر بائیں پورب کی طرف جنم استھان کے طور پر 21 فٹ لمبی اور 17 فٹ چوڑی جگہ دے دی گئی، جس پر ایک بالشت چبوترہ بنانے کی اجازت تھی۔ اس موقعہ پر مسجد کے صحن کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دیا گیا۔ جواب تک کھلا ہوا تھا۔

(بحوالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ، اپریل 1986ء)

یہ روایت کسی مستند معاصر تاریخ میں نظر سے نہیں گزری، مگر مسجد کو لوہے کی سلاخوں سے گھیر دینے کی روایت تو قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ 112 میں ہے، اور اسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

یہ مسجد سیتا رسوئی گھر کے پاس بنی اور جمہور اس کو سیتا رسوئی کی مسجد بھی کہتے ہیں۔ (جلد2، صفحہ 117)

مگر یہ بات ذرا مشکوک ہے کہ واجد علی شاہ نے مسجد کے باہر چبوترہ بنانے کی اجازت دی، کیونکہ 1858ء میں بابری مسجد کے خطیب اور موذن کی طرف سے جو مقدمہ دائر ہوا ہے، اس کی درخواست میں درج ہے کہ مقام جنم استھان صدہا برس سے پریشان یعنی خالی پڑا رہتا تھا اور وہیں ہندو آ کر پوجا کرتے تھے، مگر انہوں نے ''شباشب'' ایک چبوترہ تھانیدار کی سازش سے بنا لیا۔ تو اس کو منہدم کر دینے کی درخواست دی گئی، لیکن یہ منہدم نہیں کیا گیا، مہنت امتناعی احکام کے باوجود اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہے۔

1885ء کے مقدمہ کے فیصلہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں خاموش ہو گئے، اور بابری مسجد کے لئے کوئی مزید جھگڑا نہیں ہوا۔ مسلمان اس میں نمازیں ادا کرتے رہے، جس کے معنی یہ تھے کہ ہندوؤں نے بھی تسلیم کر لیا کہ یہ مسجد ہے اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا حق ہے، مگر انگریز اس تنازعہ کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، اس لئے اپنی کسی نہ کسی تحریر میں ہندوؤں کو یہ لکھ کر مشتعل کرتے رہے کہ بابری مسجد، رام بھومی کی جگہ پر بنائی گئی جس کی ایک مثال 1905ء کا فیض آباد گزیٹیر ہے۔

## 1905 کا فیض آباد گزیٹیر

1905ء میں ایچ.آر. نیویل نے فیض آباد گزیٹیر مرتب کیا تو پہلے اس کے صفحہ 153 پر لکھا:

''1528ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی جہاں رام پیدا ہوئے تھے''۔

پھر اس کے بعد صفحہ 172 پر یہ تحریر کیا:

''ساتویں صدی سے ایک طویل مدت کے لئے یہ جگہ یعنی اجودھیا تقریباً ویران ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہو گئی، کیونکہ انہوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنا لیا، لیکن ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے، یہ بات اس سے ظاہر ہے کہ بابر اور اورنگ زیب نے اس کی بے حرمتی کی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں۔

پھر وہ صفحہ 174-173 پر لکھتے ہیں:

''یہ زبانی روایت سے یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ میں اجودھیا میں تین اہم ہندو عبادت گاہیں تھیں، چھوٹی چھوٹی بھی رہیں، یہ تین جگہیں رام جنم استھان مندر، سورگ دوار اور ترتیا کا ٹھاکر تھیں، ان میں سے ہر ایک پر مختلف مسلمان حکمرانوں کی نظر رہی، جنم استھان رام کوٹ میں تھا، یہ رام کی پیدائش کی جگہ بتائی جاتی ہے، 1528ء میں بابر اجودھیا آیا، اور یہاں ایک ہفتہ ٹھہرا، اسی نے یہاں ایک پرانے مندر کو منہدم کیا اور اس کی جائے وقوع پر ایک مسجد بنائی، جو بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے، اس میں پرانی عمارت کے زیادہ تر سامان لگائے گئے، اس کے بہت سے ستون اچھی حالت میں ہیں وہ Close Graind کالے پتھر ہیں، جن کو وہاں کے لوگ کسوٹی کہتے ہیں، ان پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، ان کی لمبائی سات سے آٹھ فٹ تک ہے، نیچے بیچ میں کیپٹل میں چوکور ہے، بقیہ حصہ یا تو گول یا ہشت پہل ہے، مسجد میں دو کتبے ہیں، ایک تو باہر ہے جو اب تک دیکھا جا سکتا ہے، اور دوسرا منبر کے پاس ہے۔ دونوں کتبات فارسی میں ہیں، ان میں 935 ہجری درج ہے۔ ان کتبات کے مستند ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا کوئی ذکر نہیں، یہ واقعہ تقریباً اس وقت کا ہے جب وہ اپنی فوج لے کر بہار کی مہم پر جا رہا تھا۔''

''اس شہر کی مقدس ترین جگہ کی بے حرمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی تلخی رہی، کئی موقعہ پر مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد انہوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کئے، وہ اس کے زینے تک پہنچ گئے، لیکن وہ کافی نقصان کے ساتھ پیچھے ڈھکیل دیئے گئے، پھر ہندوؤں نے جوابی حملہ کیا اور جنم استھان پر قبضہ کر لیا، جس کے پھاٹک پر 75 مسلمان مارے گئے، اور جہاں دفن کئے گئے وہ شہیداں کہلایا۔ شاہ (اودھ) کی فوج کے کئی دستے اس وقت موجود تھے، لیکن ان کو مداخلت کرنے کا حکم نہ تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد امیٹھی کے امیر علی نے لکھنؤ میں باضابطہ حملہ کی تنظیم کی، تاکہ وہ ہنومان گڑھی کو برباد کر دیں، لیکن ان کو اور ان کی فوج کو بارہ بنکی میں روکا گیا، یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک ہندو اور مسلمان دونوں اسی عمارت میں عبادت اور پوجا کیا کرتے تھے، لیکن غدر کے بعد سے مسجد کے باہر ایک بیرونی احاطہ بنا دیا گیا، اور ان کو اندرونی احاطہ میں جانے سے منع کر دیا گیا، اور ان سے اس چبوترہ پر پوجا کرنے کو کہا گیا، جو انہوں نے بیرونی احاطہ میں بنا لیا تھا۔''

تبصرہ (Comment)

ایچ آر. نیویل نے اپنے اس گزیٹیر میں وہی باتیں دُہرادی ہیں جو 1870ء میں سٹلمنٹ افسر کی رپورٹ اور 1870ء کے گزیٹیر میں لکھی گئی تھیں۔ سطروں کی سطریں بجنسہٖ ان سے لے لی گئی ہیں، البتہ ان میں جو بعض باتیں قیاساً کہی گئی تھیں، نیویل نے ان کو پورے وثوق کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ لکھتا ہے کہ 1528ء میں بابر نے اس روایتی جگہ پر اجودھیا میں مسجد بنائی۔ جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے۔ پھر یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں بابر کے اجودھیا آنے کا ذکر نہیں۔ شاید اس کو اپنی ان متضاد تحریروں کا احساس نہیں رہا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''ساتویں صدی سے ایک مدت کے لئے اجودھیا ویران رہا''۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اس کی اہمیت پھر ہوگئی، کیونکہ انہوں نے اس کو ایک بڑے صوبہ کی راجدھانی بنائی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ ساتویں صدی کے بعد ہندو اس شہر کو مقدس نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے یہ ویران ہوتا چلا گیا، لیکن نیویل کو خیال ہوا کہ اگر اس کو مقدس جگہ قرار نہ دیا جائے گا تو پھر اس کی قوم کا سامراجی کھیل ہی بگڑ جائے گا، اس لئے وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ہندو اس کو مقدس جگہ سمجھتے رہے، اور اس کی کیا خوب وجہ بتائی ہے کہ وہ اس کو مقدس سمجھتے تھے اس لئے بابر اور اورنگ زیب نے اس کی بے حرمتی کی، اور پھر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہاں کے مسلمان حاکم کی موجودگی اور اس کے دربار کی وجہ سے ہندوؤں کی مقدس جگہیں پس پشت پڑ گئیں، یہ جگہ 1205ء کے بعد ہی سے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئی تھیں، تو پھر اسی کے بعد ہی سے ہندوؤں نے یہاں کی مقدس جگہوں کو پس پشت ڈال دیا، اس کے تو یہ معنی ہیں کہ انگریزوں ہی نے اس جگہ کے تقدس کا احساس ان کو دلایا، تاکہ وہ یہاں کی مسجدوں اور مندروں کا تنازع شروع کریں۔ وہ اجودھیا کے تین مندروں یعنی رام جنم استھان، سورگ دوراء اور ترتیا کا ٹھاکر کے وجود کا ذکر محض زبانی روایتوں کے سہارے کرتا ہے، گو اس نے زبانی روایتیں بھی حاصل کرنے کی خود تکلیف گوارا نہیں کی، بلکہ 1870ء میں کارنیگی کی رپورٹ اور 1877ء کے گزیٹیر میں جو کچھ لکھا گیا تھا، اسی کو دہرایا ہے، مگر ان باتوں کو دہرانے میں اس کے بیان میں اختلاف ہے۔ 1855ء کے جھگڑے کے سلسلہ میں 1870ء کے گزیٹیر میں ہے کہ ہندوؤں نے زبردستی ہنومان گڑھی پر قبضہ کرلیا مسلمان اس موقعہ پر ہنومان گڑھی کے زینہ تک پہنچ گئے۔

نیویل نے اپنے گزیٹیر میں لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں نے زبردستی جنم استھان پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد انہوں نے ہنومان گڑھی پر زبردست حملے کئے۔''

اس کو فروعی اختلاف کہا جا سکتا ہے، لیکن جب نیویل یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے جنم استھان پر زبردستی قبضہ کر لیا تو یہ جنم استھان کون سا تھا؟ کارنیگی اور 1870ء کے گزیٹیر کے مرتب ہندوؤں کو خوش کرنے اور ان کو ورغلانے کے لئے بابری مسجد کو جنم استھان ہی کہتے ہیں۔ نیویل نے بھی ہندوؤں کو اپنی تحریر میں خوش کرنے کے لئے بابری مسجد کو جنم استھان کہا ہے، اس پر زبردستی قبضہ کرنے کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی مسجد تھی، اس لئے شاہ غلام حسین اور مولوی امیر علی نے اسی مسجد کو اپنا مورچہ بنایا۔ اور اسی کے اندر اور باہر مقابلہ کر کے جاں بحق ہوئے، اس گزیٹیر میں وہ جھوٹ بھی دہرایا گیا ہے جو کارنیگی نے اپنی 1870ء کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ شاہ کی فوج کے دستے نے کوئی مداخلت نہیں کی، اور ہندو اور مسلمان دونوں مسجد میں پوجا اور عبادت کرتے آئے تھے۔

## مسز اے. ایس بیورج کی شر انگیزی

مسز اے. ایس. بیورج نے انگریزی میں تزک بابری کا ترجمہ کر کے اس کو بابر نامہ سے 1922 میں شائع کیا۔ اس میں تعلیقات اور حواشی بہت ہی محنت سے لکھے۔ مگر بابری مسجد کے سلسلے میں اپنی سامراجی قوم ہی کی ہمنوائی کی، اس کو بابر نامہ یا مغلوں کے عہد کے کسی تاریخ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ بابر نے رام جنم استھان کو مسمار کر کے ایک مسجد بنائی۔ تو اس نے پہلے بابر نامہ کے صفحہ 656 پر 1905ء کے گزیٹیر کے مرتب ایچ. آر. نیوبل کا بیان نقل کیا۔ حالانکہ اس کی تحقیق اور دانشوری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ یہ کس مستند تاریخی ماخذ کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ اس سے یہ توقع نہ تھی کہ گزیٹیر کی ایک سنی سنائی روایت کو تاریخی سند قرار دینے کی کوشش کرے گی۔ اپنی کتاب کے ضمیمہ یو میں بابری مسجد کے کتبات نقل کئے ہیں۔ ان اشعار کو نقل کر کے ان کی لفظی خوبیوں پر تبصرہ بھی کیا ہے جس میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد جنم استھان بھومی کی جگہ پر بنائی گئی۔ اس کا ضمیر صاف نہ تھا اس لئے اپنی کتاب کے صفحہ LXXVI پر نظر سے چوک جانے والے خفی حروف میں یہ لکھ گئی ہے۔

Presumably the order of the Mosque was given during Babur's stay in Aud (Ajodhaya) in 934 A.H. at which time he would be impressed by the dignity and sanctity of the ancient Hindu shrine it (at least in part) displaced (.) and like the obedient follower of Muhammad he was in intolerance of Faith would regard the substitution of a temple by Mosque at dutiful and worthy. The Mosque was founded (in 935 A.H.) but no mention of its completion is made in Baburnama. The Diary for 935 A.H. has many minor lacunae, that of the year 934 A.H. has lost much matter breaking off when the account of Aud. might be looked. (P. LXXVI)

ہم نے یہ انگریزی عبارت یہاں قصداً نقل کی ہے تا کہ اس سامراجی قوم کی ذہنیت ظاہر ہو جو اردو ترجمہ میں نہ ہوئی۔ اس گنجلک اور پُر پیچ عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب قیاسات پر مبنی ہے، تحقیق پر نہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے اپنا مؤرخانہ نقد وتبصرہ چھوڑ کر اپنی قوم کی سامراجی ذہنیت سے کام لیا ہے، اوپر کی تحریر (Presumably) (قیاساً) کے لفظ سے شروع ہوتی ہے جس کے بعد پوری عبارت مجروح ہو جاتی ہے، بابر کے اجودھیا آنے کا مستند ثبوت نہ تھا، تو (Presumably) لکھ کر اس کے اجودھیا آنے کا ذکر کہاں تک صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، پھر یہ بھی قیاساً لکھا گیا ہے کہ بابر یہاں کے ایک مندر یا کم از کم ایک حصہ کے رتبہ اور تقدس سے متاثر ہوا ہوگا۔ اور صریحاً متعصّبانہ جھوٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا کرتے تھے۔ بابر آپ کا ایک فرماں بردار پیرو بن کر عدم رواداربن گیا۔ اس نے خیال کیا، کہ ایک مندر کی جگہ پر ایک مسجد بنا کر اپنے کو ایک فرض شناس اور لائق پیرو ثابت کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعلیم دوسروں کے مذہب اور عبادت گاہوں کے متعلق تھی اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، اس کے بعد مسز بیورج نے جو کچھ لکھا ہے اس کو شر انگیز جھوٹ کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے اس قسم کی بات 1877ء کے گزیٹیر میں لکھی گئی تھی۔ مسز بیورج نے اسی کو دوسرے انداز میں دہرا دیا ہے۔

مسز بیورج اپنی قیاس آرائیوں سے کام لے کر یہ بھی لکھتی ہیں کہ یہ مسجد 935ھ میں مکمل ہوئی۔ مگر بابر نامہ میں اس کی تکمیل کا ذکر نہیں۔ اس کے ذکر نہ ہونے کی تاویل اپنی قیاس آرائیوں سے اس طرح کی ہے کہ ڈائری میں 935ھ کے بہت سے جزوی مسائل لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ 934ھ کے تو ایسے بہت سے واقعات کھو گئے ہیں، جن سے اودھ کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی

تھیں۔ ان قیاس آرائیوں کی صداقت تسلیم کرنے کی کوشش کو تحقیق و دانشوری نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہی باتیں کارنیگی کی رپورٹ اور 1877ء کے فیض آباد کے گزیٹر میں کہی گئی ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر مسز بیورج یہ سب کچھ لکھ گئیں جو یقیناً ان کی دانشوری پر ایک بدنما داغ ہے۔

## اودھ میں بابر کی قیام

بابر نے اپنے اودھ آنے کا جو ذکر کیا ہے وہ مسز بیورج کے ترجمہ بابر نامہ میں موجود ہے اس کی ترتیب عیسوی سنہ کے مطابق اس طرح کی گئی ہے۔

10/جون 1521ء گومتی عبور کر کے دن رات چلنے کے بعد ہم لوگ ڈلمو پہنچے، جہاں گنگا کے گھاٹ سے ہماری فوج پار اُتری، اور جب ہم اپنے لشکر کو لے کر پہنچے تو گھاٹ کے نیچے معجون کھائی۔

13/جون دریا عبور کر کے ہم نے ایک دن انتظار کیا، (دوشنبہ 7 شوال) تاکہ پوری فوج پار ہو جائے، آج باقی تاشکندی اودھ کی فوج لے کر آیا اور اس نے باریابی حاصل کی۔

14/جون گنگا کو چھوڑ کر (آٹھویں تاریخ بروز منگل) ایک رات منزل کر کے ہم لوگ 15/جون 9/شوال) کو کوراره کے پاس ارند ندی کے کنارے پر اترے، ڈلمو سے کوراره بائیس کوس (44 میل) ہے۔

16/جون، جمعرات کو اس مقام سے اندھیرے میں کوچ کیا، اور پرگنہ آدم پور کے مخالف میں اترے، 18/جون جمنا کو پار کر کے دشمنوں کا تعاقب کرنے کے خیال سے چند ملاحوں کو آگے روانہ کر دیا تھا، تاکہ کالپی میں جتنی کشتیاں ملیں حاصل کر لیں، کچھ کشتیاں اس رات پہنچیں جب ہم وہاں اُترے، جمنا ہی کے ذریعہ ایک گھاٹ مل گیا، جہاں لشکر کا پڑاؤ ہونے والا تھا۔ وہ گرد و غبار سے بھرا ہوا تھا، اس لئے ہم لوگ ایک جزیرہ میں ٹھہر گئے، اور وہاں کئی روز قیام رہا۔ دشمنوں کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی، اس لئے باقی شقاول اور کچھ جوانوں کے ساتھ ان کی خبریں لانے کے لئے روانہ کیا۔

17/جون دوسرے دن (11 تاریخ بروز جمعہ) ظہر کے وقت باقی آیا، باقی کا ایک فوجی آیا اور خبر لایا کہ باقی نے بین اور بایزید کے لشکریوں کو شکست دے دی ہے، اور ان کے ایک عمدہ آدمی مبارک خاں حلوائی اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو قتل کر ڈالا ہے کچھ کٹے ہوئے سر اور ایک زندہ آدمی کو بھی بھیجا ہے۔

18/جون صبح کو (12/تاریخ بروز شنبہ) نجشی شاہ حسین آیا، اور اس نے دشمن کے لشکریوں کی شکست کا حال سنایا۔ اور دوسری مختلف خبریں دیں، اسی رات یعنی سینچر کی رات تیرہویں تاریخ جمنا میں سیلاب آیا، صبح تک اس پورے جزیرہ میں جس میں ہم لوگ ٹھہرے تھے، پانی بھر گیا۔ ایک تیر کے فاصلہ پر ہم لوگ دریا کے نیچے چلے گئے اور وہاں ایک خیمہ ڈال کر مقیم ہوئے۔

20/جون دوشنبہ کو جلال تاشکندی ان امراء اور سلاطین کے پاس سے آیا، جو آگے بھیجے گئے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ چڑھائی کی خبر سن کر شیخ بایزید اور بی بن پرگنہ کی طرف بھاگ گئے، ادھر برسات سر پر آگئی، ادھر پانچ چھ مہینے سے جو فوج کشی ہو رہی تھی، تو گھوڑے اور دوسرے جانور تھک چلے تھے، اس لئے سلاطین اور امراء کو حکم دیا کہ وہ وہیں ٹھہرے رہیں، جہاں وہ ہیں، یہاں تک کہ آگرہ اور دوسرے مقامات سے تازہ ساز و سامان آجائے، اسی دن عصر کے وقت باقی اور اس کے ساتھ اودھ کی فوج کو رخصت کر کے روانہ کیا۔ موسیٰ بن معروف فربی دریائے سرود چھوڑتے وقت حاضر ہوا تھا، اس کو امروہہ کے علاقہ کی تیس لاکھ جاگیر اس کی تنخواہ میں دی۔ اور اس کو ایک خاص خلعت اور گھوڑے دے کر امروہہ جانے کی رخصت عطا کی۔

21/جون، جب ادھر سے خاطر جمع کر لی تو منگل کی رات تین پہر پر ایک گھڑی گزرنے کے بعد ہم چل کھڑے ہوئے، کالپی کے پرگنہ سوگند پور میں دوپہر کو ذرا دم لیا، اور گھوڑے کو دانہ گھاس کھلا کر مغرب کے وقت سوار ہو گئے رات کو 13 کوس چل کر رات کا تیسرا پہر تھا کالپی کے پرگنہ سوگند پور میں پہنچے۔ اور بہادر خاں سروانی کے مقبرے میں اتر کر سو رہے، فجر کی نماز کے وقت وہاں سے کوچ کیا، سولہ کوس کا راستہ طے کر کے دوپہر کو اٹاوہ پہنچ گئے، جہاں مہدی خواجہ نے پیشوائی کی۔

(صفحہ 684-686)

اوپر کے اقتباس سے تو ظاہر ہے کہ وہ اودھ کے امراء کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے آیا، وہ ایک مندر کو مسمار کر کے ہندوؤں کو اپنے سے خواہ مخواہ کیوں بدظن کرتا، وہ اس سفر میں باقی تاشکندی سے اس کی فوج کے ساتھ ملا جو اجودھیا سے آیا تھا، باقی کے نام کے ساتھ اس نے تاشکندی اور شقاول لکھا ہے۔ گو اس کے نام کے ساتھ کتبہ میں اصفہانی لکھا ہے، جب بابر اس سے ملا تو وہ اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ اس نے ایک مندر کو توڑ کر مسجد کی تعمیر کس حد تک کی۔

سامراجیت میں ہندو مسلمان میں باہمی نفرت پیدا کرانے کی کوشش میں لگے رہے، اس کی تائید اڑیسہ کے موجودہ گورنر بی.این. پانڈے کی اس تقریر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے راجیہ سبھا میں 29/جولائی 1977ء میں کی تھی، انہوں نے اس میں بتایا کہ ہندوستان میں انگریز مؤرخوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس پر زیادہ زور دیا کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کرتے اور لوٹ مار کے ذریعہ مذہبی تعصب دکھاتے۔ ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایت کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے، ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں، ان کے سامنے یہ شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو، ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی۔

جناب بی.این. پانڈے نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لارڈ ایلگن کے زمانہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ وڈ نے اس کو ایک خط مورخہ 3/مارچ 1822 میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان سے اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان کو ایک دوسرے کا مخالف بناتے رہے، اس کو جاری رکھنا چاہئے، جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے، کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔

9/مئی 1942ء میں اسی وڈ نے لارڈ ایلگن کو پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لئے قابل اعتنا ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

29/مارچ 1886 میں ایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کو لکھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصہ میں تقسیم کر دیں، اس طرح کہ دونوں کے خیالات مختلف ہوں، اس لئے تعلیمی اداروں میں نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے۔

4/جنوری 1886ء میں اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ ڈفرن کو لکھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی اختلاف پیدا کرنا ہمارے فائدے کے لئے ہے، آپ نے ہندوستان میں تعلیم کے نصاب بنانے کے لئے جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے، اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔

برطانوی حکومت کی اس سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں کارنیگی 1877ء کے فیض آباد گزیٹیر کے مرتب ڈبلو.ڈبلو. ہنٹر، نیول اور مسز اے ایس بیورج کی مذکورہ بالا تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہئے، ان ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کے آثار قدیمہ کے انگریز ماہرین، عام مؤرخین، ضلع کے گزیٹیر کے مرتبین جب اور جہاں موقعہ ملا انہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر یا اپنی دانشوری یا اپنی قیاس آرائیوں اور دو راز کار تاویلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کئے۔ ان کو برابر خوفناک ذلتیں برداشت کرنا پڑیں، ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں ہیں۔

ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کی فریب کارانہ حکمتِ عملی کو سمجھنے کے باد جود ان کے دام تزویر میں پھنستے رہے، ان کی سیاسی چالبازیوں سے تو چوکنا ضرور ہوتے مگر ان علمی اور تحقیقی فریب کا جادو ان کے سر سے اتر گیا، بلکہ ان کے سروں پر چڑھ کر بولتا رہا۔

## بابری مسجد کے لئے باضابطہ جاگیریں

1885ء کے مقدمہ کے فیصلہ کے بعد بابری مسجد پہلے کی طرح برابر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی اور اجودھیا کے مسلمانوں کے بیان کے مطابق وہاں پنج وقتہ نمازیں بھی ہوتی رہیں، اور جمعہ بھی ہوتا رہا، کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے امام اور مؤذن کے لئے مغلیہ عہد سے ساٹھ روپے سالانہ کی رقمیں مقرر تھیں، جو سرکاری خزانہ سے ملا کرتی تھیں، پھر یہ رقم بڑھا کر تین سو روپے تین آنے چھ پائی کر دی گئی، برطانوی حکومت کے زمانہ میں یہ رقم جاری رہی، پھر بندوبست اول کی رقم کے بجائے دو گاؤں بھون پور اور شولا پور متصل اجودھیا بطور معافی دیئے گئے، جن کی آمدنی برابر مسجد کے مصارف پر خرچ ہوتی رہی، چنانچہ رجسٹرڈ زیر دفعہ نمبر 30 میں اس وقت کے متولی جواد حسین ساکن موضع شنوال، ڈاکخانہ درشن نگر، ضلع فیض آباد اور ان کے زیر انتظام جائداد بابری مسجد کی عمارت اور موضع بھون پور اور شولا پور کی آراضی کی تفصیل درج ہے، اور پھر سنّی وقف ایکٹ 13/1920ء کے تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔

(بحوالہ رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ و اپریل 1886ء)

تحت چیف کمشنر وقف بورڈ نے معائنہ کر کے اس کا رجسٹریشن بابری مسجد کی حیثیت سے کیا۔
(بحوالہ رسالہ دارالعلوم دیوبند، مارچ واپریل 1886ء)

## بابری مسجد کو مندر بنانے کی کوشش

1949ء تک بابری مسجد کسی اختلاف اور نزاع کے بغیر مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، لیکن 1947ء کے بعد جب قومی حکومت قائم ہوئی، اور ضرورت اس بات کی تھی کہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے تو اس کے برخلاف 22/دسمبر 1949ء کی درمیانی شب کو ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام اپنے چیلوں کے ساتھ مسجد کی دیوار پھاند کر اس میں گھس گئے، اور اس کے درمیانی گنبد میں عین محراب کے اندر رام کی مورتی رکھ دی، اس وقت مانو پرشاد ایک کانسٹیبل وہاں متعین تھا، اس نے تھانہ میں رپورٹ درج کرائی کہ ابھے رام داس، شکل داس، سدرشن داس، اور پچاس ساٹھ نامعلوم آدمیوں نے مسجد کے اندر جا کر مورتی رکھ دی ہے جس سے نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

## السٹریٹیڈ ویکلی کا ایک مقالہ

السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا نے مورخہ 21-15/جون 1986ء میں چیدا نندہ داس گپتا کا ایک مضمون نکالا ہے، جس میں یہ بیان ہے کہ:

"مورخین کا اس پر اتفاق نہیں کہ رام چندر جی کہاں پیدا ہوئے؟ اور وہ تو ان کی پیدائش کے پانچ سو برس تک کے حالات کا پتہ نہیں چلا سکے، ان کو اس سے بھی پریشانی ہے کہ وید میں تو یہ ہے کہ دسرتھ اور رام وارانسی کے راجہ تھے، اس میں ان کو اکسوا کو خاندان کا راجہ نہیں بتایا جاتا ہے، دسرتھ جاتکا میں بھی ان کو وارانسی کا راجہ بتایا گیا ہے، اس میں تو یہ بھی ہے کہ سیتا کا کوئی تعلق جنک سے نہ تھا، اگر چہ رامائن میں بودھ کا ذکر ہے، لیکن بودھ کے زمانہ میں کوشل کا دارالسلطنت اجودھیا، نہ تھا، بلکہ سروستی تھا، اور پتانجلی کے زمانہ میں ساکیت تھا، پھر رامائن میں اجودھیا کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے، اس سے تو ظاہر ہے کہ یہ چوتھی صدی قبل مسیح کا شہر نہیں ہو سکتا ہے۔"

اور پھر ان ہی مضمون نگار کا یہ بیان ہے کہ:

"رامائن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی

کی بیوی کا وارث ہو جاتا تھا، اسی لیے سیتا لکشمن کو یہ طعنہ دیتی ہے کہ وہ اسی لیے رام چندر کے گم ہو جانے پر ان کو تلاش نہیں کرتے، اور پھر سیتا رام چندر کو یہ بھی ملامت کرتی ہے کہ وہ سادھوؤں کے جنگل میں مسلح ہو کر آئے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ رام یہاں اس لیے آئے تھے کہ مدھیہ پردیش کے ان غیر آریائی قبیلوں پر فتح پائیں جن کو راکشش کہا جاتا تھا، اس طرح یہ ظاہر ہے کہ راون نے سیتا کا اغوا کر کے اس حملہ کا بدلہ لیا، جو غیر آریائی علاقہ پر کیا گیا تھا، پھر بہت سے دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ لنکا مدھیہ پردیش میں تھا، لنکا سے موجودہ سری لنکا مراد نہیں ہے۔''

آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے:

''اگر رام ایک آئیڈیل فرزند، شوہر اور راجہ تھے، یا لکشمن اور بھرت آئیڈیل بھائی تھے، یا سیتا ایک آئیڈیل بیوی تھیں تو پھر اس پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، اگر ان کا احترام اس لیے ہے کہ وہ آئیڈیل نمونہ تھے، تو بھگتی...... کے لحاظ سے مورخین کی یہ ساری بحثیں بیکار ہیں لیکن یہ سارے واقعات اس طرح سادہ نہیں ہیں، یہ بنیاد پرست کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آئیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے مہنتوں نے ان کو جو پیدائش کی تاریخ اور پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے، ان کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے، اور اسی کے سہارے دوسرے فرقہ سے جنگ کر کے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے، لیکن ہم کو اس کی پروا نہیں، بابری مسجد اور رام جنم استھان کے جھگڑے میں جو جذبات ابھرے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلا دی جائیں، برہمن اس کی پھر سے تاریخ لکھیں گے، اپنی اس رزمیہ کہانی کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے، اور اس میں طرح طرح کی ایجاد کا بھی اضافہ کریں گے، اور وہ اپنے پرانوں کو بھی پھر سے قلم بند کریں گے، اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔''

اس دلیل کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی، قانونی اور اخلاقی جائزہ اور تجزیہ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ ☐ ☐

بحوالہ کتاب: بابری مسجد: تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں
از: سید صباح الدین عبدالرحمٰن، طبع ششم (1990)ء

# تاریخی بابری مسجد اور آثارِ قدیمہ کی شہادت

از: سشیل کمار سریواستو

شعبۂ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے استاد مسٹر سشیل سریواستو نے کئی برسوں سے فیض آباد کی تاریخ پر ریسرچ کیا ہے، انہوں نے اس مقصد کے لیے بہت سی لائبریریوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ آثارِ قدیمہ اور فن تعمیر کے حوالے سے بھی ماضی میں دفن تاریخ کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی ہے، ان کی اس ریسرچ کے دوران کچھ ایسے حقائق سامنے آئے جو بابری مسجد رام جنم بھومی کے تنازعہ پر نئی روشنی ڈالتے ہیں، مشہور ہندی میگزین ''مایا'' نے اپنے جنوری 1987ء کے شمارہ میں ان کا تحقیقی مقالہ من وعن شائع کیا تھا، 'مایا' کے مدیر نے اس کے تعارف میں لکھا: ''اس تحقیقی مقالہ کو شائع کرنے کا مقصد، منطق، تاریخ، آثار قدیمہ اور فن تعمیر کی روشنی میں اس تنازعہ کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے لیے سنجیدہ قارئین کے سامنے حقائق کو پیش کرنا ہے تاکہ ملک پر چھائے مذہبی جذباتیت کے کہرے سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ مل سکے''۔ اسی مقصد کے پیش نظر اس تحقیق کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

ایسا یقین ہے کہ رام جنم بھومی مندر وہیں پر واقع ہے جہاں بابری مسجد بنی ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس یقین کی بنیاد خاص طور پر مائیتھالوجی (Mythology)، لوک گیت اور لوک کہانیاں ہیں، ایسا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ حقیقت میں مریادا پرشوتم بھگوان رام سے متعلق مندر اسی مقام پر واقع ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی ایسے کسی مندر کا کوئی ذکر نہیں ملتا، محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس یقین کی اصلی بنیاد بالمیکی کی رامائن ہے۔ اس کتاب میں اجودھیا شہر کو رام کی جائے پیدائش بتایا گیا ہے، اے کننگھم نے اپنی آرکیالوجیکل رپورٹ 63-1862 میں اس سلسلے میں لکھا ہے: ''رامائن کے مطابق اجودھیا شہر کو ساری نوع انسانی کے جد امجد ''منو'' نے بسایا تھا۔ رام کے والد دشرتھ کے زمانے میں برجیوں اور دروازوں کے ساتھ اس کی قلعہ بندی کی گئی اور چاروں طرف کھائی کھودی گئی اس تعمیر کے آثار اب معدوم ہو چکے ہیں، اور اگر رام کی اجودھیا کا کوئی حصہ بچ بھی گیا ہوگا تو ایسا مانا جاتا ہے کہ

1426 قبل مسیح کی جنگ عظیم میں بر ہد بالا کی موت کے بعد تباہ کر دیا گیا ہوگا، اس کے بعد وکرمادتیہ کے وقت تک یہ شہر غیر آباد رہا، جن سروتی کے مطابق یہ وکرمادتیہ اوجین کے مشہور شکاری راج کمار تھے لیکن آج کے ہندو سارے وکرمادتیوں کے کارہائے نمایاں کو اسی ایک وکرمادتیہ سے جوڑتے ہیں، لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے، ہیونگ سانگ کی رائے ہے کہ اس نام (وکرمادتیہ) کا ایک طاقت ور راج کمار پڑوس کے شراوستی نگر پر حکومت کرتا تھا، یہ کنشک کے ٹھیک سو سال بعد یا 72ء کے آس پاس کی بات ہے۔ اب یہ ثابت ہو گیا کہ کنشک کا زمانہ 72ء تھا اس لیے یہ زمانہ 178ء کا ہونا چاہئے۔ یہ شالی واہن کے ذریعہ شروع کیے گئے شک سنبت کا ابتدائی سال تھا۔ مذکورہ وکرمادتیہ کو بدھوں کے معاملے میں بہت ہی سخت مانا جاتا تھا۔ وہ یقیناً بہت ہی پکے برہمن وادی رہے ہوں گے اس لئے میں مانتا ہوں کہ انہوں نے ہی اجودھیا کی نئے سرے سے تعمیر کی ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ رام کی تاریخ سے متعلق تمام مقدس مقامات کو از سر نو بحال کیا ہوگا، کہاوت کے مطابق وکرمادتیہ جب اجودھیا پہنچے تو انہیں یہ شہر اجڑا اور جنگلوں سے ڈھکا ملا لیکن پرانے ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرجو کے لکشمن گھاٹ سے ناپ جوکھ کر کے وہ رام کی تاریخ سے جڑے مشہور مقامات کو کھوج نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے رام اور ان کی اہلیہ سیتا، بھائی لکشمن، بھرت اور شتروگھن اور بانر دیوتا ہنومان سے تعلق رکھنے والے مختلف مقدس مقامات پر تین سو ساٹھ مندر تعمیر کرائے۔''

یوں تو بعض مصنفین اور سیاحوں کی تحریروں میں بھی اجودھیا کا تذکرہ ملتا ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی شری رام جنم بھومی مندر کا ذکر نہیں ملتا، مرأۃ مسعودی میں اس مندر کا ذکر نہیں ہے، ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں اور بابر نامہ میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ہاں ابوالفضل کی تحریر کردہ آئین اکبری میں یہ بات ضرور کہی گئی ہے کہ اجودھیا شہر کو رام جنم بھومی بھی کہا جاتا ہے، چنانچہ یہ بات تو عام ہے کہ پوری اجودھیا رام جنم بھومی تھی اور اس کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ یہاں بہت سے مندر تھے لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یہاں شری رام جنم بھومی نام کا کوئی مندر تھا اور اسے توڑ کر مسجد تعمیر کی گئی۔

پھر سوال یہ ہے کہ یہ یقین کیا، کیسے اور کیوں عام ہوا کہ یہاں رام جنم بھومی مندر تھا، جسے توڑ کر مسجد بنائی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانوی دور اقتدار میں خرافیات کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے 1850ء کے بعد اس بات کا تذکرہ انگریز افسروں نے کیا کہ ہندوؤں کی

عبادت گاہوں کو مغل حکمرانوں نے ناپاک کیا، اس کی تائید محمد فیض بخش کی تصنیف تاریخ فرح بخش 1819ء تک کی فیض آباد کی تاریخ سے ہوتی ہے، اس میں 1720ء اور 1819ء کے درمیان کے فیض آباد کے واقعات کی تفصیل ملتی ہے، لیکن اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے، کہ بابری مسجد کی جگہ کوئی ہندو عبادت گاہ رہی ہے اور اس کے تعلق سے کوئی تنازعہ بھی رہا ہے اس میں اجودھیا کے واقعات کا ذکر ہے لیکن بابری مسجد رام جنم بھومی سے متعلق فرقہ وارانہ تنازعہ کا کوئی ذکر نہیں۔

یہ سب تو ٹھیک ہے کہ مسجد میں جن بارہ ستونوں کا استعمال ہوا ہے، وہ غیر اسلامی ہیں سوال اُٹھتا ہے کہ کیا مسجد کسی ہندو مندر کے کھنڈر پر بنائی گئی یا اس میں کسی تباہ شدہ مندر کے ملبے کو استعمال کیا گیا، کسی تحریری ثبوت کے نہ ہونے کے سبب اس سوال کا جواب دینا ممکن نہیں ہے۔

ایسا یقین ہے کہ وکرمادتیہ اجودھیا آئے تھے اور انہوں نے 84 ستونوں پر شری رام جنم بھومی تعمیر کی تھی، الزام ہے کہ بابر نے اس مندر کو توڑ کر اس کے کھمبوں کو مسجد میں استعمال کیا، یہ ستون اب بھی اچھی حالت میں ہیں، یہ سیاہ رنگ کے ٹھوس ستون ہیں، جس پتھر کے یہ ستون ہیں اسے مقامی لوگ کسوٹی پتھر کہتے ہیں، یہ ستون تراشے ہوئے ہیں، ان کی اونچائی سات سے آٹھ فٹ ہے ان کے نیچے کا اور اوپر کا حصہ چوکور ہے، درمیانی حصہ گول یا ہشت پہلو ہے ایسے ہی دو کھمبے صوفی موسیٰ عاشقان کی قبر میں نیم مدفون حالت میں دیکھے جاسکتے ہیں، (تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس صوفی کا مقبرہ بنارس میں ہے لیکن خرافیات ظاہر ہے کہ کسی ایک فرقے کی میراث نہیں ہے) بابری مسجد میں لگے کھمبوں کی تصویر ہمیں نہیں لینے دی گئی، لیکن ایسے دوسرے کھمبوں کی تصاویر ہم نے قدیم فن تعمیرات کے ماہرین کو دکھائیں۔ امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز، سینٹر آف آرٹ اینڈ آرکیالوجی رام نگر وارانسی کے پروفیسر ایم.اے.ڈھاکے اور ڈاکٹر کرشن دیو کا خیال ہے کہ یہ ستون نویں اور گیارہویں صدی کے درمیان کے کسی زمانے کے ہیں، اگر بابری مسجد میں لگے ستون اسی زمانے کے ہیں جیسا کہ اوپر سے دیکھنے میں بالکل ویسے ہی لگتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وکرمادتیہ کے تعمیر کردہ کسی مندر یا عمارت کے ستون یہ قطعی نہیں ہو سکتے۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ رام کی جائے پیدائش پر وکرمادتیہ نے مندر بنوایا تھا تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کھمبے اس مندر کے قطعاً نہیں ہو سکتے۔ اگر رام کے وجود کو ایک تاریخی حقیقت مان لیا جائے تو سوال اُٹھتا ہے کہ اگر بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر نہیں تھا تو پھر رام کی جائے پیدائش کہاں ہے؟

اس سلسلے میں ''ایودھیا مہاتمیا' (یاتریوں کے لیے گائیڈ) نامی تصنیف ہماری مدد کرتی ہے، مہاتمیا سنسکرت میں ہے، لیکن ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال'' (جلد 54، جز نمبر 1 تا 4، 1875ء کلکتہ 1875ء) میں اس کا ترجمہ چھپا ہے۔ یہ ترجمہ رام نارائن نے کیا ہے اجودھیا کے مہاراجہ مان سنگھ کا دعویٰ ہے کہ اجودھیا ''مہاتمیا'' سوریہ ونش کے اچھاوک کی تصنیف ہے، اس کے برعکس اجودھیا کے پنڈت اومادتیہ کا کہنا ہے ''مہاتمیا'' ''اسکندر'' اور ''پکیہ پُران'' کی نقل ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے اجودھیا کے راجا کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ پنڈت اومادتیہ کی رائے زیادہ صائب اور قابل یقین ہے کہ کیونکہ مہاتمیا لکھنے کی روایت سولھویں صدی میں مقبول ہوئی ہے۔ پہلا مہاتمیا ''گنگا مہاتمیا'' تھا جو سولھویں صدی کی چوتھی یا پانچویں دہائی میں لکھا گیا تھا، ایسا لگتا ہے کہ اجودھیا مہاتمیا بعد میں لکھا گیا، اس میں دو بار پریاگ کو الہ آباد کہا گیا ہے۔ اکبر (سولھویں صدی) نے پریاگ کو ''الہ باس'' کا نام تھا اور شاہجہاں (سترویں صدی) نے اسے الہ آباد کا نام دیا، اس لیے یہ ممکن ہے کہ اجودھیا مہاتمیا یا تو شاہجہاں کے دور میں یا اس کے بعد لکھا گیا، اس مہاتمیا میں لکھا ہے: ''سورگ دوار (اجودھیا میں) داخل ہونے سے ہزاروں جنموں کے پاپ دھل جاتے ہیں، یہاں مرے سبھی لوگ ہندو اور مسلمان، چرند و پرند، کیڑے اور مکوڑے وشنو دھام پہنچتے ہیں۔ وشنو چتر بھجی (چار بازوؤں والے) ہیں ان کی کال جیسے آنکھیں ہیں، وہ شنکھ، چکر، گدا اور پدم دھاری ہیں، اور گروڑ کی سواری کرتے ہیں''، اسی طرح اس بات پر شک کرنے کی معقول بنیاد ہے کہ یہ اچھاوک کی تصنیف ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ مہاتمیا اکبر کے دور میں یا اس کے بعد وجود میں آیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ اجودھیا کی اہمیت تلسی داس کی تصنیف ''رام چرت مانس'' کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ بڑی ہے۔ اجودھیا مہاتمیا میں رام کی جائے پیدائش کا دو بار ذکر آیا ہے، اس میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ راجا دشرتھ کے چاروں بیٹے اپنی اپنی ماں کے محل میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک جگہ کہا گیا ہے کہ سیتا رسوئی جائے پیدائش یعنی کوشلیا بھون کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ جائے پیدائش (جنم استھل) سے چالیس گز اُتر کی جانب ''کیکئی بھون'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کیونکہ کیکئی نے اسے سیتا کو منھ دکھائی میں دے دیا تھا۔ جنم بھومی سے ساٹھ گز جنوب میں سمترا کا محل ہے جہاں لکشمن اور شتروگھن پیدا ہوئے تھے، جنم استھل کے جنوب مشرق میں سیتا کوپ ہے، جسے ''گیان کوپ'' بھی کہا جاتا

ہے۔ (اجودھیا مہاتمیا باب 10) دوسری جگہ اس میں کہا گیا ہے کہ ''جنم بھومی (رام کی جائے پیدائش) میں جانا چاہئے، وگھنیشور کے مشرق یا وسشٹھ کی رہائش گاہ کے شمال میں یا بوماسارشی کی کٹیا کے مغرب میں یہ جائے پیدائش واقع ہے جسے صرف دیکھ لینے سے ہی انسان کی جونی سے نجات مل جاتی ہے۔'' (اجودھیا مہاتمیا باب 10)

لیکن آج جو جنم استھان ہے کیا وہ اجودھیا مہاتمیا کی بتائی جگہ ہے؟ مہاتمیا کے مطابق مندر کے شمال مغرب میں ''سیتا رسوئی'' ہونی چاہئے جس سے کوشلیا بھون کے جائے وقوع کا بھی پتہ چلنا چاہئے، جہاں رام کا جنم ہوا تھا، لیکن آج جہاں سیتا رسوئی بتائی جاتی ہے وہ بابری مسجد، (جسے رام کا جنم استھان کہا جا رہا ہے) سے 25-20 گز شمال مشرق میں ہے اسی طرح دشرتھ کی تین رانیوں کے محل بھی سیدھے شمال سے جنوب کی جانب ہیں، کیکئی بھون کے بالکل شمال میں ہے۔ مہاتمیا کے مطابق جنم استھان کیکئی بھون سے چالیس گز جنوب کی جانب ہونا چاہئے، لیکن آج جہاں جنم استھان مانا جاتا ہے، وہ مقام (بابری مسجد) کیکئی بھون سے جنوب مغرب میں ہے۔ اسی طرح مہاتمیا کے مطابق سمترا کا محل بھی جنم استھان سے جنوب کی سمت میں 60 گز کی دوری پر ہونا چاہئے، لیکن آج جہاں سمترا بھون بتایا جاتا ہے وہ جگہ بابری مسجد کے جنوب مغرب میں ہے۔ اسی طرح بگھنیشور، بوماسارشی اور وششٹھ کی رہائش گاہوں سے جنم استھان کا پتہ لگائیں تو پائیں گے کہ مسجد آج کی صورت حال کے مطابق بگھنیشور کے استھان سے سیدھے مشرق میں ہونے کے بجائے شمال مشرق میں ہے۔ بوماسارشی کی کٹیا سے مغرب کے بجائے شمال مغرب میں ہے اور وششٹھ کے آشرم سے شمال کے بجائے شمال مغرب میں ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو مہاتمیا کے حساب سے مسجد کے آس پاس کہیں سیتا کوپ رہا ہوگا کیونکہ سیتا کوپ مسجد کے سیدھے جنوب مشرق میں ہے لیکن چونکہ مہاتمیا میں کچھ مقامات کی متعین دوری نہیں دی گئی ہے، اور دوسرے حوالوں میں بھی تضاد پایا جاتا ہے، ایسی حالت میں کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد ٹھیک جنم استھان پر واقع ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں اور کوئی چیز نہیں رہی ہوگی، سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہاں اور کوئی ہندو دھرم استھان رہا ہوگا؟ اور اگر وہاں ہندو دھرم استھل نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

## بابری مسجد

یہ خیال 19ویں صدی کے نصف اوّل میں پیدا ہوا کہ بھگوان رام کے جنم استھل پر بنے مندر کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اس خیال کی جڑیں انگریزوں کی اس حکمت عملی میں پوشیدہ ہیں جس کے تحت وہ فرقہ وارانہ ٹکراؤ کو ہوا دیکر اس خطے میں امن و قانون کے مسائل پیدا کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ اودھ کے ہڑپنے کو ضروری اور اخلاقی بنیاد پر درست ٹھہرا سکیں۔ (دیکھئے منسلک کہانی) عوام کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر گھولنے کے لیے انگریزوں نے اس خیال کو عام کیا کہ مغلوں نے اجودھیا میں ہندوؤں کے مقدس مقامات کو ناپاک کیا اس کے پیچھے چال یہ تھی کہ وہ اپنے کو اکثریتی فرقہ یعنی ہندوؤں کا نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ مغل انگریزوں کے پیش رو تھے اس لیے مغلوں کو قربانی کا بکرہ بنانا ان کے لیے آسان تھا۔ نتیجہ کے طور پر انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی کہ مغلوں نے ہندوؤں پر ظلم کیا وہ ہندوؤں کی تہذیب و ثقافت اور ان کی روایات کے دشمن تھے۔

انگریزوں نے اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے جان لیڈن کو اپنی بیساکھی بنایا۔ 1813ء میں لیڈن کی تصنیف ''میمورائز آف ظہیر الدین محمد بابر، امپائر آف ہندوستان'' (بابر کی یادداشتوں کا ترجمہ) شائع ہوئی تھی، لیڈن نے اس میں لکھا تھا کہ پٹھانوں کے خلاف معرکے کے دوران بابر مارچ 1528ء میں اجودھیا سے گزرا تھا، حالانکہ لیڈن نے اگرچہ اس ترجمے میں یہ بات کہیں نہیں کہی کہ بابر نے اجودھیا میں ہندو مندر توڑے تھے لیکن انگریز حکمرانوں نے اس پروپیگنڈے کو ثابت کرنے کے لیے کہ اجودھیا سے گزرتے وقت بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑا تھا۔ لیڈن کو استعمال کیا۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ انگریزوں کے اس پروپیگنڈہ پر کسی نے انگلی نہیں اُٹھائی اور آج بھی صورت حال کچھ اسی طرح کی ہے، کسی نے بھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس علاقہ میں مسلمانوں کا اثر 1030ء کے آس پاس جم چکا تھا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بابر سے پہلے کسی مسلم حکمراں میں مذہبی جنون پیدا نہیں ہوا کہ وہ اجودھیا میں بنے پرانے دھرم کے مندروں کو تباہ کرتا۔ خاص کر اس اہم مندر کو جو رام کے جنم استھان پر بنا تھا۔ جب کہ ایسے تاریخی شواہد ہیں کہ مسلم (ترکی) حکمرانوں نے ہندو مندر توڑ کر مسجدیں بنائی ہیں، دہلی میں قطب کمپلیکس، اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا اس کی مثال ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ اودھ میں 1030ء سے

مسلمانوں کا اثر بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ مرأۃ مسعودی (سید سالار مسعود کی مہم کی تفصیل) کے مطابق سید سالار مسعود 1030ء میں ملتان سے اودھ پہنچے تھے اودھ پر فتح حاصل کرنے میں انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور کچھ دنوں تک وہ وہاں مقیم رہے۔ 1080ء میں سلطان ابراہیم کے دور حکومت میں ترکی فوجوں نے نئے سرے سے اودھ کی طرف کوچ کیا۔ اس مہم کی کمان حاجب تگائین کے ہاتھوں میں تھی۔ اس مہم کے تحت ترکی فوجیں گنگا کو پار کر کے ہندوستان میں آگے تک بڑھی تھیں، سید سالار مسعودؒ کے زمانے تک کوئی حملہ آور اتنی دور تک نہیں پہنچا تھا، شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور معز الدین محمد بن سام نے 1194ء میں قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد اودھ کو فتح کر لیا تھا۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ یا تو اس نے خود یا اس کے کسی سپہ سالار نے اجودھیا پر قبضہ کیا تھا۔ 1194ء تک مسلمانوں کی پہنچ اجودھیا تک ہو چکی تھی لیکن حیرت کی بات ہے کہ 1528ء میں جا کر انہیں احساس ہوا کہ رام جنم بھومی مندر توڑے بغیر ہندو دھرم کو ذلیل نہیں کیا جا سکتا۔

اتنا ہی نہیں، یہ بات بھی بے بنیاد ہے کہ بابر اور اورنگ زیب نے اجودھیا کے ہندو مندروں کو نیست و نابود کیا تھا کیونکہ نہ تو کبھی بابر اور نہ کبھی اورنگ زیب اجودھیا گئے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ بابر پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ اس نے شری رام جنم بھومی مندر کو توڑا تھا۔ بابر نامہ اس بات کا گواہ ہے کہ بابر پکا مسلمان تو تھا لیکن دوسرے مذاہب کے لیے بابر کے دل میں کسی قسم کی نفرت نہیں تھی۔ 1921ء میں اے۔ ایس۔ بیورج کی میموئرس آف بابر (بابر کا ترجمہ) میں کہا گیا ہے کہ اپنی مہم کے دوران بابر متعدد مندروں میں گیا اور ان کے فن تعمیر کو سراہا۔ میموئرس میں ایسا کوئی ذکر نہیں ہے کہ بابر مندروں کو تباہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ بابر نے اجودھیا میں کسی ہندو مندر کو توڑا۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بابر کبھی اجودھیا گیا۔

صرف لیڈن کی تصنیف نے اس خیال کو جنم دیا ہے کہ شری رام جنم بھومی مندر کو بابر نے برباد کیا تھا۔ بابر سے متعلق لیڈن کی تصنیف میں یہ لکھا گیا ہے کہ 28/مارچ 1528ء میں بابر اجودھیا گیا تھا، اس خیال کو اس وجہ سے تقویت حاصل ہوئی کہ اصلی بابر نامہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود نسخہ کے وہ صفحات غائب ہیں جن میں بابر کی 2/اپریل سے 8/ستمبر 1528ء تک کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ لیڈن نے اس لیے یہ نتیجہ نکال لیا کہ بابر اس مدت کے دوران اجودھیا میں تھا۔ لیکن کیا واقعی بابر اس وقت اجودھیا میں تھا؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیڈن اس علاقے کے جغرافیہ سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ بابر نے جس مقام پر پڑاؤ کیا تھا لیڈن نے اس مقام کی غلط معلومات فراہم کی ہے۔ بابر کے مطابق (جیسا کہ لیڈن نے بتایا ہے) یہ مقام اودھ (اجودھیا) سے چار سے چھ میل شمال میں تھا۔ بابر صحیح معلومات رکھنے والا شخص تھا اس لیے اس کے حوالوں میں غلطی کا امکان کم ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''سنیچر 7/رجب (28/مارچ 1528ء) کے دن ہم نے اودھ کے اوپر گھاگھر (گھاگھرا) اور سرو (سروا) کے سنگم سے دو تین کوس پر پڑاؤ ڈالا'، (میموئرس آف ظہیر الدین محمد بن بابر) اس سے لیڈن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بابر نے سروا اور گھاگھرا کے سنگم پر پڑاؤ ڈالا۔ اس نے گھاگھرا کے سروا گھاٹ کو سروا اور گھاگھرا کا سنگم سمجھ لیا (دیکھئے نقشہ) یہ حصہ اجودھیا کے جنوب میں 16 میل کی دوری پر ہے۔ لیکن لیڈن نے پکا یقین کر لیا کہ بابر نے اجودھیا کے بہت قریب پڑاؤ ڈالا تھا۔ اسی طرح کے جغرافیائی تضادات دوسرے انگریز مورخین کی تصانیف میں بھی ملتے ہیں۔ ولیم ارسکن نے ''ہسٹری آف انڈیا انڈر دی ٹو فرسٹ ساورنس آف دی ہاؤس آف تیمور، بابر اینڈ ہمایوں' (دو جلدیں لندن 1854ء) اور ایچ. ایم. ایلیٹ نے ''ہسٹری آف انڈیا، ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریَنس' (جلد 4، 1873ء) میں لیڈن کی طرح ہی لکھا ہے کہ بابر نے گھاگھرا اور سرجو کے سنگم سے 5-4 میل اوپر کی طرف پڑاؤ ڈالا تھا۔ اسی غلطی کو لیڈی اینیٹ ایس. بیورج نے بابرنامہ میموئرس آف بابر 1922ء میں درست کیا۔ لیڈی اینیٹ نے نتیجہ نکالا کہ بابر نے شاردا اور گھاگھرا ندی کے سنگم سے شمال کی طرف چار پانچ میل کی دوری پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اس نے بابرنامہ کے ترجمہ کا کام فیض آباد میں کچھ دنوں تک قیام کرنے کے بعد ہاتھ میں لیا تھا۔ جب کہ لیڈن نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیڈی اینیٹ کا خیال ہے کہ کالی شاردا، چوکا ندی ہی شاردا ہے جو گھاگھرا کی معاون ندی ہے۔ اس خیال کو صحیح ماننے کے تین اسباب ہیں۔ ① جہاں گھاگھرا اجودھیا کو چھوتی ہوئی بہتی ہے وہاں اس کو سرجو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہرائچ کے پاس سرجو گھاگھرا میں ملتی ہے۔ ② بابر نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ شاردا ندی چھچھلی ہے اور اس کو پیدل پار کیا جا سکتا ہے۔ ③ اکثر تاریخ لکھنے والوں نے اودھ اور اجودھیا کو ایک ہی مانا ہے۔ انہوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی کہ سبھی مسلمان تاریخ لکھنے والوں نے گومتی اور گھاگھرا کے درمیانی علاقے کو اودھ کہا ہے۔ اس طرح بہرائچ میں دونوں ندیوں کا سنگم بھی اودھ میں آتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تضاد بیانی کا سبب رسم الخط ہے۔ ندی کے نام میں آئے اُردو کے

حرف دال کو، غلطی سے واؤ سمجھ لیا گیا ہے، ویسے دونوں ندیوں کا سنگم بارہ بنکی کے شمال میں پڑتا ہے جو اجودھیا سے 72 میل شمال میں ہے۔ ظاہر ہے کہ بابر مارچ 1528ء میں اجودھیا کے آس پاس نہیں تھا، چونکہ اصلی بابرنامہ کے وہ صفحات غائب ہیں، جن میں 2/اپریل سے 8/ستمبر 1528ء تک بابر کی سرگرمیاں تحریر تھیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بابر کبھی اجودھیا گیا تھا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر بابر نے شری رام جنم بھومی کو خود توڑا ہوتا یا توڑنے کا فرمان جاری کیا ہوتا تو یہ بات بابرنامہ میں ضرور تحریر ہوتی اس لیے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انگریز حکمرانوں نے لیڈن کی بات صحیح مان کر یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ بابر اجودھیا گیا تھا اور مندر توڑ کر مسجد بنوادی تھی"۔

منطقی طور پر دیکھیں تو یہ بات نہیں جمتی کہ بابر جب پٹھانوں سے برسرِ پیکار ہے تو فاتحوں کے قبضہ میں ساری زمین حکمراں کی مانی جاتی تھی ایسی حالت میں عمارت کوئی بھی تعمیر کرائے اس کے ساتھ اس وقت کے بادشاہ کا نام منسلک ہونا خلافِ معمول بات نہیں ہے۔ اس لیے ممکن ہے میر باقی نے شہنشاہ بابر کو خوش کرنے کے لیے اجودھیا کی مسجد کو بابر کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ دستیاب دستاویزات میں کسی ایسے شاہی فرمان کا وجود نہیں ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ بابر نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ دوسری مسجدوں میں تعمیر کے وقت ایسا ہوا ہے۔ دہلی کے پرانے قلعہ کے پاس بنی بابری مسجد کی تعمیر کے لیے فرمان ریکارڈ میں دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسجد کے باہر کی عبارتوں کے رسم الخط اور الفاظ سے بھی متعدد شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ فارسی داں اور مشہور اردو تنقید نگار شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ اگر بابر کا واضح فرمان رہا ہوتا تو اس کے (باہری عبارت) الفاظ کی ترتیب کچھ اس طرح ہوتی "بحکم محمد ظہیر الدین غازی بابر" نہ کہ بہ فرمودۂ شاہ بابر، جس کا مطلب ہوتا ہے شہنشاہ بابر کی خواہش سے مذکورہ عالم کا خیال ہے کہ یہ تحریر 19 ویں صدی کی ہے جب کہ پہلے کے رسم الخط میں نفیس سطریں ہوتی تھیں اور اس تحریر میں موٹی سطریں ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بعد کی تحریر ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ عبارتیں کسی ایسے شخص نے لکھوائی ہیں جو فارسی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عبارتیں مندر مسجد تنازعہ کے پیدا ہونے کے بعد کسی نے 19 ویں صدی میں لکھوائی تھیں۔ وہ شخص غالباً یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ مسجد بابر کے حکم سے بنی ہے۔

لیکن بابر کا نام ہی کیوں اچھالا۔ صاف ہے کہ اس کے پیچھے اس یقین کو مصدق کرنا تھا جس

کے تحت یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ 15 / مارچ 1529ء کو بابر نے یہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یہ نتیجہ مسجد کے اندر واقع منبر کے اوپر کی تین لائنوں پر نظر دوڑانے پر قرین عقل معلوم ہوتا ہے۔ پہلی سطر میں خدا کی تعریف، دوسری سطر میں پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ہے جبکہ تیسری سطر میں ایک طاقت ور شہنشاہ بابر کی عظمت کا اعتراف ہے۔ ان سطروں میں کہیں بھی بابر کے حکم کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسری دو عبارتوں میں بھی اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر یا دوسرا کوئی ہندو مندر تھا۔

مسجد کا فن تعمیر بھی کافی دلچسپ ہے۔ اس مسجد کی تعمیر مشرقی فن تعمیر کے تحت عمل میں آئی ہے۔ جون پور کے مشرقی سلطان اپنی عمارتوں کی تعمیر کے لیے ہندوستانی راجگیروں کو استعمال کرتے تھے، اس لیے وہ ایسے محراب بنانے میں ناکام رہے جنہیں خامیوں سے پاک کہا جا سکتا ہو، زیادہ تر مشرقی یادگاروں کے محراب خاص طریقے کے بنے ہوئے ہیں، اور لیٹھے پر ٹکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مسجد (بابری مسجد) کا گنبد بھی فنِ تعمیر کے مشرقی طرز کا ہی نمونہ ہے۔ اگر بابری مسجد کو پیچھے سے (مغرب کی سمت سے) دیکھا جائے تو وہ جونپور کی اٹالہ مسجد سے میل کھاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پندرہویں صدی تک دہلی میں ترکوں نے گنبد بنانے کے اپنے طرز کو ترقی دے لی تھی اور انہوں نے محراب کی تعمیر میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ لیکن اس کی کوئی جھلک بابری مسجد میں نہیں ملتی اگر مسجد سولہویں صدی میں بنی ہوتی یعنی بابر کے دور میں اس کی تعمیر عمل میں آئی ہوتی تو اس میں اس وقت تک فن تعمیر میں جو مہارتیں حاصل کی گئیں تھیں ان کی جھلک ضرور دکھائی پڑتی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بابری مسجد کے شمالی دروازے پر ایک خاص نشان ثبت ہے۔ دروازے کے اوپر آمنے سامنے دو باگھ ہیں۔ یہ چھلانگ لگانے کی پوزیشن میں ہیں اور ان کی دم بل کھائی ہوئی ہے ان دو باگھوں کے درمیان ایک سیدھا مور ہے ٹھیک اسی طرح کے باگھ مشرقی راجاؤں کے سکوں پر بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ 1376ء میں اودھ کی ریاست ملک حسام الملک اور حسام الدین ناوا کے زیر نگیں تھیں۔ اس کے کافی دنوں بعد فیروز شاہ تغلق کی موت کے بعد پیدا ہونے والے عدم استحکام کے دوران افغان سرداروں نے آزاد ریاستیں قائم کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں۔ 1394ء کے آس پاس وزیر خواجہ جہاں نے اودھ اور بہار اور قنوج کے بیچ پڑنے والے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا جسے جونپور کو شاہی ریاست کی شکل دی گئی۔ دہلی کی خانہ جنگی کے

دوران اس نے اپنی پوزیشن اور مضبوط کی اور ایک آزاد سلطنت قائم کر لی۔ بہت ممکن ہے کہ آج جسے بابری مسجد کہا جاتا ہے اس کی تعمیر اس کے آس پاس یعنی چودھویں صدی میں ہوئی ہوگی۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز بات ہے کہ بابر جیسا خوش ذوق ایسی کسی مسجد کی تعمیر کے لیے متفق ہو گیا جس میں نہ تو کوئی کشش تھی اور نہ فن تعمیر کے اعتبار سے جسے خوبصورت کہا جا سکتا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس تنازعہ کو اچھالنے والے لوگوں نے اس بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر مان لیا کہ مندر کی جگہ مسجد بنی ہوئی ہے۔ انگریز مصنفین کی دلیل ہے کہ اجودھیا میں ہندو مندروں کو ناپاک کرنے کے پیچھے ہندوستان میں اسلام کی توسیع کا منصوبہ تھا لیکن یہ دلیل بالکل لچر ہے۔ کیونکہ کسی متنازعہ زمین پر نماز پڑھنے کی بات شرعی رو سے درست نہیں ہے ظاہر ہے اگر مندر کی جگہ مسجد بنی ہوتی تو مسجد بنانا بے معنی ہوتا کیونکہ اس میں نماز تو پڑھی نہیں جا سکتی۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وارانسی اور متھرا میں بنی متنازعہ مسجدیں بھی ٹھیک اس جگہ پر نہیں بنی ہو سکتیں، جہاں پہلے مندر تھے۔ توڑے گئے مندر کے قریب تو مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ لیکن ٹھیک اسی جگہ پر مسجد بنانا ناممکن ہے یہ مذہبی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح کی صورتحال میں کیا یہ ممکن ہے کہ بابر جیسا پکا مسلمان اور قرآن پر نظر رکھنے والا ایسی غلطی کر سکتا تھا کہ وہ اپنے نام پر اس جگہ مسجد بناتا جس جگہ ایک ہندو مندر تھا۔ سوال اُٹھتا ہے کہ پھر وہاں کیا تھا؟

## بدھ یادگار

1862 اور 1865ء کے درمیان کننگھم نے شمالی ہندوستان کے قدیم آثار کی چھان بین کی۔ ان کا بنیادی مقصد ان مقامات کی نشاندہی تھی جہاں جہاں چینی سیاح فاہیان اور ہیونگ سانگ پہنچے تھے۔ فاہیان 400ء اور 410ء کے بیچ ہندوستان آیا تھا۔ جب کہ ہیونگ سانگ 692ء میں ہندوستان پہنچا تھا۔ کننگھم اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ''شاچی'' نامی مقام جس کا ذکر فاہیان نے کیا ہے اور ''وشاکھا'' نامی مقام جس کا تذکرہ ہیونگ سانگ نے کیا ہے دراصل ایک ہی مقام ہے۔ اور جس جغرافیائی اکائی کا تذکرہ انہوں نے کیا ہے وہ کوئی اور نہیں اجودھیا ہی ہو سکتی ہے۔

کننگھم کے مطابق ''شاچی'' کے بارے میں فاہیان نے کہا ہے: ''اس شہر کے دروازے سے باہر نکل کر سڑک کے مشرقی جانب وہ مقام ہے جہاں مہاتما بدھ نے اپنی مسواک کا ایک ٹکڑا پھینک دیا تھا اور جس کے بعد اس نے بتدریج سات فٹ اونچے پیڑ کی شکل اختیار کر لی۔ وہ نہ کبھی گھٹی اور نہ

کبھی بڑھی''۔اس کا تذکرہ ہیونگ سانگ نے بھی ''وشاکھا'' کے تعلق سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''شہر کے جنوب میں اور سڑکوں کے بائیں جانب (یعنی سڑک کے پورب کی جانب جیسا کہ فاہیان نے کہا ہے) دوسری متبرک چیزوں کے علاوہ ایک چھ یا سات فٹ کا پیڑ بھی تھا۔ جو نہ کبھی گھٹتا تھا نہ کبھی بڑھتا تھا''۔ مہاتما بدھ کی مسواک کے پیڑ کے بارے میں ایک اور ثبوت بھی ہے اس پیڑ کے سلسلے میں فاہیان اور ہیونگ سانگ نے ایک ہی جیسی باتیں کہی ہیں۔ اس سے میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا کہ وہ دونوں چینی سیاح ایک ہی شہر کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ ایک نے اسے ''شاچی'' اور دوسرے نے ''وشاکھا'' کا نام دیا۔

وشاکھا ہی ساکیت یا اجودھیا ہے۔ اس کی تصدیق کے لیے میں نے مندرجہ ذیل حقائق کا سہارا لیا ہے جو اس طرح ہیں۔ ① بودھ تاریخ میں 'وشاکھا' ان مشہور عورتوں میں سے ایک رہی ہے۔ جو ساکیت کی باشندہ تھی۔ اس کی شادی شراوستی کے دولت مند تاجر مریگار کے لڑکے پورن وردھن سے ہوئی تھی۔ ② ہیونگ سانگ کے مطابق وہ ساکیت میں سولہ سال رہے۔

قدیم ہندوستان کے مشہور جغرافیہ داں پروفیسر بی.سی.لا نے بھی کننگھم کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اپنی کتاب (انڈولاجیکل اسٹڈیز حصہ 3، باب 2 الہ آباد 1994) ء میں انہوں نے کہا ہے: ''اجودھیا، اجومھایا، اجودھا ہندؤں کے سات مقدس مقامات میں سے ایک ہے۔ فاہیان نے اس شہر کو 'شاچی' کہا ہے اور ٹولومی کے مطابق یہ سوگڈا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ شہر سرجوندی کے کنارے واقع ہے یہ وشنو دھرم کے ماننے والوں کے لیے بھی ایک مقدس مقام ہے۔ پالی ساہتیہ میں مذکورہ سرجو یا سربھو اودھ کی گھاگھرا یا گوگرا ہی ہے۔''

کننگھم اپنے اس یقین پر قائم رہا کہ گوتم بدھ نے ساکیت (اجودھیا) میں قیام کیا تھا۔ بودھ سے متعلق سیلون (سری لنکا) و برما کی تاریخ کے مطابق گیان حاصل کرنے کے وقت گوتم بدھ 35 برس کے تھے۔ اس کے فوراً بعد بیس برس تک انہوں نے سنیاس کی زندگی بسر کی اور شمالی ہندوستان میں جگہ جگہ گھوم کر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے۔ اِن مقامات کا ذکر مندرجہ بالا تاریخ میں آتا ہے، اسی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کننگھم کہتا ہے:

''بیس سال تک مذہب کی تبلیغ کرنے کے بعد بقیہ پچیس برس انہوں نے بودھ مٹھوں میں گزارے۔ 9 برس سراوستی کے 'جیت بن' مٹھ میں اور سولہ برس ساکیت پور کے 'پوبھرمو' (پشپارام)

مٹھ میں برمی تاریخ میں 19 برس اور چھ برس کا ذکر ہے۔ ہیونگ سانگ نے بھی چھ برس کا ہی ذکر کیا ہے۔ بدھ کے قیام کے بارے میں یہ ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس کے مطابق صرف دو ہی مقام تھے جہاں بدھ نے قیام کیا تھا۔ پہلا سراوستی جہاں 9 یا 19 برس رہے اور دوسرا ساکیت، جہاں وشاکھا میں انہوں نے چھ برس تک قیام کیا۔ وشاکھا شراوستی سے جنوب میں کچھ دوری پر واقع ہے۔ اس طرح قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وشاکھا اور ساکیت ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔'' (آرکیولاجیکل رپورٹ صفحہ 319)

اجودھیا کے قدرتی مناظر کا ذکر کرتے ہوئے کننگھم نے یہ لکھا کہ شہر میں کچھ ٹیلوں کی موجودگی کافی معنی خیز ہے اپنی آرکیولاجیکل رپورٹ 63-1862، صفحہ 322 میں وہ لکھتا ہے:

''اجودھیا کے باقیات میں سب سے قدیم جو چیزیں ملتی ہیں وہ مین شہر کے جنوب میں قریب پون میل کی دوری پر واقع مٹی کے تین ٹیلے۔ ان کے نام ہیں ''منی پربت''، ''کبیر پربت'' اور ''سگریو پربت''، ان تینوں ٹیلوں کے ساتھ ہم اس ٹیلہ پر بھی توجہ مرکوز کریں جس پر بابری مسجد واقع ہے۔ بابری مسجد شہر کے بالکل بیچوں بیچ ایک مٹی کے ٹیلے پر واقع ہے جس کی اونچائی مشرق کی طرف بیس فٹ اور مغرب کی طرف چالیس فٹ ہے۔ اگر مغرب کی طرف دیکھا جائے تو یہ ٹیلہ ان متعدد ٹیلوں کی طرح ہے جو اجودھیا میں نظر آتے ہیں۔''

ان پہاڑوں کے بارے میں کننگھم کہتا ہے: ''برہمنوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ''منی پربت'' ان پہاڑوں میں سے ایک ہے، جنہیں بندروں نے رام کو تعاون دینے کے مقصد سے بڑایا تھا۔ ایک حادثہ کے نتیجے میں وہ کشکندھا کے راجہ سگریو کے ہاتھوں سے چھوٹ کر یہیں پر گر پڑا تھا۔ اس ٹیکے کے جنوب کی سمت میں 500 فٹ کی دوری پر ''کبیر پربت'' واقع ہے جس کی اونچائی صرف 48 فٹ ہے۔ اس کی سطح پرانی اینٹوں کے ڈھیر اور کوڑے کرکٹ کے سبب ناہموار دکھائی دیتی ہے اور کہیں کہیں گڈھے بھی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ گڈھے لوگوں کے اینٹوں کے لیے کھدائی کرنے کے سبب بن گئے ہوں۔ اینٹوں کا سائز بڑا (11 انچ 7.5 x 2) ہے۔ جنوب کی طرف ایک بڑا دائرہ نما ٹیلہ ہے جس کو ''سگریو پربت'' کے نام سے جانا جاتا ہے، زمین سے صرف آٹھ یا دس فٹ کی اونچائی پر ہے۔ ''منی پربت'' اور ''کبیر پربت'' کے بیچ ایک لمبا اور 47 فٹ چوڑا راستہ ہے۔ اس احاطے میں اینٹوں کے دو مقبرے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ ''شیث علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام پیغمبروں

کے ہیں، جنہیں پیغمبر سیٹھ اور جاب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی طرح اجودھیا کے مقامی مسلمان بھی مختلف کہاوتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً شیثؑ پیغمبر اور ایوبؑ پیغمبر کے مقبروں کے بارے میں کہی جانے والی کہانیاں اس بات کی مظہر ہیں ان مقبروں میں پہلے کی لمبائی اس وقت 21 فٹ اور دوسرے کی 12 فٹ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کی لمبائی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ابوالفضل نے ''آئینہ اکبری'' میں لکھا ہے: ''اس شہر کے پاس دو یادگاریں ہیں۔ ایک سات اور دوسری چھ ہاتھ لمبی۔ عام طور سے لوگ انہیں پیغمبر سیٹھ اور جاب کا مقبرہ مانتے ہیں اور ان کی کرامات سے متعلق متعدد کہانیاں بھی سناتے ہیں۔''

دوسری طرف 1863ء میں کننگھم نے ان دونوں مقبروں کی لمبائی بالترتیب 17 فٹ اور 12 فٹ بتائی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیثؑ پیغمبر کے مقبرے کی لمبائی جو ابوالفضل کے وقت ساڑھے دس فٹ تھی وہ بڑھ کر کننگھم کے وقت میں (1863ء) میں 17 فٹ ہوگئی اور اب (1987ء میں) یہی 21 فٹ ہے۔

کننگھم کا خیال ہے کہ یہ مقبرے حقیقت میں حضرت شیثؑ اور حضرت ایوبؑ کے نہ ہوکر ان فوجیوں کے ہیں جو ابتداء میں ترک حملہ آوروں کے ساتھ یہاں آئے اور مارے گئے۔ اسلامی روایات کے تحت مارے جانے والے فوجیوں کو سڑک کے کنارے ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ کننگھم کے مطابق مقبروں میں استعمال کی گئی اینٹیں کافی پرانی ہیں۔ اس لیے ان کو یقین ہوگیا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں گوتم بدھ نے مسواک کا درخت لگایا تھا۔ وہ کہتا ہے:

> ''فاہیان کے مطابق وہ مقام جہاں بدھ کا متبرک درخت پیدا ہوا تھا وہ سڑک مشرق کی طرف تھی جو شہر کے جنوبی دروازے کی طرف ہے۔ ہیونگ سانگ نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق درخت شہر کے جنوب کی طرف، اور سڑک کے بائیں طرف ہے۔''

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹیلے جو اب بھی خستہ حالت میں موجود ہیں۔ شہر کی جنوبی سڑک کے بائیں جانب ہیں۔ اس لیے صورت حال بلاشبہ ویسی ہی ہے جیسی کہ چینی سیاحوں نے بیان کی ہے، چونکہ ان ٹیلوں کی حالت کی تفصیل ہیونگ سانگ کے بیان کے حوالے سے پوری طرح ملتی ہے۔ اس لیے ان کی شناخت کے بارے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہ جاتا۔''

کننگھم کا یہ یقین ہے کہ احاطے کے اندر چار مقبرے دو شیثؑ اور ایوبؑ پیغمبر کے اور دو حضرت ایوبؑ کے لڑکوں کے ہیں۔ انہیں چار چبوتروں پر بنائے گئے ہیں جہاں پر پہلے کے چار بدھ اپنا آسن لگاتے تھے۔ کننگھم کہتا ہے:

''ہیونگ سانگ نے اپنے تفصیلی بیان میں بدھ کی متبرک مسواک کے درخت اور چار چبوتروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے یہ دونوں ایک عظیم استوپ کے نزدیک ہیں یہ مقام اور کہیں نہیں بلکہ اسی احاطے میں تھے۔ جہاں ایوبؑ پیغمبر سیٹھ اور جاب کے مقبرے ہیں یہ احاطہ ''منی پربت'' کے جنوبی کنارے کو چھوتا ہے۔ یہ دونوں مقبرے پہلے کے چار بدھوں کے آسن کے ہی باقیات ہیں۔

جس عظیم استوپ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کننگھم کے مطابق وہ سمراٹ اشوک کا استوپ تھا اور یہ دوسو فٹ اونچا تھا اور یہ اسی مقام پر بنایا گیا تھا جہاں ساکیت (اجودھیا) میں اپنے چھ برس تک قیام کے دوران مہاتما بدھ نے مذہب کی تبلیغ کی تھی۔ کننگھم کے مطابق یہی ''منی پربت'' ہے۔ جو اب بھی 65 فٹ اونچا ہے۔ اور اتنا ہی اور اونچا رہا ہوگا۔ اگر اس کے دھات کی لمبائی کو بھی شمار کیا جائے تو استوپ کی کل لمبائی بلا شبہ دوسو فٹ تک ہوگی۔ ہیونگ سانگ کے مطابق اس استوپ کو سمراٹ اشوک نے بنوایا تھا اور اس کو غلط ماننے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ آدھا مٹی اور آدھا پکا ہونے سے یہ بلاشبہ کافی قدیم ہی ہوگا۔ ممکن ہے عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے کا ہو۔ میرے یقین کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ اشوک کے دور کی سبھی یادگاریں جن کا ذکر ہیونگ سانگ نے کیا ہے اور جنہیں بھلسا کے نزدیک میں نے اپنی کھدائی کے دوران پایا وہ یا تو پتھر کے بنے تھے۔ یا اینٹ کے اس لیے مٹی کے ٹیلے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ استوپ اور بھی پہلے بنا تھا۔ لیکن کسی بھی حالت میں یہ عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو سال پہلے کا نہیں ہوسکتا۔ اجودھیا میں موجود ''منی پربت'' کے متعلق میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ٹیلا اور اس کا نچلا حصہ بودھ مذہب کے ابتدائی دور کا بنا ہوا ہے۔ اس کا اوپری حصہ بعد میں اشوک کے ذریعہ جڑوایا گیا ہوگا۔ ''منی پربت'' کے وسط سے مجھے اینٹ کا ایک ٹکڑا ملا تھا جس پر انتہائی پرانا حرف (شا) تحریر تھا۔ لیکن چونکہ یہ اشوک کے عہد سے کافی بعد کا ہے اس سے وہ اینٹ درحقیقت ''منی پربت'' کی معلوم نہیں ہوتی۔

بہت حد تک کننگھم ان مقامات کو پہچاننے میں کامیاب ہوا جن کا فاہیان اور ہیونگ سانگ نے ذکر کیا ہے۔ ہیونگ سانگ کے مطابق اجودھیا میں بودھ دھرم اور ہندوؤں کی متعدد صحت مند روایات

موجود تھیں۔ وہاں پر تین ہزار بودھ بھکشوؤں والے بیس بودھ مٹھ اور پچاس سناتنی ہندو مندر تھے۔ ہیونگ سانگ نے ایک ایسے مٹھ کا بھی تفصیل کے ساتھ حوالہ دیا ہے جو یا تو ساکیت یا ''کالکارام'' یا ''پوروارام'' مٹھ تھا۔ دونوں کا ذکر سیلون کے ''مہاونسوں'' میں بھی آتا ہے۔ کننگھم کے مطابق یہ مٹھ ہی اب ''سگریو پربت'' کی شکل میں موجود ہے۔ جس کے بغل میں اشوک کا استوپ ہے۔

کننگھم کہتا ہے: ''جس پہلی یادگار کا ذکر ہیونگ سانگ نے کیا ہے وہ ایک گمنام عظیم مٹھ ہے لیکن چونکہ اپنی عظمت کے سبب وہ ایک اہم مٹھ تھا اس لیے غالباً یہ ساکیت کا ''کالکارام'' یا ''پوروارام'' مٹھ رہا ہوگا۔ جس کا ذکر سیلون کے ''مہاونسی'' میں آتا ہے۔ اس مٹھ میں رہنے والے ''ہم خیال'' مٹھ کے تھے اور یہ مٹھ تین مشہور بودھ عقلیت پسندوں کو پیدا کرنے کے لیے مشہور تھا۔ موجودہ سگریو پربت ہی اس مٹھ کا باقی بچا ہوا حصہ ہے۔ یہ پانچ سو فٹ لمبا اور دو سو فٹ چوڑا ہے۔ اس کی وسیع پیمائش اور دائرہ کار بناوٹ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ضرور ہی ایک مٹھ رہا ہوگا۔ اس کی اندرونی دیوار اور کمروں کے نشانات جو احاطے میں چاروں طرف نظر آتے ہیں اس سلسلے میں بھی کسی طرح کے شبہے کو دور کر دیتے ہیں''۔

کننگھم آگے لکھتا ہے: ''ہیونگ سانگ نے جس آخری یادگار کا ذکر کیا وہاں پر بدھ کے بال اور ناخن رکھے گئے ہیں، ہیونگ سانگ کے مطابق یہ یادگار مختلف چھوٹی چھوٹی یادگاروں سے گھری ہوئی تھی۔ جو ایک دوسرے سے مربوط تھیں۔ وہاں پر کئی تالاب بھی تھے جن کے پانی میں ان مقدس یادگاروں کی پرچھائیں جھلکتی تھی۔ اس ٹیلے کی بناوٹ جس پر بابری مسجد قائم ہے اس استوپ کے ذکر سے مشابہت رکھتی ہے جہاں گوتم بدھ کا بال اور ناخن رکھا گیا تھا۔ شہر کے ٹھیک وسط میں قائم دیگر چھوٹے چھوٹے ٹیلوں سے گھرا ہوا یہ ٹیلہ اس نتیجہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہی وہ استوپ رہا ہوگا۔ بابری مسجد کے مغرب کی طرف ایک ندی کا پربت بھی دکھائی دیتا ہے ممکن ہے پرانے زمانے میں یا تو وہاں ندی بہتی رہی ہوگی یا وہاں ایک بڑا تالاب رہا ہوگا جس میں مٹھ منعکس ہوتا تھا۔ ہمیں یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ایسے معاملوں میں صحیح بات اور حقیقت کا پتہ آثار قدیمہ کی تلاش یا کھدائی کے ذریعہ ہی چل سکتا ہے فی الحال ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ متنازعہ مسجد یا مندر ایک ٹیلے پر قائم ہے اور اگر ہم کننگھم اور ہیونگ سانگ کے دلائل کو مان کر چلیں تو ہوسکتا ہے کہ سارے تنازعے کی کنجی اس ٹیلے میں پوشیدہ مل جائے۔

## انگریزوں کا کردار

اس نتیجے پر پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ اودھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان علحدگی کی چنگاری انگریزوں کے داخلے کے ساتھ ہی سلگنی شروع ہوگئی تھی۔ 1856ء میں اودھ کے انضمام سے پہلے ہندو اور مسلمان اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہتے تھے۔ برصغیر ہند میں خاص کر اودھ میں ایسی روایت تھی کہ کئی اونچے خاندانوں میں ایک بھائی ہندو رہتا تھا تو دوسرا اسلام قبول کر لیتا تھا۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ مختلف برہمن، راجپوت اور کایستھ خاندانوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پسماندہ ذاتوں کے ایسے ہندوؤں کی بھی تعداد کم نہیں تھی جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن ان کو نہ تو ''اشراف'' مانا گیا اور نہ انہوں نے عربی نام اپنائے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس علاقے میں لگان وصول کرنے والوں اور زمینداروں کی حیثیت ہندوؤں کو ہی حاصل رہی۔

اودھ میں فرقہ وارانہ صورت حال اس وقت بگڑنے لگی جب رام جنم بھومی بابری مسجد کا سوال پیدا کیا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پہلی خوں ریز جنگ 1853ء اور 1855ء میں ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ واقعات اس وقت ہوئے جب اجودھیا میں ایک خاص مقام کے سلسلے میں دونوں فرقوں نے متضاد دعوے کیے تھے۔ ہنومان گڑھی کے مہنت نے دعویٰ کیا کہ رام کا جنم اس جگہ ہوا تھا جہاں بابری مسجد بنی ہوئی تھی۔ (دیکھئے گزیٹیر آف دی پراونس آف دی اودھ، 3 جلدیں، کلکتہ 1877ء، ڈسٹرکٹس گزیٹرس آف دی یونائیٹڈ پرونسز آف آگرہ اینڈ اودھ بارہ بنکی جلد 68، ایچ.آر. نیول الہ آباد 1904ء)

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اودھ کے انضمام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے لکھنؤ کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل سلیمن نے جو رپورٹ تیار کی اس میں 1853-1855ء کے فرقہ وارانہ فسادات کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ کرنل سلیمن نے 1854-55 میں اس صوبے کا دورہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ یہاں امن و قانون کی صورت حال بہت خراب ہوگئی ہے۔ کرنل کا خیال تھا کہ دیہات میں نواب (اودھ) کا کوئی اثر نہیں رہا اور وہاں جان و مال کا کوئی تحفظ نہیں ہے۔ یہ رپورٹ جانبدارانہ تھی۔ اس کے ثبوت میں حال کے دو تجزیاتی مطالعے ''دی راج. انڈین میونی اینڈ دی کنگڈ آف اودھ، 1801-1856ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1977ء (میں کہا گیا ہے کہ سلیمن نے حالات کی جو تفصیل پیش کی تھی۔ دوسری کتاب ''اودھ ان رپورٹ 1854-58ء: اے اسٹڈی آف پاپولر ریزسٹنس'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی 1884ء) میں اے.آر.مکھرجی نے یہ بات کی ہے کہ انگریزوں کے خلاف

عام بغاوت کے جذبات دیہی علاقوں تک پھیل گئے تھے جس کا انجام 58-1857 کے غدر کی صورت میں سامنے آیا، لیکن بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ کے سبب جو معاملہ بھڑکا اس کو اودھ سے انضمام ضروری ثابت کرنے کے لیے انگریز افسروں نے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں کہا، انضمام سے کچھ پہلے جو واقعات ضلع میں ہوئے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نراج پھیلا ہوا ہے۔ اگر حکومت کا کوئی اثر ہوتا تو اس طرح کے واقعات قطعاً نہ ہوتے۔ (گزیٹیر آف ڈسٹرکٹ فیض آباد، ایچ. آر. نیول) بابری مسجد شری رام جنم بھومی کو لے کر جو تصادم ہوا اس کی پوری تفصیل ایچ. جے. یوآس نے بیان کی ہے (اس تفصیل کی تصدیق بارہ بنکی ضلع کے دریا آباد پرگنہ میں رام پور کے تعلقہ دار رائے مہادیو یالی نے کی ہے) یہ واقعہ 1853ء میں ہوا تھا اس کا سبب اجودھیا کی اس زمین کو لے کر مہنتوں اور مسلمانوں کے درمیان وقتاً فوقتاً ہونے والے جھگڑے تھے جس پر بابری مسجد کھڑی ہے۔ ہندو مہنتوں کا کہنا تھا کہ بابر نے رام جنم استھان مندر کو گرا کر یہاں مسجد بنوائی تھی۔ کہا یہ بھی گیا کہ اورنگ زیب نے دوسرے مندروں (سورگ دوار، جہاں سے رام سورگ گئے تھے اور ترتیا کا ٹھاکر، جہاں رام نے مہا یکیہ کیا تھا) کو توڑ کر مسجدیں بنائی ہیں، لیکن چونکہ یہ مسجدیں منہدم ہو گئی تھیں اس لیے ان پر قبضہ کرنے کے لیے کشمکش کے حالات پیدا کرنا مہنتوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ چونکہ بابری مسجد کی جگہ ہندوؤں کے لیے خاص طور پر مقدس بتائی گئی تھی اس لیے بیراگیوں (وشنو کے ماننے والوں اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا)۔ صورت حال اس وقت اور بگڑ گئی جب ایک مہنت کو برادری سے نکال دیا گیا۔ وہ لکھنؤ پہنچا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس نے افواہ پھیلائی کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کو منہدم کر دیا ہے۔

اس سے جذبات بھڑکنے شروع ہو گئے۔ نکالا گیا مہنت مولوی امیر علی سے ملا جو اس وقت لکھنؤ میں تھے، دونوں نے قسم کھائی کہ بابری مسجد کو ہندوؤں سے چھڑا کر دم لیں گے۔ یہ مہنت جو اجودھیا میں اپنی اہانت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مولوی امیر علی کو لگا کہ اپنا سکہ جمانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ مولوی امیر علی اکبر کے عہد کے مشہور صوفی شیخ بندگی میاں کے خاندان سے تھے۔ شیخ بندگی میاں سے اکبر ملا تھا اور انہیں لگان معاف زمین دی تھی۔ اسی زمین پر اپنا حق جتانے کے لیے مولوی امیر علی لکھنؤ پہنچے تھے انہوں نے سوچا تھا کہ بابری مسجد کو آزاد کرانے کی کوششوں سے نواب متاثر ہوگا اور لگان معاف زمین ان کو مل جائے گی۔

مولوی امیر علی کا امیٹھی میں خاصا رعب و دبدبہ تھا۔ وہ جیسے ہی امیٹھی پہنچے انہوں نے بابری مسجد کو آزاد کرانے کے لیے جہاد کا اعلان کر دیا، اجودھیا کے بیراگیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں اور پچھڑی ذات کے ہندوؤں کی فوج اکٹھا کرنے کی اہلیت امیر علی میں تھی اس کا علم نواب واجد علی شاہ کو ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے حکم دیا کہ فیض آباد کے واقعات کی فی الفور رپورٹ دی جائے، لیکن انہیں اس طرح کی کوئی رپورٹ نہیں ملی، غالباً فیض آباد کے انگریز ریزیڈنٹ جیمسن اولڑم کے روز افزوں اثر کے سبب نواب کا اثر کم ہو گیا تھا۔

نواب کو فکر لاحق ہوئی اس نے امیٹھی کے بدر الدولہ سے کہا کہ وہ مولوی امیر علی کو لکھنؤ لائیں۔ نواب واجد علی شاہ خونی فرقہ وارانہ تصادم کے خطرے سے واقف تھا اس لیے اس نے اعلان کیا کہ اجودھیا میں کوئی تصادم اور تشدد کا واقعہ نہیں ہونا چاہئے۔ نواب نے یہ حکم بھی دیا کہ متنازعہ مسجد امام کو سونپ دی جائے۔ لیکن نواب کی یقین دہانی سے مولوی امیر علی مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنی مانگ جاری رکھی کہ مسجد کو بلا تاخیر آزاد کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی فوج جمع کی اور بارہ بنکی ضلع میں صفدر جنگ سے تین میل شمال میں واقع ایک گاؤں بانسہ کی جانب کوچ کر دیا۔ بانسہ میں کچھ اور لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور ان کی مقبولیت بڑھ گئی۔

مولوی کی فوج کو بڑھتا دیکھ کر نواب واجد علی شاہ پریشان ہو گئے، انہوں نے انگریز ریزیڈنٹ سے درخواست کی کہ امیر علی کو جیسے بھی ہو روکا جائے لیکن امیر علی اپنی ضد پر اڑے رہے کہ مسجد کی فوری واپسی پر ہی وہ رک سکتے ہیں۔ ان واقعات کے دوران انگریز ریزیڈنٹ نے گورنروں کی کونسل سے درخواست کی کہ وہ بابری مسجد کے سلسلے میں ہدایات جاری کرے۔ کونسل نے ریزیڈنٹ کو مشورہ دیا کہ اس معاملہ میں وہ کوئی پہل نہ کرے اور خود نواب کو پہل کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن بکسر کی جنگ کے بعد انگریزوں کے ساتھ 1765ء میں نواب سراج الدولہ کے تعاون کے معاہدے نے نواب کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس لئے ان کے پاس پہل کرنے کے لیے عملاً کچھ تھا ہی نہیں، نتیجہ کے طور پر اجودھیا میں صورت حال جوں کی توں بنی رہی۔ جب ایک مہینے کے بعد مسجد بیراگیوں کے ہی قبضے میں رہی تو مولوی امیر علی نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا وہ کوچ کر کے دریا آباد پہنچے اور وہاں بیس دن رہے۔ انگریزوں کی خاموشی کو دیکھ کر نواب بے حد پریشان تھا۔ مولوی کو راہ پر لانے کے لیے نواب نے چار فوجی ٹکڑیوں کو بھیجنے کا حکم دیا۔ نواب کی فوجوں کی آمد سے مولوی

امیر علی کے فوجی خوف زدہ ہو گئے اور ان کی تعداد نصف کی حد تک گھٹ گئی۔ باقی بچے لوگ اپنی لیڈر کے ساتھ ڈٹے رہے۔ وہ اجودھیا پہنچ کر بیراگیوں کے مرکز ہنومان گڑھی کو تباہ کرنے پر آمادہ تھے۔ حالات کے اتنا طول پکڑنے کے بعد انگریزوں نے اپنی خاموشی توڑنے کا فیصلہ کیا۔ حیات نگر کے پاس کرنل بارلو کی قیادت میں نواب کی فوجوں کے ساتھ مولوی کے لوگوں کا ٹکراؤ ہوا اور مولوی امیر علی کرنل بارلو کے ہاتھوں نماز میں مارے گئے۔ اور ان کا سر واجد علی شاہ کے پاس بھجوا دیا گیا۔ مولوی امیر علی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اودھ کے انضمام کے کچھ برس بعد ان کی یاد میں ردولی کے رحیم گنج میں ایک میلہ لگنے لگا۔ اس میلے میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ پہنچتے تھے۔ لیکن 1905ء تک آتے آتے یہ میلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

1850ء میں متنازعہ مقام کو لے کر ایک بار پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصادم ہوا۔ مسلمانوں نے بابری مسجد کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور ہنومان گڑھی پر بھی حملہ کر دیا۔ وہ مندر کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے لیکن کافی نقصان اُٹھانے کے بعد انہیں لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد ہندوؤں نے بابری مسجد پر جوابی حملہ کیا۔ پھر حکومت کی مداخلت سے دونوں فرقوں کے بااثر لوگوں نے ایک سمجھوتہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ دونوں فرقوں کے لوگ اس جگہ پر پوجا، نماز ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن 1857ء کے غدر کے بعد انگریزوں نے اس سمجھوتے میں تبدیلی کر دی۔

1857ء کے غدر نے انگریز حکمرانوں کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ اس لیے اپنی جنگی پالیسی کے مطابق انہوں نے ان ہندوستانیوں کو انعام سے نوازنا مناسب سمجھا جنہوں نے ''باغیوں'' کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔ جب فیض آباد میں بغاوت بھڑکی تھی تو زمیندار تو غیر جانبدار رہے لیکن مہنتوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے انگریزوں کو پناہ دی تھی۔ اور ان کو ساز و سامان فراہم کیا تھا۔ بغاوت کو کچلنے کے بعد انگریز حکومت نے اپنے ہندوستانی مددگاروں کو انعامات سے نوازا۔ مہنتوں کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ انہیں بابری مسجد کے سامنے ''نزول'' (سرکاری) زمین پر حق ملکیت دے دیا گیا۔

علاوہ ازیں جنم استھان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے انہیں بابری مسجد کے سامنے ایک چبوترہ بنانے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اس کے بعد بابری مسجد اور رام جنم استھان پر بنے چبوترے کو الگ کرنے کے لئے ایک آڑ (گیرل) کھڑی کر دی گئی۔ اس طرح انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں

کے درمیان علیحدگی پسندی کا جان بوجھ کر موقع فراہم کیا۔ 1859ء کے بعد مسجد کے شمالی دروازے سے صرف مسلمان ہی اندر جا سکتے تھے۔ انگریزوں نے 1855ء میں ہوئے معاہدے کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی مقامات کو الگ الگ دو حصوں میں کیوں تقسیم کیا۔ اس کے محرکات کیا تھے؟ 1855ء کا معاہدہ ٹھیک چل رہا تھا اور دونوں فرقے خوش تھے۔ اس کے باوجود انگریزوں نے مسجد اور چبوترے کے بیچ آڑ کھڑی کر کے دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈال دی۔ انگریزوں کی نیت پر اس بات سے اور بھی شک ہوتا ہے کہ بابری مسجد جس زمین پر کھڑی ہے، اس پر حکومت کا حق تھا۔ بابری مسجد کے سامنے کی ساری زمین بھی نزول کی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہندو مہنتوں کو چبوترا کھڑا کرنے کے لیے اس میں سے ایک حصہ دے دیا۔ یہ تاریخی حقائق واضح طور پر بتاتے ہیں کہ انگریزوں نے اس علاقے میں ہندو احیاء پرستی کی حوصلہ افزائی کی۔

اجودھیا میں ہندو احیاء پرستی کی حوصلہ افزائی تلسی داس کے ''رام چرت مانس'' کی مقبولیت کے ساتھ شروع ہوئی۔ 1665ء میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان تعاون کے معاہدے سے اسے تقویت حاصل ہوئی۔ تاریخ فرح بخش کے مطابق اس صلح کے بعد نواب نے انگریزوں کے شکنجے کو ڈھیلا کرنے کے لیے کھلے عام کوششیں شروع کر دی تھیں۔

اسی کے آس پاس اجودھیا میں ہندوؤں کے مختلف طبقے قائم اور بڑھنے شروع ہو گئے۔ 1861ء تک اجودھیا میں بیراگیوں کے سات اکھاڑے تھے۔ ان میں ''نرمانی اکھاڑا'' ہنومان گڑھی میں، اور ''نموہی اکھاڑا'' رام گھاٹ اور گپتار گھاٹ میں تھا۔ ان کے علاوہ ''دگمبری''، ''دکھاکھی''، مہا نربانی اور ''سنتوکھی'' اکھاڑے بھی تھے۔ نواب سراج الدولہ اور نواب آصف الدولہ نے ان اکھاڑوں کو کافی زمینیں نذرانے کے طور پر دی تھیں اور دوسری سہولتیں بھی فراہم کی گئیں تھیں۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ فیض آباد ضلع میں فقیروں، گوسائیوں اور بیراگیوں کی کل ملا کر 47 جگہوں پر زرعی جائداد تھی، ان مختلف فرقوں میں نربانی سب سے دولت مند مانے جاتے تھے، ان کے پاس فیض آباد، گونڈا، بستی پرتاپ گڑھ اور شاہجہانی پور میں کافی زمینیں تھیں۔ یہ طبقہ ہاتھیوں اور روپیہ اُدھار دینے کا بہت بڑا کاروبار کرتا تھا اور اس آمدنی سے انہوں نے متعدد گاؤں خرید لیے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نوابوں نے اجودھیا میں ہندو احیاء پرستی کو کافی بڑھاوا دیا۔ انگریزوں

نے اسے ایک تیز آندولن مان کر بڑھنے دیا۔ 1819ء میں اودھ کا موضع انگریزوں کے قبضے میں آ گیا اور اس کے بعد "نموہیوں" نے متنازعہ شری رام جنم بھومی پر قبضہ کرنے کے لیے سرگرم ہونا شروع کر دیا۔

1853ء اور 1855ء کے درمیان ہونے والی جھڑپیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں روز افزوں شدت پسندی کا ثبوت ہیں۔ 1857ء کی بغاوت سے انگریزوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا بھلا عوام میں پھوٹ ڈالنے میں ہی ہے۔ نتیجے کے طور پر انگریزوں نے ہندوؤں کو خوب بڑھاوا دیا تا کہ وہ بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی کا دعویٰ کرتے رہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انگریزوں کی حکمت عملی کا ہی ایک حصہ تھا کہ اپنی حکومت کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے "مغلوں کے وقار کو خاک میں ملائیں"۔

انگریزوں کا دعویٰ تھا کہ وہ غیر مہذب ہندوستانیوں کو مہذب بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ جدید سائنس اور ادب کی تعلم اور عیسائیت اختیار کرنے سے ہندوستانیوں کی حالت میں سدھار ہوگا۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ کوشش کی کہ ہندوستانی ادب، فلسفہ اور تاریخ گھٹیا لگنے لگے۔ اسی لیے کالی داس، کبیر، امیر خسرو اور غالبؔ جیسے شعراء کا مذاق بھی اُڑایا گیا۔ ان کو مغربی شعراء کے مقابلے میں گھٹیا دکھانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستان کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہوں کے وقار کو بھی مٹی میں ملانے کی انگریزوں نے بھرپور کوشش کی کیوں کہ وہ اپنے سامراج کی عظمت کو ثابت کرنے کے راستے میں مغل سلطنت کو سب سے بڑی رکاوٹ مانتے تھے۔



# بابری مسجد یا رام جنم بھومی؟ تاریخ دانوں کی نظر میں

زیر نظر وقیع تحریر ہندوستان کے چوٹی کے چار مورخین ❖ پروفیسر آر.ایس شرما (ریٹائرڈ) شعبہ تاریخ دہلی یونیورسٹی، چیئرمین آئی.سی.ایچ.آر، ❖ پروفیسر ایم.اطہر علی (ریٹائرڈ) شعبہ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، سابق چیئرمین آئی.سی.ایچ.آر ❖ پروفیسر ڈی.این جھا شعبہ تاریخ، دہلی یونیورسٹی، دہلی اور ❖ پروفیسر سورج بھان دی ویکلی آف سوشل سائنسز، کروکشیتر یونیورسٹی، ہریانہ کی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ انہوں نے بابری مسجد مسئلے کے سلسلے میں ''قوم کے نام تاریخی تحقیق'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ اس سیر حاصل تحریر میں وشو ہندو پریشد کے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تعلق سے تمام تر دعوؤں کا تفصیل سے تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے پہلے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ماہرین تاریخ نے بھی ایک انگریزی پمفلٹ بعنوان ''تاریخ کا غلط استعمال'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ انہوں نے بھی بابری مسجد کو رام جنم بھومی قرار دینے کے دعوؤں کی قلعی کھول دی تھی۔ زیر نظر مقالے میں ان کی تحریر کا خلاصہ بھی آ گیا ہے، اس لیے قارئین کی خدمت میں اس طویل تحریر کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پڑھتے وقت یہ ذہن میں رہے کہ یہ تحریر اب سے کئی سال پہلے لکھی گئی تھی۔ (مرتب)

گذشتہ کئی سالوں سے ملک بھر میں وشو ہندو پریشد اور اس کی اتحادی پارٹیوں کی جانب سے ایک خوفناک احتجاجی اور اشتعال انگیز مہم چلائی جا رہی ہے۔ جس کا محور بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ ہے، جس کے نتیجہ میں مہلک فسادات ہو رہے ہیں اور ہزاروں انسانی جانیں ضائع ہو گئی ہیں۔ آزادی کے بعد پہلی بار ملک کا سیکولر ڈھانچہ خطرہ سے دوچار ہو گیا ہے۔ اور یہ سب سولہویں صدی کی ایک عمارت کے (جواب منہدم کر دی گئی) کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ وشو ہندو پریشد کا مطالبہ ہے کہ اس مسجد کا ڈھانچہ جسے بابری مسجد کہا جاتا ہے اور جو 1528-29ء میں تعمیر ہوئی، ٹھیک اسی جگہ کھڑا ہے جہاں بھگوان رام پیدا ہوئے تھے (رام جنم بھومی یا جنم ا-ستھان) اور اس مقدس مقام پر ایک رام مندر تھا جو مسجد کی تعمیر کے لئے منہدم کر دیا گیا۔ اب سے 450 سال پہلے ہندوؤں کے ساتھ ہوئی اس تاریخی زیادتی کی تلافی یوں ہو گی کہ مسجد کو گرا کر اس کی جگہ شاندار مندر تعمیر کیا جائے۔ اس پورے تنازعہ کا قانونی پہلوؤں اور مضمرات کو سر دست الگ رکھ کر (واضح رہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ کے سامنے یہ پورا کیس ہے) ہم اس کے تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہیں جس

کے بارے میں وشو ہندو پریشد کا دعویٰ ہے کہ تاریخ کا فیصلہ اس کے حق میں ہے۔

نازک صورت حال کے پیش نظر حکومت ہند نے دسمبر 1990ء میں وشو ہندو پریشد اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی سے مذاکرات شروع کیے اور فریقین کے نقطۂ نظر کے تاریخی اور قانونی استناد کا جائزہ لینا چاہا اور اس طرح ایک تاریخی حقیقت پر تنازعہ کا فیصلہ اب یوں ہوگا کہ فریقین اپنا مقدمہ رکھیں گے اور حکومت ریفری کا کام انجام دے گی، نہ کہ تاریخ دانوں کا کوئی آزاد فورم۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اچھی بات نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم نے حکومت سے اس سلسلہ میں رجوع کیا اور مطالبہ کیا کہ تاریخی وقائع سے متعلق فیصلہ کیلئے غیر جانبدار مورخین کو بھی شامل کیا جائے، اور ہمیں وہ پورا مواد دیکھنے کا موقع دیا جائے جو اس سلسلہ میں سرکاری اداروں مثلاً آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے جمع کیا ہے، افسوس ہے کہ حکومت اس مطالبہ کے جواب میں بالکل خاموش رہی، جب کہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے آزاد تاریخ دانوں کی تحقیق کو مان لینے اور اس کے مطابق عمل کا اعلان کیا۔ لیکن وی. ایچ. پی نے اس پوزیشن کو قبول نہیں کیا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قوم کے سامنے صحیح تاریخی حقائق غیر متعصبانہ طور پر لانا ضروری ہے۔ تاکہ لوگ تاریخی حقائق کے سلسلے میں اندھیرے میں نہ رہیں۔ وی. ایچ. پی اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے ذریعہ حکومت کو پیش کردہ شہادتیں ہم نے غور سے دیکھیں اور اپنے طور پر بھی تاریخی مواد جمع کیا۔ ہم میں سے دو لوگ اجودھیا گئے اور بابری مسجد کے ڈھانچہ کا جائزہ اور سروے کیا، ساتھ ہی پروفیسر اے. کے. نارائن کے اجودھیا سروے اور کھدائیوں کے ذریعہ فراہم کردہ مواد کو بھی دیکھا جو بنارس ہندو یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ پروفیسر بی. بی. لال کی اجودھیا کھدائیوں کا مواد ہماری طرف سے پوری کوشش کرنے کے باوجود بھی ہمیں فراہم نہیں کیا گیا اور ہمیں اس کی مطبوعہ رپورٹوں پر ہی انحصار کرنا پڑا۔ اس کوشش کے بعد اپنی تحقیق کے نتائج کو ہم پوری عاجزی کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ کم از کم ہمیں یہ اطمینان تو ہوگا کہ اپنے مقدور بھر ہم نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

وشو ہندو پریشد کا مقدمہ بنیادی طور پر ذیل کے چار دعوؤں پر مبنی ہے۔

① ہندو ہمیشہ اور یقیناً بابری مسجد کی تعمیر سے ایک لمبے زمانے پہلے ہی، سے یہ مانتے رہے ہیں کہ اجودھیا میں ایک مقدس مقام ہے جہاں بھگوان رام پیدا ہوئے۔

② یہ مقام وہی ہے جہاں اب بابری مسجد قائم ہے۔

③ اس مقدس مقام پر بابری مسجد کی تعمیر سے بہت پہلے رام کے نام موسوم ایک مندر کھڑا تھا۔

④ اس جگہ مسجد کی تعمیر کی غرض سے مندر کو توڑ ڈالا گیا۔

اسی ترتیب سے ہم ان چاروں دعووں کا جائزہ لیں گے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دعویٰ ① اور ② میں کتنی جان ہے، یعنی یہ بات کہ اجودھیا میں رام مندر کا تصور ہمیشہ سے ہندوؤں میں رائج رہا اور اسی طرح یہ کہ اسی مندر کو توڑ کر مسجد بنائی گئی۔

## ہندو کتابوں میں اس دعویٰ کی کوئی بنیاد نہیں

لوگوں کو حیرانی ہوگی جب انہیں پتہ چلے گا کہ وی.ایچ.پی اپنے دعویٰ کے حق میں سنسکرت لٹریچر سے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکی۔ اگر ہندوؤں میں اجودھیا کے تقدس اور رام مندر کے وجود سے متعلق کوئی مستحکم روایت رہی ہوتی، تو لازمی بات تھی کہ وشنو فرقہ کے لٹریچر میں اجودھیا کی زیارت کے لئے بہت سے تاکیدی نصوص پائے جاتے۔ ایسے کسی بھی حوالہ کا نہ ہونا رام جنم استھان کے تصور کی قدامت کو بالکل مشکوک بنا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی مشکوک ہے کہ یہ تصور اٹھاریں صدی سے رائج رہا ہو جیسا کہ ہم اگلی سطور میں دیکھیں گے۔

مذکورہ دونوں دعووں کی تائید میں وی.ایچ.پی کے ماہرین لے دے کر ''اسکند پران'' کا سنسکرت نص ہی پیش کر سکے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'اسکند پران' میں اجودھیا کی زیارت کے فضائل بتائے گئے ہیں۔ جسے اجودھیا مہاتمیا کہا جاتا ہے۔ ہم نے اسکند پران کا مطبوعہ نسخہ دیکھا (کاشیرین ایڈیشن ممبئی 1910ء) اور وہ دونوں نسخے بھی دیکھے جو ورندابن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہیں اور بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ سب نسخے حال کے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اسکند پران کے اجودھیا مہاتمیا باب میں کم از کم اٹھارویں صدی تک تحریف کی جاتی رہی ہے اور چیزوں کا اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ اسکند پران کے داخلی مضامین بشمول ودیاپتی کے تذکرہ کے، جو سولہویں صدی کے نصف اوّل میں گزرا ہے، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خود اس ''پران'' کا مرکزی حصہ تک بھی سولہویں صدی سے پہلے مدون نہیں ہو سکا تھا۔ اسی طرح اجودھیا مہاتمیا یا جو مطبوعہ نسخہ میں ہے، وہ بھی صرف ایک آدمی کے ذریعہ مدون نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر عام مقدس مقامات کے بیان میں اچانک رخ موڑ کر اجودھیا کی تقدیس و تمجید شروع کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح خود اجودھیا کے فضائل اور سرجو

ندی میں نہانے کے فضائل بھی ایک ہی جگہ پر نہیں دیے گئے بلکہ دو جگہوں پر وہاں دیے گئے ہیں جہاں سیاق وسباق کا کوئی تعلق ''سرجو'' سے نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مقدس مقامات کے تذکرہ میں راوی کی حیثیت سے اگستیہ کی جگہ اچانک وشسٹھ لیتا ہے، اور اس کے بعد پھر اگستیہ کی روایت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ردوبدل لازماً کیا گیا ہے۔

جنم استھان کا بیان اجودھیا مہاتمایا کے آخری باب (اشلوک 18 تا25) میں پڑتا ہے، جو واضح طور پر بعد کا اضافہ ہے اور نصوص کے آخر میں اضافہ کرنا آسان بھی ہوا کرتا ہے۔ تاہم ان مختلف مشکلات کے باوجود اگر ہم اجودھیا مہاتمایا میں رام جنم بھومی کے مقام کو تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ بابری مسجد کے محل وقوع سے بالکل الگ ہوگا۔ رام کی جائے پیدائش کے لیے دولفظوں، جنم استھان اور جنم بھومی کا استعمال کیا گیا ہے۔ اگر دونوں ناموں کو شناخت کے بطور لے لیں تب بھی رام جنم بھومی کی اجودھیا مہاتمایا میں دی گئی معلومات بابری مسجد کی جگہ کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ بندرابن اور بوڈلین مہاتمایا کے دونوں نسخے اس مقام کے احاطہ کا رخ اور دوری کئی بیانات سے واضح کرتے ہیں۔ اشلوک نمبر 24-21 کے مطابق جائے پیدائش مغربی سمت میں لوماش میں 500 دھنش (910 میٹر) اور مشرق کی جانب وگھنیشور سے 1009 دھنش (1835 میٹر) کی دوری پر واقع ہے۔ مقامی ہندو روایات کے مطابق لوماش یا لومش کا مقام موجودہ دور میں رینا موچنا گھاٹ کہلاتا ہے۔ اسی لحاظ سے رام جنم بھومی کو مغربی سمت میں کہیں ہونا چاہئے، سرجو ندی کی پائینتی کے پاس برہم کنڈ کے مضافات ہیں۔ مزید مہاتمایا کے مطابق رینا موچنا گھاٹ یا لوماش کا مقام 700 دھنش (1274 میٹر) برہم کنڈ سے شمال میں ہے۔ یہ سمت اور دوری دونوں تقریباً ہمارے نزدیک درست پائے گئے ہیں۔ اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنم استھان وگھنیشور کے شمال میں واقع ہے اور ایک مقامی روایت کے مطابق وگھنیشور کا مقام ایک ستون سے جانا جاتا ہے۔ جو رام چندرن گھاٹ کے جنوب میں واقع ہے اور اس سے بھی جنم بھومی بابری مسجد کے مقام سے خارج ہو جاتی ہے اور رام چندرن گھاٹ اور سریو کے کنارے برہم کنڈ کے بیچ میں کہیں اس کا واقع ہونا طے ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ طے ہے کہ ہندو روایات کے مطابق جیسا کہ اسکند پران کی مہاتمایا سے معلوم ہوتا ہے، بابری مسجد جنم بھومی کی جگہ پر نہیں ہے۔ وشو ہندو پریشد کے ماہرین نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ رام جنم بھومی کا موقع و محل شمسی سمتوں سے متعین کیا گیا ہے جو پیمائشی چیزوں سے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر شمسی پیمائش

سے بھی کام لیا جائے تب بھی اسکند پران کا جنم استھان بابری مسجد کے مقام پر نہیں ہوسکتا۔

لگتا یہ ہے کہ اجودھیا مہاتمایا کے مختلف نمونے اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں تیار کیے گئے یعنی اس وقت تک رام کی جائے پیدائش اہم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ مہاتمایا میں زیارت کے جتنے مقامات بتائے گئے ہیں ان میں رام جنم بھومی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ مہاتمایا کے مرتبین کے نزدیک سورگ دوار کی اہمیت زیادہ معلوم ہوتی ہے، جنم بھومی کی نہیں۔ سورگ دوار وہ جگہ ہے جہاں رام نے دنیا کو خیر باد کہا اور ان کے یہاں پر انتقال ہی کی وجہ سے مقدس مانا جاتا ہے۔ اسکند پران میں اجودھیا میں سورگ دوار تیرتھویں کا تذکرہ کرتی ہے۔ لیکن اس کا واقعی موقع ومحل جو بھی ہو۔ یہ واضح ہے کہ ہندو ذہن کے نزدیک یہ مقام دوسری جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل احترام وتقدیس رہا ہے۔ اس تیرتھ کا اولین تذکرہ گیارہویں صدی کے گھنڈا والا کتبات میں ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھاگھرا اور سریو کے سنگم پر ایک راجہ نے زمین کا عطیہ کیا تھا، لیکن یہ دان سنگم پر وشنو کی پوجا سے تعلق رکھتا ہے، کسی مندر کا کوئی بیان نہیں کرتا۔

(ڈاکٹر سی. سرکار، کتبات جلد 11، صفحہ 276، 77 سطور 23-20)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے زمانوں میں رام کی جائے وفات کا احترام اور تقدس کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ مطبوعہ اسکند پران کے اجودھیا مہاتمایا میں ایک سو اشلوکوں میں سورگ دوار کا بیان آیا ہے جسے ''گپ راتر تیرتھ'' بھی کہا گیا ہے۔ (دیکھیں صفحہ 212-211) جب کہ جنم استھان کا ذکر صرف آٹھ اشلوکوں میں کر دیا گیا ہے۔ (10,18,25) یہ واضح ہے کہ گیارہویں صدی میں بلکہ اس کے چھ صدیوں بعد 18 ویں صدی تک بھی اجودھیا میں کسی خاص جگہ کو رام کی پیدائش سے مخصوص نہیں مانا جاتا تھا، غالباً کسی مقام کو رام کی پیدائش سے اٹھارویں صدی میں جوڑا گیا ہے۔ لیکن مختلف مہاتمایاؤں میں اس کے لئے جس مقام کی نشاندہی کی گئی ہے وہ بابری مسجد کی جگہ سے میل نہیں کھاتا۔ اس لئے یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ قدیم ہندو روایت کے مطابق بابری مسجد رام جنم بھومی مندر کے مقام پر بنی ہے۔

## آرکایولوجیکل تحقیق کیا کہتی ہے؟

حالانکہ کوئی قدیم نص ایسی موجود نہیں ہے جو اجودھیا کے قدیم زیارت گاہ اور مقدس مقام

ہونے کی دلیل بن سکے لیکن وی.ایچ. پی کا دعویٰ ہے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کے مندر پر بنائی گئی، اس دعوے کے حق میں اس نے دو دلیلیں دی ہیں ① بابری مسجد میں کالے پتھر کے 14 ستون تھے جو غیر اسلامی نقش کاری کے حامل تھے اور یقیناً کسی مندر کو توڑ کر ہی لائے گئے ہوں گے، ② پروفیسر بی. بی. لال نے بابری مسجد کے بالکل نزدیک میں جو کھدائیاں کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے راستہ میں ایک ستون دار ڈھانچہ آیا جو یقیناً کسی مندر کا ہوگا۔ جہاں تک کالے پتھر کے ستونوں کی بات ہے تو ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ کیا وہ کہیں باہر سے لائے گئے یا متنازعہ مقام اور اس کے مزعومہ ڈھانچہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اسی طرح کے دو ستون مسجد سے تقریباً 3 یا 4 کلومیٹر دور ایک قبرستان میں بھی پائے گئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ہم نے فن تعمیر کے مورخین بشمول دیوانگن ڈیسائی، ایم. اے. ڈھکائی، کرشن دیو، این. بی. جوشی اور آر. سی. شرما سے تبادلۂ خیال کیا۔ سب اس پر متفق تھے کہ بعض نقوش 9ویں صدی کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس لئے سارے ستون کسی ایک ہی ڈھانچہ کے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اسی طرح کی نقوش کاری مشرقی ہند کے ستونوں میں بھی پائی جاتی ہے اور اس قسم کے ستونوں کا ذکر آر. ڈی. بنرجی نے اپنی کتاب Eastern Indian School of Medieal Sculpture (طبع ثانی 1918، پلیٹ نمبر LXRXIX بی اور سی XC ڈی) میں کیا ہے۔

جغرافیائی طور پر ان ستونوں کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کالے سالٹ پتھر سے بنے ہیں جو راج محل اور مرزا پور میں پایا جاتا ہے۔ ماقبل صنعتی ہندوستان میں تعمیری ساز و سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اشوک کے ریتیلے پتھر کے ستونوں کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ سلنڈر کی شکل میں چنار میں بنائے جاتے تھے اور وہاں سے ملک کے دوسرے حصوں کو بھیجے جاتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں یہی ستون میرٹھ اور ٹوپرا سے دہلی لائے گئے تھے۔ تانجور کے چھولا برہد واڑا مندر کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ ستون جو کرناٹکا کے نوکمبا مندر سے لائے گئے تھے یہاں استعمال ہوئے۔ بارہویں صدی میں دوار پال یا دربان کا مجسمہ چھولا حکمراں راجا دھی راج کے ذریعے کلیانی سے کھوکنم کے پاس دارا سیورام میں واقع راجا راجیشورم مندر لایا گیا۔ کلیانی ان مغربی چالوکیہ حکمرانوں کا دارالحکومت تھا جن کا اقتدار اسی زمانہ میں زوال پذیر ہو گیا تھا۔ ہمارے علم میں ایسی کئی مسجدیں ہیں جن کی تعمیر اور آرائش کا سامان دور دراز سے لایا گیا۔ مثلاً پٹنہ شہر کی گجری محلہ مسجد (17ویں صدی) کالے سالٹ پتھر کے ستونوں

سے بنی ہے، جنہیں پالا کہتے ہیں، جب کہ پٹنہ اور اس کے آس پاس میں کہیں بھی یہ پتھر نہیں ملتا۔ اس لیے پورا امکان ہے کہ بابری مسجد میں لگے ستون باہر سے لائے گئے ہوں۔ اسی طرح وی.ایچ. پی کے ماہرین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان ستونوں پر جو نقش نگاری ہے وہ وشنو فرقہ سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ بھی اس لئے صحیح نہیں کہ سنکھا چکر (پہیہ) گدا (ڈھال) اور پدم (کمل کا پھول) کی موجودگی کے بغیر کوئی بھی اچھا ویشنو حتی کہ متوسط درجہ کا تاریخ داں بھی ان نقوش کی نسبت ویشنو فرقہ سے تسلیم نہیں کر سکتا۔ یہ ویشنو کے لاینفک نشان ہیں اور کسی دان مالا (ہار) کی موجودگی سے اسے وشنو سے نسبت نہیں دی جا سکتی کیونکہ مالا دوسرے اور کئی دیوتاؤں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ عام طور پر یہ ستون 51/2 فٹ سے کچھ ہی زیادہ سائز کے ہیں اور انہیں محراب نما داخلی دروازوں کی بھاری دیواروں میں استعمال کیا گیا ہے اور اسی طرح نیو کی دیواروں میں بھی انہیں لگایا گیا ہے اور جس انداز سے انہیں نصب کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ محض آرائشی ہیں اور عمارت کا بوجھ ان پر نہیں ہے۔ عمارت کا لوڈ اُٹھانے کے لئے انہیں کم از کم سات فٹ اونچا ہونا چاہئے تھا اور ان کے نچلے حصہ کو بنیاد کے اندر ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ ستون اپنی اصلی صورت پر بھی نہیں ہیں اس لئے لازماً یہ باہر سے لائے گئے ہوں گے۔ اس لئے یہ بات پورے طور پر غلط ہے کہ یہ پہلے کے مندر کے باقیات ہوں گے اور انہیں کے اوپر مسجد بنائی گئی ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ بات ہے کہ یکساں طرح کے ستون صرف ایک ہی محراب میں ہیں اور باقی تین محرابوں میں مختلف طرح کے ستون ہیں۔ اور یہ سب یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ باہر سے لائے گئے۔

دوسری دلیل پروفیسر بی. بی. لال کے حال ہی کے ایک اعلان پر مبنی ہے کہ ''ان کے ذریعہ بابری مسجد سے بالکل متصل اینٹوں کی جو بنیادیں دریافت ہوئی ہیں وہ ستونوں کی نیو معلوم ہوتی ہیں اور اس سے بابری مسجد کے جنوب میں مندر کی طرح کی کسی عمارت کا سراغ ملتا ہے۔ حالانکہ بی. بی. لال نے اب سے گیارہ سال پہلے یہ تحقیقات کیں اور اس کے بعد اجودھیا پر کئی مقالات بھی شائع کیے، لیکن یہ تازہ انکشافات پہلی بار 1990ء ('منتھن' اکتوبر 1990ء) میں کیا گیا اور اس تاخیر کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی، جو ایک تعجب خیز امر ہے۔ ان ستونی بنیادوں سے نکالے گئے نتائج کے بارے میں ہم نے اپنے خیالات کلیر کرنے چاہے تھے اس کے لئے سائٹ نوٹ بک اور اجودھیا تحقیقات سے متعلق رجسٹر کو ملاحظ کرنا تھا۔ ہم نے یہ بھی چاہا کہ ان تصویروں، پلانوں، فوٹوگرافوں اور کھدائی

میں ملے میٹریل پر ایک نظر بھی ڈال لیں جو کہ پروفیسر بی.بی.لال کی تحقیقات سے متعلق ہیں۔اس مقصد سے ہم نے گورنمنٹ انڈیا کو درخواستیں لکھیں، ہوم منسٹر سے بھی گزارش کی کہ یہ پورا میٹر ہمیں مہیا کرایا جائے۔لیکن بار بار کی درخواستوں سے کوئی نتیجہ تو کیا نکلتا ان کی موصولی کی رسید تک بھی نہیں ملی، اور اس بات نے آرکائیولوجیکل میٹر کے استعمال کے بارے میں نہ صرف اخلاقیات کے سوال کھڑے کر دیے ہیں، بلکہ پروفیسر لال کے تازہ انکشاف کے بارے میں بھی یہ شک وشبہ پیدا کر دیا ہے کہ کیا وہ حقیقت میں ان کی کھدائی کی تحقیقات پر مبنی ہے؟

وی.ایچ.پی کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے کہ پروفیسر بی.بی.لال نے آرکائیولوجیکل سروے کو 1976ء اور 1979ء میں اپنی پیش کردہ رپورٹ میں بنیاد کے ستونوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔بلکہ ''چونے اور کنکر کے فرش کا ذکر انہوں نے کیا ہے'' لیکن وی.ایچ.پی کے جواب میں جان بوجھ کر مذکورہ رپورٹ کے اہم حصہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو یوں ہے''بعد کے دور وسطیٰ کے بنے گئی اینٹ اور کنکر کے فرشوں کو دیکھا گیا لیکن بعد کا پورا زمانہ کسی بھی خاص دلچسپی سے خالی ہے۔(انڈین آرکائیولوجی 1977-1976ء: اے ریویو، صفحہ 53) اے.ایس.آئی کے ذریعہ اس کے استعمال کے تناظر میں بعد کا عہد وسطیٰ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا اشارہ کرتا ہے؟ لہٰذا اگر سترہویں یا اٹھارہویں صدی کے کسی ڈھانچہ کے باقیات بابری مسجد کے پاس ملتے ہیں تو آخر وہ کس طرح ایسے مندر کی موجودگی کا ثبوت دے سکتے ہیں، جو مفروضہ طور پر گیارہویں صدی میں بنا ہو اور سولہویں صدی میں توڑا گیا ہو؟

مزید یہ کہ ستونوں کی بنیاد کا محض پایا جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ وہاں مندر تھا۔ کہ پتھر کے ستون تعمیراتی اور مزعومہ مندر کی چھت کا میٹریل وغیرہ کچھ بھی ان خندقوں کے ملبہ میں نہیں پایا گیا جہاں ستونوں کی اینٹوں کی بنیادیں تھیں۔وی.ایچ.پی. کے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ اینٹوں کے ستونوں والا یہ مندر 29-1528ء میں منہدم کر کے اس کی جگہ مسجد بنا دی گئی تھی، لیکن یہ بھی ایک خود ساختہ اور بے بنیاد نتیجہ ہے۔کیونکہ ہندو مندروں میں اسلامی طرز کے لمبے اور سیدھے ٹھیکرے استعمال نہیں کیا جاتے تھے جب کہ بابری مسجد کے جنرل فلور کے ٹھیک نیچے اور اینٹوں کی بنیاد والے ستونوں کے ڈھانچہ کے اوپر کے گڈھوں میں اسی طرح کے ٹھیکرے پائے گئے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اینٹوں کے ستون پہلے ہی گر چکے تھے اور تیرہویں صدی تک وہ استعمال کے قابل

نہیں رہ گئے تھے اور اس مقام پر مسلمانوں کی آبادی تھی جو اجودھیا شہر کے دوسرے حصوں کی طرح مذکورہ جگہ بھی رہتے تھے جہاں پر سیدھے ٹھیکرے ملے ہیں۔ جس کھدائی میں وہ ملے ہیں وہ پروفیسر اے۔کے۔ نارائن نے کی تھی (یہ میٹریل ہمیں پروفیسر پروشوتم سنگھ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ آف .......... انڈین ہسٹری کلچر اینڈ آرکایولوجی بنارس ہندو یونیورسٹی کے ذریعہ دیکھنے کو ملا جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں)۔

اس سے وی۔ایچ۔پی کے ماہرین کا یہ دعویٰ کہ یہاں کے رام مندر کو توڑ کر مسجد بنائی گئی یوں بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت وہاں مسلمانوں کی آبادی ہی نہ تھی کہ انہیں مسجد کی ضرورت پڑتی، پروفیسر بی۔بی۔لال اور اے۔کے۔نارائن دونوں کی کھدائیوں میں جو اسلامی طرز کے لمبے اور سیدھے ٹھیکرے ملے ہیں وہ یہ بتاتے ہیں کہ اجودھیا میں مسلمانوں نے تیرہویں صدی سے یہاں رہنا شروع کیا تھا اس وقت انہیں مسجد کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ وی۔ایچ۔پی کے ماہرین نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ بابری مسجد کے جنوب کی کھدائی میں اینٹوں کی بنیادیں، کالے سالٹ پتھر کے ستون جو مسجد کی چاروں محرابوں میں استعمال کئے گئے ہیں اور جو قبرستان میں بھی ملے ہیں اور بند دروازوں کا حصہ ہیں وہ یکساں اور ایک ہی ڈھانچہ سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے قطر اور اسٹائل اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ ان کی پرتوں کے باہم متعلق ہونے کا کوئی بھی ثبوت نہ ہونے کے باعث اس بات کا کوئی بھی امکان نہیں رہ جاتا۔ ستونوں کی یہ بنیادیں، ستون اور بند دروازے اپنی پرتوں کے لحاظ سے غیر مربوط ہیں اور مختلف جگہوں پر پائے گئے ہیں۔ اور پورے طور پر غیر متعلقہ سیاق میں ہیں۔ کیونکہ کھدائی کرنے والے خود اپنی طرف سے کسی مندر کی نشاندہی نہیں کر سکے، اس لیے پروفیسر بی۔ بی۔لال نے یہ تجویز دی کہ مسجد کے نیچے بھی کھدائی کی جائے۔ لیکن اب تک کوئی ایسی علامت نہیں ملی کہ اس طرح کی کھدائی سے کسی مندر کا پتہ لگ جائے گا۔ اور جن گڈھوں میں مذکورہ ستون ملے ہیں ان سے کوئی مذہبی علامت اور مذہبی تقدیس کی حامل چیز برآمد نہیں ہوئی۔ ٹھیک بابری مسجد کے سامنے وشو ہندو پریشد کے جوشیلوں نے 492 مربع فٹ کی جگہ شلانیاس کے لئے کھودی تھی (1989ء) اس میں اور بی۔بی۔لال یا وی۔ایچ۔پی کے ذریعہ کی گئی کھدائیوں میں مذہبی اہمیت کی کوئی چیز نہیں نکلی تو مسجد کے نیچے کھدائی کر کے مندر کو ڈھونڈ نکالنے کی امید کی بنیاد کیا ہے؟ ہماری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو بابری مسجد کے جنوب میں تقریباً 60 فٹ کی دوری پر پائے گئے ستونوں کی

بنیادوں کو بابری مسجد میں استعمال کئے گئے ستونوں سے متعلق قرار دے سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان ڈھانچوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ممکن ہے اس جگہ کوئی چھوٹا برآمدہ رہا ہو جو انسانی ضرورتوں یا جانوروں کے باڑے کے بطور استعمال کیا جا رہا ہو کیونکہ اس طرح کے ڈھانچے آج تک پائے جاتے ہیں۔

## معلوم و مدون تاریخ کی شہادت کیا ہے؟

وشو ہندو پریشد کوئی بھی داخلی یا خارجی اور نقلی ثبوت اپنے دعویٰ کا کہ بابری مسجد رام مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے، پیش نہیں کرسکی۔ لے دے کر آرکائیولوجی سے مدد لی گئی لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بحث کی اس سے کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوتی، زیادہ سے زیادہ جو بات آرکائیولوجی سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا قیام مسجد کے علاقے میں تیرہویں صدی سے شروع ہوا ہوگا جو بعد تک رہا۔ پھر معلوم تاریخ میں اس دعویٰ کی آخر کیا بنیاد ہے کہ رام مندر بابر کے لوگوں نے توڑا تھا۔ معلوم تاریخ میں مسجد کی تعمیر کا سب سے قابل اعتماد ذریعہ وہ فارسی کتبات ہیں جو مسجد کے اندر تھے اور جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ 29-1528ء میں تعمیر کی گئی۔ یہ کتبات قابل استناد اور مسز اے۔ بیورج کے بابر نامہ کے ترجمہ میں بطور خاص شامل کئے گئے ہیں، اگر چہ ان کے ترجمہ میں بعض جزوی غلطیاں ہیں (دیکھیں ضمیمہ Pixxviixxix) اس میں صرف 6 مصرعے ہیں لیکن اپی گرافک انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلیمنٹ میں کاتب نقاش کی دستخط کے ساتھ ان کی پوری تعداد لی گئی ہے جو 14 ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ 62-58، 1965ء مستند ایڈیشن آرکائیولوجیکل سروے آف انڈیا)

(نوٹ: تمام اشعار اور ان کا ترجمہ مضمون بابری مسجد کی تاریخی حیثیت میں دیکھیں۔ مترجم)

ان اشعار میں میر باقی کا نام صاف صاف طور پر لیا گیا ہے کہ اس نے مسجد تعمیر کی، اور اسے اس بات سے اور مزید تقویت ملتی ہے کہ میر باقی بہ حیثیت گورنر اودھ کا تذکرہ بابر کی یادداشتوں (تزک) میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ (دیکھیں اے۔ ایس۔ بیورج، صفحہ 685-679 اور صفحہ 684 دی ورلڈ کیلنڈر) میر باقی کو یہ خطاب بابر نے دیا تھا اس کا ذکر بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں بھی کیا ہے۔ (صفحہ 12، ہمایوں نامہ، طبع لندن 1904ء) کتبات کے اشعار یہ تو صاف طور پر بتاتے ہیں کہ بابر کی ایماء پر میر باقی اصفہانی نے 29-1528ء میں یہ مسجد تعمیر کی تھی لیکن اس بات کا کوئی ذکر نہیں کرتے کہ

اس نے مندر بھی توڑا تھا۔ اگر اس نے مذہبی جذبہ سے مندر توڑا ہوتا تو اس کا ذکر لازماً فخریہ طور پر کیا جاتا اور اس کے اس کارنامے کو مجاہدانہ بتایا جاتا کہ اسے مذہبی احترام ملے لیکن ایسا کچھ نہیں پایا جاتا اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معلوم تاریخ مندر کے انہدام کا کوئی باوثوق ثبوت اور شہادت پیش کرنے سے قاصر ہے۔

بابری مسجد کی تعمیر کے تقریباً 50 سال بعد ہی 76-1575ء میں تلسی داس نے اپنا مشہور رام چرتر مانس لکھا، جو ہندی میں رامائن کی کہانی کا نہایت پرجوش بیان ہے۔ یہ ناقابل تصور ہے کہ رام کی پیدائش کی ہی جگہ چھین کر مندر توڑ کر اس پر مسجد بنا دی جائے اور تلسی داس کے علم میں نہ آئے؟ اگر مندر کی بے حرمتی ہوئی ہوتی اور وہ بھی کتاب نظم کرنے سے پہلے تو یقیناً وہ اس کا تذکرہ دکھ کے ساتھ کرتے۔ یہ شکوہ کرتے کہ اب رام کی جنم بھومی پر بھی رام کی پوجا رام بھگتوں کو نہیں کرنے دی جاتی۔ اس بارے میں ان کی مکمل خاموشی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ اس کے برعکس تلسی داس کا کہنا تو یہ ہے کہ اجودھیا نہیں بلکہ پریاگ ان کے نزدیک زیارت کی اصل جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی اجودھیا کا تقدس واحترام کی کوئی روایت نہ تھی۔

سولہویں اور سترہویں صدی کے اجودھیا کے کسی تذکرہ میں ہمیں مندر کے انہدام اور اس کی جگہ مسجد کی تعمیر کا ذکر نہیں ملتا۔ ابوالفضل نے اپنا آئین اکبری 1598ء میں مکمل کیا اور ہندوستان کی اہم زیارت گاہوں میں اجودھیا کا بھی ذکر کیا اور لکھا کہ ''مشرق میں 40 کوس اور شمال سے مشرق کی سمت 20 کوس تک قابل احترام جگہ ہے یعنی اجودھیا شہر تک ہی محدود نہیں۔ اس نے رام نومی کی بھی ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو حصہ سوم، ترجمہ جیرٹ نظر ثانی، سرکار کلکتہ، 1948، صفحہ 335)

اس سے واضح ہے کہ اس وقت تک بابری مسجد کی جگہ تو دور خود رام کی جنم بھومی کو اجودھیا کے آباد شہر میں محدود کرنے کی روایت نہ تھی۔ اگر ایسی کوئی روایت ہوتی تو ابوالفضل نے اس کو ضرور بیان کیا ہوتا کیونکہ اس نے وہاں دو اسرائیلی پیغمبروں کی قبروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ اس نے رام جنم بھومی کی طرف ذرا سا بھی اشارہ نہیں کیا، کسی مسجد کی وہاں تعمیر کا تو ذکر ہی کیا۔ بالکل یہی صورت حال ولیم کیچ کے مبسوط تذکرہ اجودھیا کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس نے اجودھیا کی زیارت 1608ء میں کی تھی جبکہ وہ ہندوستان میں مقیم تھا، اس نے لکھا ہے:

''یہیں رام چندر کے قلعہ اور مکانات کے کھنڈر ہیں جسے ہندوستانی ایک بھگوان سمجھتے ہیں، ان

کے عقیدہ میں خدا نے دنیا کا تماشا دیکھنے کے لئے انسانی جسم اختیار کرلیا تھا۔ ان کھنڈروں میں بہتی ندی میں لاکھوں سال سے ہزاروں برہمن نہاتے اور اپنے کو صاف کرتے آ رہے ہیں۔ ندی کے تقریباً دو کلومیٹر آگے ایک غار ہے جس کا دہانہ تنگ ہے، لیکن اندر سے وسیع اور بھول بھلیوں والا ہے کہ آدمی ٹھیک سے توجہ نہ دے تو اس میں گم ہو جائے۔ اس غار میں کہا جاتا ہے کہ رام چندر کی راکھ دفن کی گئی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے لوگ آ کر اس کی زیارت کرتے ہیں اور یادگار کے بطور یہاں سے گن پاؤڈر کی مانند کالے چاول کے کچھ دانے لے جاتے ہیں، جن کے بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ رام کے زمانے سے محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ (ملاحظہ ہو Early Travels in India ایڈٹ ڈبلیو فوسٹر، 1583-1619ء طبع ثانی، نئی دہلی، 1968ء صفحہ 176) اس طرح ہمارے پاس ایک حوالہ ہے جو رام کی راکھ کے مدفن کے بارے میں بتاتا ہے۔ جبکہ اسکند پران سے یہ معلوم ہو چکا ہے رام کی جائے وفات، سورگ دوار کی زیادہ اہمیت ہے۔ لیکن رام کی پیدائش کے بارے میں یہاں بھی کوئی ثبوت نہیں، کہا جاتا ہے کہ قلعہ (رام کوٹ) کے کھنڈرات ہیں۔ لیکن اس وسیع قطعہ اراضی پر، جہاں سونے کی تلاش کی جاتی ہے۔ کسی ایک مخصوص مقام کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ یہ جگہ رام کی پیدائش کی ہے، مندر کو گرانے اور مسجد بنانے کی بات تو الگ ہے۔"

96-1995ء میں سُجان رائے بھنڈاری نے اپنی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کی تکمیل کی۔ اس کے پہلے حصہ میں ہندوستان کا جغرافیائی بیان ہے اور اس کے ضمن میں مقدس مقامات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ سجان رائے متھرا کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھنا نہیں بھولا کہ کیشو راج کا ایک مندر اورنگ زیب نے گرا کر اس کی جگہ مسجد تعمیر کی (دیکھیں ایڈٹ ظفر حسین دہلی، 1918ء صفحہ 40، ترجمہ جادو ناتھ سرکار، انڈیا آف اورنگ زیب، کلکتہ 1901، صفحہ 25) لیکن جہاں اس نے اجودھیا کا حال لکھا ہے، وہاں کسی مندر کی مسماری کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس نے لکھا "ہندو کتابوں میں اسے اجودھیا کہا جاتا ہے، یہ رام چندر کی جنم بھومی ہے، ساحل پر ان کا گھر بنانا، ان کا لاتعداد ریچھوں اور بندروں کے ساتھ لنکا جانا اور لنکا کے راجہ راون کو قتل کرنا اور اپنی بیوی کو اس کے قبضہ سے چھڑانا، (جسے راون اغوا کر کے لے گیا تھا، لیکن اس نے اپنی عفت و عصمت پر آنچ نہیں آنے دی تھی) بہت مشہور ہے۔ رامائن کی کہانی میں ان کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات اور کارناموں کا بھرپور تذکرہ ہے۔ اس لئے اجودھیا کو ایک مقدس مقام مانا جاتا ہے۔ یہاں سے ایک کوس دور گھاگھرا ندی (گورا) سرجو ندی

سے مل جاتی ہے اور قلعہ کے پائین سے گزرتی ہے۔ اجودھیا کے مضافات میں لوگ ریت کو سونے سے بدل لیتے ہیں۔ شہر کے اندر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے شیث علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام کی قبریں ہیں۔ یہ دونوں مزار اہل اسلام کی زیارت گاہ ہیں (اصل کتاب صفحہ 42، ترجمہ جادو ناتھ سرکار صفحہ 31) 60-1759ء میں رائے چتورامن نے اپنی کتاب چہار غلام مکمل کی۔ اس میں ہندوستان کا ایک جغرافیائی خاکہ ہے۔ یہ کتاب چھپی نہیں لیکن سر جادو ناتھ سرکار نے اپنے ترجمہ India of Aurangzeb میں اس کا اعداد و شمار والا حصہ نقل کیا ہے۔ اجودھیا کے بیان میں مصنف نے لکھا ہے ''اجودھیا پوجا کے مقدس مقامات میں سے خیال کیا جاتا ہے۔ یہ رام چندر جی کی جنم بھومی تھی۔ جودشرتھ کے بیٹے تھے اور خدا کے دس مرئی اوتاروں میں سے ایک تھے۔ ان کی شادی سیتا سے ہوئی تھی۔ روحانی سیادت کے ساتھ رام چندر دنیاوی حکومت کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔ ملاحظہ ہو (اکاؤنٹ آف صوبہ اودھ عبدالسلام کول، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، نمبر شمار 299/62) اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بابری مسجد کی تعمیر کے تقریباً 220 سال بعد تک بھی اس کے معاصر یا قدیم لٹریچر اور اجودھیا کے تذکروں میں بھی رام جنم بھومی کی تحدید، نشاندہی اس کے انہدام اور اس کی جگہ بابری مسجد کی تعمیر سے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہندو مسلمان مصنفین دونوں کی تحریر چھوڑ کر کیا محض ایک انگریز مبصر کی بات پر اعتماد کر لیا جائے؟

یہ خیال کہ بابری مسجد رام مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے۔ ایک عیسائی سیاح جوزف ٹیفن تھیلر کے ذہن کی اپج ہے۔ اس کی فرنچ کتاب 1788ء میں برلین سے جان بارنولی نے شائع کی تھی جو ہندوستان کے جغرافیہ اور تاریخی تذکرہ پر مبنی ہے۔ اس نے لکھا ہے ''بادشاہ اورنگ زیب نے رام کوٹ کہے جانے والے قلعہ کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک اسلامی معبد (مسجد) بنایا جس میں تین گنبد ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بابر نے کیا۔ سیاہ پتھر کے 14 ستون جو 5.5 فٹ کے ہیں اس قلعہ کے اندر لگے ہوئے تھے ان میں سے 12 اب مسجد کے اس تحتی حصہ میں لگے ہوئے ہیں جو دالان کا دروازہ ہے۔ دو ستون کسی صوفی کے مزار میں لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ستون یا ان کا ملبہ ہندوؤں کے راجہ ہنومان لنکا سے لے کر آئے تھے، بائیں طرف ایک چوکور چبوترہ ہے جو زمین سے پانچ انچ اونچا، پانچ انچ لمبا اور چار انچ موٹا ہے، جو مٹی سے بنا اور چونے سے پوتا گیا ہے۔ ہندو اسے بیدی کہتے ہیں یعنی جنم بھومی، اسے جنم بھومی کہنے کا سبب یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہیں پر وہ

مکان تھا جس میں بیشن (بشن یعنی وشنو) نے رام کی شکل اختیار کی تھی۔ ان کے تین دوسرے بھائی بھی یہیں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں اورنگ زیب نے اور بعض کے مطابق بابر نے اس جگہ کو گرا دیا تاکہ کافروں (ہندوؤں) کو ان کی اس توہم پرستی سے نکالے لیکن اس کے باوجود ہندو اپنی اس متوہمانہ رسم پر عمل کرتے رہے وہ اسے مقدس مان کر تین بار اس کے گرد چکر لگاتے اور زمین پر سجدہ کرتے، یہ دونوں جگہیں ایک نیچی دیوار سے گھری ہیں اور ایک چھوٹے سے دروازے میں آدمی سامنے کے کمرہ میں داخل ہو سکتا ہے۔'' اس بیان سے بھی یہ لگتا ہے کہ بابری مسجد اور اس کے اطراف کو رام مندر سمجھنے کی روایت ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھی اور پاس میں ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا لیا تھا۔ جسے رام کی جنم بھومی مانا جا رہا تھا، پھر بھی یہ واضح ہے کہ رام مندر کو گرانے یا وہاں کسی مندر کے وجود کی کوئی بات نہ تھی بلکہ اس ساری جگہ کو ہی رام کے قلعہ یا رام کی جگہ کے بطور مانا جاتا تھا۔ اس کے بیس سال بعد مندر کی یہ کہانی بن گئی اور نشو ونما پا گئی، تاہم فرانسس بوکانن جس نے 1810ء میں اجودھیا کا سفر کیا تھا اور مندر کی اس روایت کو سنا تھا، مندر کے انہدام کی اس کہانی کو بالکل بے سروپا قرار دیتا ہے۔ اس کا بیان بھی نقل کرنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اجودھیا کے لوگوں کا تصور ہے کہ وری ہاد بیل کی موت کے بعد ان کا شہر اُجڑ گیا تھا اور اجین کے وکرما کے زمانہ تک ایسا ہی رہا۔ وکرما مقدس شہر کی تلاش میں یہاں آیا اور ایک قلعہ تعمیر کیا جسے رامگار کہتے ہیں۔ آس پاس کے جنگلات صاف کرائے، جس سے کھنڈر نکلے، اس نے رام کے مختلف کارناموں کی یاد میں 360 مندر بنوائے۔ ان مندروں کی تباہی ہندو عام طور پر اورنگ زیب کے مذہبی جوش کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اسی نے بنارس اور متھرا کے مندر بھی گرائے۔ ان دونوں کے سلسلہ میں کیا ہوا میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک اجودھیا کی بات ہے تو یہ کہانی بالکل بے سروپا لگتی ہے۔ اجودھیا کی یہ مسجد جو مکمل اور مستحکم ہے ظاہری طور پر نسبتاً نئی لگتی ہے اور اس کی دیواروں پر جو کتبات ہیں وہ اس کی تعمیر بابر کی طرف منسوب کرتے ہیں، یعنی اورنگ زیب سے پانچ نسل پہلے۔ اسی بات سے وکرما کے ذریعہ مندر کی تعمیر کی پوری کہانی مشکوک ہو جاتی ہے۔'' کالے ستونوں کے بارے میں بوکانن کا خیال یہ ہے کہ وہ کسی ہندو عمارت سے لیے گئے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی جگہ کے کھنڈروں سے لئے گئے ہوں لیکن کسی مندر سے نہیں۔ (بوکانن کے سروے منٹگمری مارٹن نے ایڈٹ کر کے شائع کیے، کتاب کا نام ہے دی

ہسٹری اینٹی کٹمیز ٹوپوگرافی اینڈ اسٹےٹنک آف ایسٹرن انڈیا لندن، 1838، جلد 11، صفحہ 336-333)

مذہبی تصورات مخالف تاریخی قرائن اور شہادتوں کے باوجود پنپ جایا کرتے ہیں۔ اب چونکہ ہندو فریق کا دعویٰ کمزور تھا اس لیے مسلمانوں کی ماضی پر فخر کی نفسیات نے انہیں اس پر اُبھارا کہ وہ بلا دلیل دعویٰ کریں کہ ان کے بزرگوں نے کافروں کے مندر توڑ کر مسجدیں بنائیں۔ ان کے اسی تصور نے دونوں فرقوں کے مابین زبردست کشیدگی کی فضا پیدا کر دی اور 1855ء میں اجودھیا میں دونوں فرقوں کے مابین مسلح تصادم ہوئے تھے یہ اودھ کے نوابوں کا دور تھا۔ اسی تصادم میں مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ اور اسی فرقہ وارانہ منافرت کی فضا میں مرزا جان نے حدیقۂ شہداء لکھی (1272ھ 56-1855) اس کتاب میں اس نے فارسی کی ایک کتاب صحیفہ چہل نصائح بادشاہی سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ یہ صحیفہ مرزا جان کے مطابق بہادر شاہ عالمگیر کی کسی بیٹی نے مرتب کیا ہے۔ مرزا جان کا کہنا ہے کہ 15/شعبان 1231ھ مطابق 11/جولائی 1861ء میں مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے مرزا حیدر شکوہ کی لائبریری میں اس نے خود یہ قطعہ دیکھا اور اسے نقل کیا اس میں یہ نصیحت ہے ''مشرک ہندوؤں کے متھرا بنارس اور اجودھیا کے مندر توڑ دیے گئے ہیں، جنہیں یہ ملعون کافر کرشن اور رام کی جائے پیدائش سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رام یہاں لنکا کی فتح کے بعد ٹھہرے تھے۔ اور ان کی جگہ تقویت اسلام کی خاطر مسجدیں بنا دی گئیں ہیں۔ ان مسجدوں میں جمعہ و جماعت کی نمازیں ضرور ہونی چاہئیں۔ (ملاحظہ ہو مطبوعہ کتاب، حبیب گنج ذخیرہ اردو 32/1/5 مولانا آزاد لائبریری، صفحہ 114) اس اقتباس کے بارے میں چند ملاحظات یہ ہیں۔

① مرزا جان کا کہنا ہے کہ کتاب لکھنے کے چالیس سال پہلے یہ حوالہ اس نے دیکھا تھا۔

② چہل نصائح ایک مغل شہزادی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ جس کا نام مجہول ہے، باپ کا نام عالمگیر دیا گیا ہے، جو اس نے نہیں بلکہ اس کے باپ اورنگ زیب متوفی 1707ء نے اختیار کیا تھا۔

بہادر شاہ کی کسی بیٹی کی کتاب چہل نصائح دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں رکھتی۔ چنانچہ سی. اے. اسٹوری کی فارسی ادبیات کی ببلیوگرافی ہو یا ڈی. این. مارش کی جامع کتاب ''مغل ان انڈیا، ببلیوگرافیکل سروے'' (جلد 1، مسودہ) ہو دونوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ یہ خود مرزا جان کے تخیل کی پیداوار ہو۔ مرزا جان نے جس نفسیات کے تحت مندر کے فرضی

انہدام پر بے وجہ بغلیں بجائی ہیں، اسی نے مندر کے انہدام کی کہانی کو شہرت دے دی۔ اسی فرقہ وارانہ فضا میں لکھے گئے اردو کے بہت سے اقتباسات وی.ایچ.پی نے اپنے دعویٰ کی تائید میں فاتحانہ طور پر پیش کیے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث ان سب پر تبصرہ تو ممکن نہیں لیکن ان کے جائزہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب خیالی پلاؤ ہے جو موجودہ مخصوص فرقہ وارانہ ذہنیت کے تحت پروان چڑھتا چلا گیا ہے۔ بابری مسجد کی تاریخ اور مندر کے سلسلہ میں کسی بات کے لیے اس کا حوالہ قطعی معتبر نہیں۔

**خلاصہ (Summary)**

تمام وثائق اور تاریخی شہادتوں کے محتاط مطالعہ اور تجزیہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ

① تاریخی دستاویزوں میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سولہویں اور یقیناً اٹھارویں صدی سے پہلے بھی، اجودھیا میں کسی خاص جگہ کو رام جنم بھومی کی حیثیت سے کوئی تقدس حاصل رہا ہو۔

② اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جس جگہ 29-1528ء میں بابری مسجد تعمیر ہوئی وہاں اس سے پہلے رام مندر یا کوئی بھی مندر تھا۔ مسجد کے کتبات اور آرکائیولوجی اس بات کی شہادت دیتی ہے۔

③ یہ کہانی کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر قائم ہے، اٹھارویں صدی سے پہلے نہیں پائی جاتی، حتیٰ کہ انیسویں صدی کی ابتداء میں بھی مندر کی مسماری کا دعویٰ نہیں کیا گیا تھا۔

④ رام جنم بھومی یا سیتا کی رسوئی مندر کے انہدام کی کہانی بعد کی پیداوار ہے اور تحدید کے ساتھ یہ 1850ء کے بعد ہی رائج ہوئی ہے۔ اُس وقت بس سنی سنائی اور تخیل پر مبنی باتیں کہی جاتی تھیں۔

اب ملک کے عوام کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وی.ایچ.پی. کے اس طرح مشتبہ اور مشکوک دعویٰ کی بنیاد پر کیا ملک کی سلامتی اور اچھی شہرت کو فسطائی عناصر کے ہاتھوں گروی رکھا جا سکتا ہے؟ تاریخ داں کی حیثیت سے ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ فی زمانہ کوئی بھی مہذب سماج یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ سولہویں صدی کی کسی عمارت کو تباہ کر دیا جائے۔

1891ء میں جب اے نہرو نے نارتھ ویسٹ کی اور صوبہ اودھ کی تاریخی یادگاروں اور آثارِ قدیمہ کی لسٹ شائع کی تو اس نے بابری مسجد کو دوسرے درجہ کی یادگاروں میں شامل کیا۔ (دیکھیں p. 296-297) پہلے صفحہ پر اس تقسیم کی وجہ اس نے یوں بیان کی کہ اگرچہ ابھی یہ مسجد نجی ہاتھوں میں ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ حکومت اس کی مناسب دیکھ بھال کرے اور گھاس یا کنویں کا پانی نہ ختم ہونے دے تاکہ اسے مزید شکستگی سے بچایا جا سکے۔ پھر یہ کہ بابری مسجد 1904ء کے آثار قدیمہ ایکٹ (1958ء میں جو باقاعدہ قانون بنایا دیا گیا) کی رو سے قومی یادگاروں میں شامل ہے کہ یہ 450 سال قبل کی تعمیر اور عہد شرقی کا ایک اہم تعمیری نمونہ ہے، اس لحاظ سے یہ ہمارے مشترک قومی ورثہ کا حصہ ہے اور حکومت کو قانون بنا کر اس کا تحفظ کرنا چاہئے۔ لہٰذا اگر ہمیں تاریخی حقائق کو مدنظر رکھنا ہے، اگر ہمیں قانون کی بالادستی برقرار رکھنی ہے اور اگر ہم اپنے قومی ورثہ سے لگاؤ رکھتے ہیں تو ہمیں بابری مسجد کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہئے۔ کسی بھی ملک کے بارے میں اس چیز سے رائے قائم کی جاتی ہے کہ اس کا اپنے ماضی کے سلسلہ میں کیا رویہ ہے۔

ترجمہ: غطریف شہباز ندوی

ماخذ محمد جمیل اختر، بابری مسجد اے ٹیل ان ٹولڈ، صفحہ 89-72

جینوئن پبلیکیشن اینڈ میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔



# مسجد، مفروضے اور ان کی حقیقت

از: ریاض قدوائی (معروف صحافی)

---

بابری مسجد اور آس پاس کے علاقے کی تاریخ کے بارے میں غلط روایتیں اس حد تک پھیلی ہوئی ہیں کہ بار بار دُہرائے جانے کی وجہ سے ان کو مستند تاریخ کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ متعدد نیک نیت سیکولر شخصیات بلکہ مسلم صحافیوں اور مصنفوں نے بھی مسلمہ حقائق کے طور پر ان کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً 1528ء میں اس مسجد کی تعمیر 56-1555 میں واجد علی شاہ کے دورِ حکمرانی میں بابری مسجد پر ہندو مسلم تنازعہ پیدا ہونا، اسی دور میں یا پھر شہنشاہ اکبر کے عہد میں بابری مسجد کے باہر ''رام چبوترہ'' کی تعمیر اور ایسے لاتعداد قصے آج تحریروں میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ان مفروضوں کی مدلل تردید نہ صرف ہندو مسلم عوام کے ذہن صاف کرنے کے لئے بلکہ کسی حد تک اس جگہ کے حقوق کے لئے مسلمانوں کی جانب سے لڑے جانے والے مقدمے میں بھی ضروری ہے۔

دو مؤرخوں نے جو دس پندرہ سال پہلے تک زیادہ معروف نہیں تھے مستند حوالوں در حوالوں کے ذریعہ اجودھیا کی پوری تاریخ کو پلٹ کر رکھ دیا ہے، یہ شیر سنگھ آئی. اے. ایس اور سریندر کور ہیں۔ انہوں نے اجودھیا کی تاریخ کا سائنسی انداز میں تجزیہ کیا ہے اور متعلقہ حقائق کو مستند حوالوں سے چھان پھٹک کر دیکھا ہے، نیز بابری مسجد تنازعہ کا سراغ لگاتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ انیسویں صدی کے تقریباً ختم ہونے تک اس جھگڑے کا کوئی وجود نہیں تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان مصنفوں نے رام جنم بھومی کا شوشہ پہلے پہل سامنے آنے کی سیاسی وجوہات بھی شہادتوں کی بنیاد پر بیان کی ہیں۔

---

جے پور میں ایک مسجد ہے جس کا نام اکبری مسجد ہے۔ اس مسجد پر لگے ہوئے پتھر پر تحریر ہے کہ یہ راجہ مان سنگھ نے بنوائی تھی اور یہ اکبر کی وہاں آمد کے موقع پر بادشاہ کے استقبال کے انتظامات کا حصہ تھی تا کہ وہ وہاں نمازِ جمعہ پڑھ سکے۔ یقیناً راجہ مان سنگھ نے خود ہی اس کا نام اکبری مسجد رکھا

ہوگا لیکن بہت ممکن ہے کہ صدیوں بعد اس مسجد کے بارے میں بھی مشہور ہو جائے کہ یہ بادشاہ اکبر نے بنوائی تھی۔

ایک روشن خیال صحافی و مصنف نے جو آر.ایس.ایس ٹولہ کے کٹر مخالف ہیں مسجد کے باہر ماضی میں موجود رام چبوترے کے بارے میں لکھا ہے کہ ''جس رام چبوترے پر پوجا ہوتی رہی ہے اسے اکبر کے وزراء راجہ ٹوڈرمل اور بیربل نے اس تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے بنوایا تھا اور اسے اس وقت کے ہندوؤں نے بخوشی مان لیا تھا۔ آج بھی ہندو اپنے بزرگوں کے فیصلے کو تسلیم کر سکتے ہیں''۔ پھر آگے لکھتے ہیں: ''اور وہ (محض) اکبر کے زمانے سے ہی پوجا کی جگہ مانا جاتا ہے۔'' صحافی مذکور کے ذہن میں اس مغالطہ نے جنم نہیں لیا ہوگا بلکہ انہوں نے کسی بظاہر معتبر تحریر سے یہ معلومات حاصل کی ہوں گی۔ پھر یہ خیال قائم کر لیا ہوگا کہ بابری مسجد پر ہندو مسلم جھگڑا ہونے کے بعد آخری نواب اودھ واجد علی شاہ کے دور میں یہ چبوترہ (مورتیوں سمیت) قائم ہوا۔

## اجودھیا میں مندر نہیں تھے

اب ہم رام چبوترہ، بابری مسجد اور پورے اجودھیا کی حقیقی تاریخ کی کڑیاں شیر سنگھ آئی.اے.ایس اور سریندر کور کی تحریروں کے اقتباسات کی روشنی میں ملاتے ہیں۔ وہ اپنی ریسرچ کی تمہید میں کہتے ہیں چاہے انگریزوں نے کتنی ہی برائی کی ہو (جس میں غلط تاریخ لکھنا اور فرقوں میں بغض و عناد پیدا کرنا بھی شامل تھا) لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے افسروں نے ایک کام یہ کیا کہ یہاں تمام واقعات کو جو پیش آتے رہتے تھے قلم بند کیا اور دیانت داری کے ساتھ ان کا ریکارڈ چھوڑ گئے۔ اس ریکارڈ میں 1859ء تک اودھ کے چیف کمشنروں اور وقائع نگاروں کی کوئی ایسی تحریر نہیں ملتی جس میں بابری مسجد کے بارے میں کسی تنازعہ کا تذکرہ ہو۔ تحریروں سے یہ بھی ثابت ہے کہ بابری مسجد کے آس پاس کسی مندر کا وجود نہیں تھا بلکہ اجودھیا میں گھاگھرا کے کنارے مندروں کی تعمیر کا سلسلہ 1850ء کے بعد شروع ہوا۔ ان مندروں سے بابری مسجد کا فاصلہ دو کلومیٹر تھا۔ یہ بات کہ مسجد کے شمال میں ہندو مندروں کی تعمیر 1850ء کے بعد ہوئی اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے مختلف کرداروں کے نام پر ان مندروں کے نام رکھے گئے کی مسٹر آر.کے.سنہا اور ان کے رفیق کے قول سے بھی تصدیق پاتی ہے۔ (Glimpses of Faizabad)

ان براہِ راست معلومات کی بنیاد پر ہم بابری مسجد کے تنازعہ کی تاریخ ترتیب دے سکتے ہیں۔
اس جگہ تصادم کی شروعات اس وقت ہوئی جب ہنومان گڑھی ٹیلہ پر واقع ایک درگاہ کو بیراگیوں کے ہاتھوں تباہ کر دیے جانے پر مسلمانوں نے احتجاج کیا اور اس جھگڑے کو اودھ میں 1857ء کی بغاوت کے بعد بڑھاوا دیا گیا۔ (مئی 1857ء سے پہلے ہی اودھ میں بغاوت تاریخ کا حصہ بنی ہے اور فیض آباد و لکھنؤ میں جنوبی ہند کے ایک مسلم عالم احمد علی شاہ کے جہاد کے بارے میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے جن کا اکثر احمد شاہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ (ر۔ق) چار سال کی عرق ریزی کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ 1855-56ء سے پہلے شائع ہونے والی کسی بھی کتاب، دستاویز، مکتوب وغیرہ میں بابری مسجد کی تعمیر پر کسی جھگڑے کا ذکر تک نہیں ملتا۔ میجر جنرل سلیمن کی تحریروں (1850ء) سے تصدیق ہوتی ہے کہ 1850ء میں اجودھیا کھنڈر تھا اور گھاگھرا کے کنارے اکا دکا مندر مالدار ہندوؤں نے بنوائے تھے۔ ہنومان گڑھی اور ناگیشور ناتھ مندر تک کے بارے میں رودر پرتاپ سنگھ نے تصدیق کی ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی میں تعمیر کیے گئے تھے۔ (حالانکہ ناگیشور ناگھ مندر کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ اس کو وکرمادتیہ نے دریافت کیا تھا اور اس کے ذریعہ رام کی نگری کا پتہ چلا۔ شیر سنگھ نے متواتر سلسلہ وار حوالوں سے دکھایا ہے کہ وکرمادتیہ کا اجودھیا جو آج فیض آباد ضلع میں ہے۔ میں آ کر بسنا اور اس کو اپنی راجدھانی بنانا تاریخی طور پر ثابت نہیں ہوتا)۔

## بابری مسجد پر تصادم کی حقیقت

ہنومان گڑھی ٹیلے کے واقعہ کا حال لالہ سیتا رام، ڈاکٹر رادھے شیام شکل اور شری رام رکش ترپاٹھی نے اپنے ڈھنگ سے بیان کیا ہے گو کہ ان میں کچھ اختلاف ہے۔ ''گڑھی میں اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی مسجد ڈھائے جانے کی افواہ کے نتیجہ میں مسلمانوں نے گڑھی پر حملہ کر دیا مگر سادھو پہلے سے تیار تھے۔ نواب کی شاہی فوج تماشہ دیکھتی رہی۔ مسلمانوں نے بھاگ کر بابری مسجد میں پناہ لی جہاں دونوں میں پھر معرکہ ہوا۔''

دوسری طرف لیفٹیننٹ جنرل میکلوڈانس نے لکھا ہے کہ ''نواب نے اپنے رویہ سے مولوی امیر علی کی حوصلہ افزائی کی جو جہاد کی قیادت کر رہے تھے، اور اس کو روکنے کے لئے جنرل آٹرم نے مداخلت کی۔ تصادم میں انگریز فوجیوں نے امیر علی کو گولی مار دی''۔ مزید لکھا ہے: ''اودھ کے ہندو انگریزی ریزیڈنٹ کے اس رول سے خوش ہو کر انگریزوں کے حامی ہو گئے۔'' (بغاوت لکھنو و اودھ)

اس حمایت کی کڑیاں 1857ء کی بغاوت سے جڑتی ہیں جب انگریز لکھنؤ میں محصور ہو گئے اور ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے ان کو خوراک بہم پہنچائی۔ شیر سنگھ اور سریندر کور نے خود انگریز افسران کی تحریروں کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے اور ساتھ ہی مولوی احمد علی شاہ کے جہاد، ان کی مسحور کن شخصیت اور شعلہ بیانی جس نے باغی فوجیوں اور جیل حکام کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ بابری مسجد کا ایک بار پھر انگریزوں سے جنگ کا قلعہ بننا، انگریزوں کی جانب سے ایک بار پھر ہندو مسلم اور شیعہ سنی شوشے چھوڑنا، اور بالآخر بابری مسجد پر پہلے پہل ایک ہندو مہنت کے دعوے کی شروعات... ان تمام واقعات کی تفصیلات روزنامچوں کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ زیر نظر مضمون کا باقی حصہ ان کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ بابری مسجد کا مقدمہ لڑنے والی تنظیمیں اور شخصیات جو قانون کی عدالت اور نیک نیت لوگوں کو قائل کرنے میں سرگرم ہیں ان رودادوں سے اور ان کے اصل ماخذوں سے مدد لے سکتی ہیں علاوہ ازیں یہ بات نہایت اہم ہے کہ مذکورہ بالا تین مصنفوں سیتا رام، شکل اور ترپاٹھی کی ہندی کتابیں بھی کئی ایسی سچائیوں سے پردہ اُٹھاتی ہیں جو کہ اب افواہوں میں گم ہو گئی ہیں گو کہ ابتداء ان ہی عامیانہ کتابوں نے رام جنم بھومی اور مندر گرائے جانے کا مفروضہ پھیلایا تھا۔

## مسجد سے جہاد کا اعلان

فیض آباد کے انگریز ڈپٹی کمشنر ریڈ نے لکھا ہے: ''فیض آباد کے باغیوں نے پہلے دو لاکھ بیس ہزار روپے لوٹے پھر باغیوں کو رہا کرانے کا عام طریقہ شروع کر دیا جو بغاوت کے ایام میں جاری تھا۔ ان قیدیوں میں ایک کٹر مولوی سکندر شاہ کی بھی شخصیت تھی (احمد علی شاہ) جس نے قبل ازیں فروری میں فیض آباد میں عوام کو کھلی بغاوت پر اکسایا تھا۔ باغیوں نے مولوی کو اپنا لیڈر چن لیا۔ باغیوں میں اب بھی اس کو مرتبہ حاصل ہے۔'' (بغاوت 1857ء کا روزنامچہ)

فیض آباد کے مولوی صاحب کی کرشماتی شخصیت کے بارے میں جنہوں نے بابری مسجد سے جہاد کا اعلان کیا اور جن میں اپنے جیلروں کو اپنا پیروکار بنا لینے کی قوت تھی، اسسٹنٹ کمشنر نے لکھا:

''مولوی کو جیل سے رہا کرا کے سربراہ مقرر کیا گیا جس کو سلامی دی جاتی تھی۔ بغاوت شدید ہو گئی۔ انگریز حکام و ملازمین فیض آباد چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ بہرحال فیض آباد کے ہندو فوجی اس انتخاب پر جو انہوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر کیا تھا خوش نہیں تھے۔ انہوں نے

مولوی کو اس اعلیٰ مرتبہ سے ہٹا دیا اور 300 روپے دے کر ان سے جانے کو کہا۔ مولوی نے لکھنؤ کا قصد کیا جہاں بیگم نے شاندار استقبال کیا اور وظیفہ مقرر کیا لیکن اس شخص کی نظر تخت پر تھی، ثانوی رول قبول نہیں تھا۔"

(روز ناچوں میں آگے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں مولوی صاحب کو ایک بار پھر گرفتار اور قید کیا گیا۔)

"......اس وقت جنرل آٹرم اور ان کے ساتھی مختصر سی فوج کے ساتھ عالم باغ میں محصور تھے۔ مولوی صاحب نے فوجیوں کو قائل کیا کہ بغاوت کی ناکامی کی وجہ بے حوصلہ قیادت تھی جس میں بعض تو اپنے لئے دولت حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ نہ صرف دربار کو اطلاع کیے بغیر مولوی کو رہا کر دیا گیا بلکہ ان کو تمام باغی فوج کا سربراہ چن لیا گیا۔" حاشیہ میں لکھا ہے کہ جولائی 1858ء میں راجہ پائیں کے قلعہ پر حملہ کے دوران اس کے بھائی نے مولوی صاحب کو قتل کر دیا۔

میکلوڈ انس نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں زیر محاصرہ برطانوی فوج کو ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے خوراک پہنچائی۔ بٹلر کی تحریر ہے: "......ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے یہ مدد ایسے وقت دی جب انگریزوں کا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ہنومان گڑھی سے رسد نہ آتی تو لکھنؤ میں برطانوی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی یا سب مر جاتے (اور وہ کانپور میں گھری ہوئی انگریز فوج سے نہ مل پاتے جس کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ (ر۔ق) اس طرح 1857ء کے بعد کی تاریخ کچھ اور ہوتی!

## رام چبوترہ

چونکہ اس بغاوت کو اس نظر سے دیکھا گیا کہ یہ ہندوستان میں مسلم حکومت بحال کرنے کی ایک کوشش تھی لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ بغاوت کے کچلے جانے کے بعد ہنومان گڑھی کا مہنت سیاسی لحاظ سے بہت زیادہ طاقتور ہو گیا۔ انگریز اس کی ہر بات پوری کرنے کو تیار تھے اور اس نے ہنومان گڑھی پر فرضی حملہ کا بدلہ اس طرح لیا کہ بابری مسجد کے احاطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ 1865-69 میں کیا گیا۔ اس کو رام چبوترہ کہنا شروع کر دیا۔ حتی کہ اس شخص کے زیر اثر پی۔کارنیگی نے ایک انتہائی خطرناک اور مبہم قیاس اپنی تحریر میں شامل کر دیا کہ بابری مسجد کی تعمیر میں مسلمانوں نے جو سیاہ

ستون استعمال کیے وہ جنم استھان مندر سے لائے گئے تھے۔ یہی بہتان اودھ گزیٹیر میں 78-1877 میں دُہرایا گیا۔

اس تصنیف کی مدد سے مہنت نے 1885ء میں سول دعویٰ دائر کیا جس میں اپنے آپ کو جنم استھان کا بھی مہنت کہتے ہوئے رام مندر چبوترہ پر مندر بنانے کی اجازت چاہی۔ (اسی سال کے آخر میں) سب جج ہرکشن نے دعویٰ مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ اس مرحلہ میں مندر بنانے کی اجازت دینے کے معنیٰ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کا سلسلہ شروع کر دینا ہوں گے۔

(1857ء سے پہلے ہنومان گڑھی پر ہونے والے ہندو مسلم تصادم کے سلسلہ میں) عین ممکن ہے کہ انگریزوں نے خود ہی بیراگیوں کو مسلم درگاہ ڈھانے کی ترغیب دی ہو تا کہ (ہندو مسلم جھگڑے کے نتیجہ میں) ہندو انگریزوں کے حامی ہو جائیں اور واجد علی شاہ کی گرفتاری کی مخالفت نہ کریں جو کہ صرف چند ہفتے بعد 13رفروری 1856ء کو ہونے والی تھی۔

## لودھی مسجد کب اور کیوں بنی

ہماری معلومات کی حد تک یہ خیال کہ جس کو اب بابری مسجد کہا جاتا ہے دراصل لودھی مسجد تھی، جس کو ابراہیم لودھی نے بنوایا تھا۔ پہلے پہل مشہور محقق بشمبھر ناتھ پانڈے، سابق گورنر اُڑیسہ نے پیش کیا تھا۔ شیر سنگھ نے اس دریافت کو مکمل طور سے پایہ ثبوت کو پہنچانے کے لئے جگہ جگہ جا کر چھان بین کی اور مختلف علوم کے ہندوستانی ماہرین کے علاوہ غیر ملکیوں سے بھی مدد لی۔ جنم بھومی کا مفروضہ کیسے آگے بڑھا، بابری مسجد کس نے، کب اور کیوں تعمیر کرائی، کٹر ہندو مصنفوں نے اس مقام کا کیا نام بتایا ہے جہاں یہ مسجد تھی، ان سوالوں کے جواب دینے کے علاوہ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مسجد میں نصب ستون کسوٹی پتھر کے نہیں ہیں جیسا کہ عام خیال ہے اور کسی پرانے (مندر وغیرہ کے) ملبہ کا حصہ نہیں تھے بلکہ 1828ء میں دھولپور میں ترشوائے گئے تھے۔ یہاں کچھ ثبوتوں اور دلائل کے ساتھ ان کے اخذ کردہ نتائج بیان کئے جا رہے ہیں، تفصیلات اور مکمل ثبوتوں کے لئے کتاب ''سیکولر ایمپرر بابر'' دیکھی جا سکتی ہے۔

''اجودھیا کا اتہاس'' جو لالہ سیتا رام نے لکھی ہے (مطبوعہ 1932ء) ■■ رام جنم بھومی کا رکت رنجت اتہاس، رومانٹک ہسٹری رکت رنجت اتہاس اور اس قسم کی دوسری کتابوں کا ماخذ مواد ہے۔ جنم

بھومی ۔کے مفروضہ کی نشو ونما کا مطالعہ کرنے میں یہ ایک اہم کتاب ہے۔ لالہ سیتا رام جی کو اس کتاب پر رائے بہادر کا خطاب دیا گیا انہوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جھوٹ بولنا ہندوستان کے لوگوں کا کام ہے۔خود یہ کتاب اس قول کی تصویر ہے۔(اس میں ہندوستان کی سرحدیں خالص ہندی بولنے والے علاقہ کے اندر دکھائی دیتی ہیں) اس کے ساتھ یہ فقرہ ہے کہ کوئی اور صوبہ ہم سے ہمدردی نہیں رکھتا۔

بقول ان کے بابر نے رام کوٹ مندر کو تباہ کیا نہ کہ رام جنم بھومی یا جنم استھان مندر کو، لیکن کتاب میں ہر جگہ بابری مسجد کا تذکرہ ''جنم استھان کی مسجد'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ دوسرے ''بابر نے رگھو ونشیوں کی جنم بھومی'' (رام کے خاندان کی سرزمین پیدائش) پر مسجد تعمیر کرائی، نہ کہ کسی کے مقام پیدائش پر یہ لودھی مسجد پر اصل اعتراض ہے جس کو اب بابری مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ مذکورہ جگہ رام کی جائے پیدائش ہے کم از کم 1932ء میں یہی موقف تھا۔

اس تاریخی حقیقت کو مسخ کر کے کہ ابراہیم لودھی نے 1523ء تا 1524ء میں اپنے بھائی جلال خاں کو بے دخل کرنے کے لئے اجودھیا پر حملہ کیا تھا اور اس جنگ میں کام آنے والے اس کے سپاہیوں کو قبرستان گنج شہیداں میں دفن کیا گیا۔ شری سیتا رام نے ایک عجیب کہانی گڑھ لی کہ واجد علی شاہ کے زمانہ میں اجودھیا میں ہندو مسلم فسادات ہوئے (بابری مسجد کے مسئلہ پر) اس لڑائی میں گیارہ ہندو اور 75 مسلمان مارے گئے۔ مسلمانوں کو ایک بڑے قبرستان میں دفن کیا گیا جسے گنج شہیداں کہا جاتا ہے۔ لالہ سیتا رام کی جانب سے اس واقعہ کا بیان محض جعل سازی ہے جسے مندر گرانے کی بابت بابر کا فرمان گڑھ لیا گیا۔ آخر میں اس ٹیلہ کا نام بھی اہم ہے جس پر مسجد تعمیر کی گئی۔ لالہ سیتا رام کہتے ہیں: ''جس ٹیلے پر مسجد تعمیر کی گئی اسے یکیہ ویدی ٹیلہ کہتے ہیں محل غور ہے کہ 1931ء تا 1932ء میں اس کو جنم بھومی یا جنم استھان ٹیلہ نہیں کہتے تھے۔

واقعات کا مندرجہ ذیل تسلسل سامنے آتا ہے۔ اودھ کو چھڑانے کے لئے لودھی کو فوج کشی کرنے میں ایک سال لگ گیا ہوگا۔ جنگ میں ابراہیم لودھی کے کچھ سپاہی کام آئے ہوں گے جن کو صوبائی راجدھانی اجودھیا میں دفن کیا گیا۔ ان کی روح کے سکون کے لئے یہ مسجد بنائی گئی تا کہ وہاں نماز ہوتی رہے۔ ابراہیم لودھی ایک ہندو خاتون کا پوتا تھا لہٰذا اس کو مندر گرانے کا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے اس مسجد کا سنگ بنیاد 930ھ میں 15رستمبر 1523ء اور 5ردسمبر 1524ء کے درمیان

کسی وقت رکھا تھا۔ یہ تاریخ مسجد کے اصل کتبہ سے آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر جنرل اے۔اے۔ فیوہرر نے 1891ء میں ریکارڈ کی تھی۔ یہ بابر کے ہندوستان فتح کرنے سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ تاہم مسجد میں نصب ایک اور تحریر بابر کے جنرل میر باقی کو اس مسجد کا بانی بتاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میر باقی نے مسجد کو ایک قلعہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یعنی فوجی مقاصد کے لیے، چنانچہ اس کو زیادہ مستحکم کرنے کی ضرورت پڑی اور اس غرض سے بابر نے 26 ستون دھولپور سے کندہ کرا کے منگوائے تھے جیسا کہ بابر نامے میں درج ہے۔ یہ واقعہ 24/ستمبر 1528ء کا ہے۔ اس کے بعد لودھی مسجد بابری مسجد کہلانے لگی۔ کچھ افترا پردازی اور کچھ غلطی سے ان کو کسوٹی پتھر کے قدیم ستون کہہ دیا گیا جو کسی مندر کا حصہ رہے ہوں گے حالانکہ یہ اسٹون پالش کے کیمیاوی طریقوں سے بنائے گئے تھے۔ (تفصیل کتاب میں درج ہے) اس مسجد میں ستونوں کی تعداد بھی 26 ہی تھی۔ مسجد کا اصل کتبہ جس پر مذکورہ تاریخ تھی 1934ء میں ہندو بلوائی مسجد گرانے کے بعد اُٹھا لے گئے تھے۔ جس کے بعد مسجد دوبارہ تعمیر کی گئی۔ یہ بات رادھے شیام شکل اور رام رکش ترپاٹھی دونوں کی کتابوں میں تقریباً من وعن درج ہے۔

تمام حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ نہ بابر اجودھیا قصبہ میں آیا، نہ اس نے مسجد کی تعمیر شروع کروائی، نہ یہاں وہ مندر گرایا گیا جس کا چرچا ہے کیونکہ مندر تھا ہی نہیں۔ ہم نے محض تاریخی شہادتیں لوگوں کے سامنے رکھ دی ہیں تاکہ وہ خود فیصلہ کر لیں۔



# اجودھیا شہر کی تاریخی حیثیت

از: ثناء اللہ علیگ

اجودھیا موجودہ اتر پردیش صوبہ کے فیض آباد ضلع کا ایک شہر ہے۔ عہد وسطیٰ میں اسے اودھ پوری بھی کہا جاتا تھا۔ اس اودھ علاقے کی زبان اودھی کہلاتی تھی جو ہندی زبان کی ایک شاخ مانی جاتی تھی۔ بعد میں اس اودھ پوری کا نام اجودھیا پڑ گیا۔ اجودھیا کا لفظی معنی غیر مفتوح یا نا قابل تسخیر ہے۔ دورِ جدید میں اجودھیا ایک مذہبی مقام کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں، جب بھگتی تحریک عروج پر تھی، کرشن کی پوجا اور ان کا وشنو اوتار ہونے کا عقیدہ عام ہوا۔ اسی کی دیکھا دیکھی رام کی بھگتی بھی شروع ہوئی۔ رام کو بھی وشنو کا اوتار مان لیا گیا۔ رام کی کہانی بہت قدیم زمانے سے عوام میں مشہور تھی، مگر اس کی حیثیت ایک افسانہ سے زیادہ نہ تھی۔ رام کی پوجا یا اوتار کا عقیدہ نہیں پایا جاتا تھا۔ بھگتی تحریک نے رام کی پوجا کا چلن عام کر دیا۔ رام کی پیدائش اجودھیا میں بتائی گئی ہے۔ اس لئے اودھ پوری کو اجودھیا کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ رام کی کہانی کے اجودھیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اس شہر میں شہنشاہِ اکبر اعظم کے زمانے میں تلسی داس نے اودھی زبان میں اپنی لازوال مقبول تصنیف ''رام چرت مانس'' لکھی۔ تلسی نے بھی اس شہر کا نام اودھ پوری ہی لکھا ہے:

> ''میں انتہائی مقدس اودھ پوری اور کلجگ کے پاپوں کو دور کرنے والی سرجو ندی کی وندنا (پوجا) کرتا ہوں''۔

''سمبت 1631 میں ہری (بھگوان) کے پاؤں پر سر رکھ کر اس کہانی کا آغاز کرتا ہوں۔ چیت ماہ کی نویں تاریخ منگل کے دن اودھ پوری میں یہ چرت روشن ہوا (لکھا گیا)'' بالمیک راماین (سنسکرت) میں رام کی جائے پیدائش اجودھیا بتائی گئی ہے۔ لیکن رام کی ابتدائی کہانی کے مطابق اس کی جائے پیدائش اجودھیا نہیں بلکہ بنارس ہے۔ رام کی کہانی کی ابتداء کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ کئی مختلف ذرائع سے یہ کہانی آئی ہے۔ اس لئے اس کہانی کے تمام اجزا میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے علمائے زبان و ادب رام کو تاریخی شخصیت کے طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف کچھ لوگ رام کو تاریخی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ پھر ان موخر الذکر لوگوں

کے درمیان رام کے واقعات کے تعین میں زمان ومکان کا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔

رام نام کی کئی شخصیات کا ذکر قدیم ویدک لٹریچر میں ملتا ہے۔ لیکن ان کا تعلق کسی طرح راماین کے رام سے نہیں جڑتا۔ راماین میں جس رام کا ذکر ہے اس کا تعلق بودھ مذہب سے ہے۔ مہاتما بدھ کے مختلف سابق اوتاروں کی فہرست میں رام کا بھی ذکر ملتا ہے۔ بودھ دھرم کی پالی زبان کی کتاب ''جاتک'' (تصنیف چوتھی صدی قبل مسیح) میں دشرتھ کے بیٹے رام کا ذکر غالباً پہلی بار آیا ہے۔ اس کے مطابق راجا دشرتھ بنارس کے راجا تھے۔ رام اور سیتا دونوں بھائی بہن یعنی دشرتھ کی اولاد تھے۔ وہ برہمن دھرم کے بجائے بودھ دھرم کے راجا مانے گئے ہیں۔ صدیوں بعد دوسری صدی قبل مسیح کے آس پاس رام کی کہانی کا برہمنی ایڈیشن منظوم ومبسوط کہانی کی شکل میں ''راماین'' نام کی سنسکرت کتاب میں آیا۔ اس کے مصنف بالمیک مانے جاتے ہیں۔ بالمیک کے زمانے اور زندگی کے حالات نامعلوم ہیں۔ بہت بعد کی کئی کتابوں میں متضاد بیانات ان کے بارے میں ملتے ہیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ راماین ایک وقت خاص میں اور ایک مصنف کے ذریعہ وجود میں نہیں آئی۔ دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک اس کی تصنیف ہوتی رہی۔ اولاً اس میں چھ ہزار اشلوک تھے۔ بعد میں بڑھا کر بارہ ہزار اور بالآخر چوبیس ہزار کر دیئے گئے۔ صرف شلوک ہی نہیں بلکہ کئی ابواب اور واقعات کا بھی اضافہ کیا گیا اور کہانی کی اصل شکل کو بھی تبدیل کیا جاتا رہا۔ اس کی آخری شکل بارہویں صدی کے آس پاس کی بتائی جاتی ہے۔ دنیش چندر سین نے اپنی کتاب "The Bengali Ramayanas" میں راماین کے اصل سرچشمہ (Source) کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''راماین اور بودھ کہانی کے موازنہ سے یہ واضح ہے کہ عالمی شاعر بالمیک نے کتنی مہارت سے اس ان گھڑ، معمولی بودھ کہانی کو بلندی کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا ہے۔''

''جاتکوں (بودھ دھرم کے اوتاروں کی کہانیوں) کے ادب سے بالمیک نے اپنا مواد حاصل کیا ہے اور اسے اپنی لازوال تالیف کے لئے نئے سانچے میں ڈھالا ہے''۔

''بالمیک نے ایک خاص مقصد سے (؟) دشرتھ جاتک (بودھ دھرم) کا ارتقاء آسان اور رواں کہانی میں کر دیا ہے۔ بودھ تپسیا اور بھکشوپن کے ردعمل کے طور پر شاعر اول (بالمیک) نے

راماین میں ہندو گھریلو زندگی کا آدرش (مثالی نمونہ) اپنے قارئین کے سامنے رکھا ہے۔"
(D.C. Sen, The Bengali Ramayanas)

راماین کے اس نئے قالب میں آنے پر جو نمایاں تبدیلیاں ہوئیں، ان کا ذکر ڈاکٹر اے. ویبر (Dr. A. Weber) نے اس طرح پیش کیا ہے:

"راماین میں راج کماروں کا پایہ تخت وارانسی سے اجودھیا بن جاتا ہے۔ ونواس (جنگل میں قیام) کی جگہ ہمالیہ سے ونڈکانیہ میں بدل جاتا ہے اور رام و سیتا بھائی بہن نہ ہوکر ابتدا ہی سے ازدواجی تعلق رکھتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ سیتا ہرن اور راون کا قتل، یہ نئے حصے بھی جوڑے گئے ہیں۔ بودھوں کے اثر سے ہی سیتا کے ونواس کے آخر تک کوئی اولاد نہیں ہوتی ہے، کیونکہ بودھ کتھا کے مطابق ونواس کے بعد ہی ان کی شادی ہوئی ہے۔ وارانسی کا اجودھیا بننا بھی بودھ کہانیوں کی وجہ سے ہوا۔ شاکیہ اور کولیہ خاندانوں کے پایہ تخت بتدریج کپل وستو اور کولی نگر تھے۔ دونوں شہر اجودھیا کے پڑوس میں تھے۔ ونواس کا مقام اس لئے بدل گیا ہے کہ سیتا ہرن اور راون کے قتل کی تفصیلات کا اس میں اضافہ کرنا تھا"۔ (A. Weber: On the Ramayana 3)

اسی طرح جزوی تفصیلات میں جائیں تو بالمیک راماین کے مختلف نسخوں کے اندر بہت سے اختلافات ہیں۔ کچھ لوگ بودھ جاتک سے پہلے کی تصنیف راماین کو مانتے ہیں۔ لیکن ان کے حق میں دلائل نہیں ہیں۔ فادر کامل بلکے (C. Bulcke) نے اپنی ریسرچ تھیسس "رام کتھا" میں دونوں رایوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ: "قدیم بودھ لٹریچر اور جاتکوں کے مواد کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ اجاگر ہوتا ہے کہ تِپٹک (بودھ دھرم کی بنیادی کتاب) کے زمانہ تصنیف میں رام کی کہانی سے متعلق منتشر ادبی قصوں کا چلن ہو چکا تھا، لیکن راماین کی تصنیف نہیں ہو پائی تھی"۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اجودھیا کا تعلق رام سے بعد میں جوڑا گیا ہے اور رام بدھ کے اوتار کی ایک فرضی شخصیت ہیں۔ پھر بھی اجودھیا کی قدامت کے بارے میں بہت سی تحقیقات ہوئی ہیں۔ رام کی اجودھیا کی جائے وقوع ہمیشہ علمائے تاریخ و آثارِ قدیمہ کے نزدیک مختلف فیہ رہی ہے۔ مشہور محقق و آثارِ قدیمہ کے ماہر راجندر اوستھی کے خیال میں رام کی اجودھیا راجستھان میں کہیں پر تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ افغانستان کے علاقے میں کہیں پر اجودھیا آباد تھی۔ دوسرے کچھ لوگ بہار کے جنوبی حصے (موجودہ جھارکھنڈ) اور مدھیہ پردیش میں قدیم اجودھیا کے ہونے کا قیاس

کرتے ہیں۔ یہ قیاس آرائیاں مختلف قسم کی رامائنوں کے متضاد بیانات کی بنیاد پر کی گئی ہیں۔

جہاں تک اجودھیا شہر کے نام کا تعلق ہے، اس کا تاریخی اعتبار سے سب سے قدیم ذکر اتھروید میں ملتا ہے، جس کا زمانۂ تصنیف 800 تا 1000 ق.م. ہے۔ اتھروید کے کانڈ 10، سوکت 2، کے منتر 31-33 میں اجودھیا شہر کا ذکر ہے، لیکن خیالی دنیا کے ایک شہر کے طور پر دیوتاؤں کی نگری کے طور پر اس کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کا رام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ آٹھ چکروں (فصیلوں) سے گھری ہوئی ہے اور اس میں نو داخلے کے دروازے ہیں جو ہر طرف سے روشنی سے گھرے ہیں۔ آریہ سماجی پنڈت کھیم کرن داس ترویدی نے ان منتروں سے استعارے کے طور پر انسانی جسم کے اندر کے مقامات مراد لیے ہیں۔ (دیکھئے آریہ سماجی اتھروید، حصہ دوم، صفحہ 239، ہندی ترجمہ) اس معنی کے اعتبار سے زمین پر کسی اجودھیا نگری کا اشارہ ان منتروں سے واضح نہیں ہوتا۔

اس کے بعد بودھ دھرم کی پالی زبان کی کتاب سینوت نکائے (300 ق.م.) میں اجودھیا کو گنگا ندی کے کنارے بسا ہوا دکھایا گیا ہے۔ مورخین مانتے ہیں کہ فیض آباد ضلع میں سرجو ندی کے کنارے بسی موجودہ اجودھیا سے اس اجودھیا کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ابتدائی پالی زبان کی کتابیں اس خیال کی تائید نہیں کرتیں کہ لفظ ''گنگا'' عام ندیوں کے لیے آیا ہے۔ جیسا کہ کھینچ تان کر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر گنگا لفظ عام ندیوں کے لیے استعمال ہوتا تو پھر انہیں کتابوں میں الگ الگ ندیوں کے نام مثلاً مہی (گنڈک)، نیرنجرا (پھلگو) وغیرہ نہیں آتے۔ ان کتابوں میں سربھو یعنی سرجو ندی کا بھی ذکر ملتا ہے لیکن ایک ایسے پس منظر میں جس کا اجودھیا سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔

اب ان دونوں قدیم کتابوں کے بعد دوسری صدی قبل مسیح اور اس کے بعد وجود میں آنے والی کتاب بالمیکی راماین ہے۔ اس کے بیان کا تجزیہ کرنے پر بھی اس سے موجودہ اجودھیا کا تعلق کسی طرح نہیں ہوتا۔ وہ یا تو کوئی خیالی اجودھیا ہوگی یا کہیں اس کا وجود ہوگا تو اب وہ ناپید ہو چکی ہے۔

بالمیک راماین کی بنیاد پر حکومت ہند کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے سروے کے اضافی ڈائریکٹر جنرل منیش چندر جوشی نے اجودھیا کو سریو سے کچھ دوری پر ڈھونڈ نکالا۔ بالمیک راماین کا اتّر کانڈ عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی صدیوں میں لکھا گیا ہے۔ اس کے مطابق اجودھیا سریو ندی سے ڈیڑھ یوجن (تقریباً 12 میل) دور ہے۔ مورخین کی نگاہ میں اس سے پھر الجھن اُٹھ کھڑی ہوئی، کیونکہ موجودہ اجودھیا تو سریو (سرجو) کے بالکل کنارے پر موجود ہے۔ یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے اور بلیا و سارن ضلعوں میں

اس کے مشرقی بہاؤ کو گھاگھرا کہتے ہیں۔ سارن ضلع میں جاکر یہ گنگا میں مل جاتی ہے۔ سریو اپنا راستہ بدلتی چلتی ہے، جس کی وجہ سے کچھ اہلِ علم بلیا ضلع کے گھیزاڈیہہ علاقے کو اجودھیا ماننا چاہتے ہیں۔

ساتویں صدی کے چینی سیاح ہوین سانگ کے بیان کے مطابق اجودھیا کی جائے وقوع کے بارے میں بھی مشکلات کھڑی ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق اجودھیا قنوج کے جنوب مشرق کی جانب 600 لی (تقریباً 192 کلومیٹر) دوری پر تھی اور گنگا کے جنوب کی طرف تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ اجودھیا کو تقریباً گنگا کے کنارے موجود بتاکر چینی سیاح نے شاید اس کی جائے وقوع کے بارے میں ابتدائی بودھ روایت ہی کی توثیق کی ہے۔

ہوین سانگ کے مطابق اجودھیا دیش میں 3000 بودھ بھکشو تھے اور سادھو سنیاسیوں وغیر بودھوں کی تعداد اس سے کم تھی۔ اجودھیا راج کی راجدھانی کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ ایک پرانے مٹھ کا ذکر کرتا ہے جو کافی عرصہ سے بودھ دھرم کی تعلیم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس سے ساتویں صدی میں اجودھیا میں بودھ دھرم کے غلبے کا اشارہ ملتا ہے۔ اس سے پہلے پانچویں صدی عیسوی میں فاہیان ساکیت میں بدھ کی داتون کا ذکر کرتا ہے جو کہ سات، آٹھ ہاتھ اُونچی اُٹھی ہوئی تھی۔ حالانکہ برہمنوں نے اس درخت کو برباد کردیا۔ پھر بھی وہ اسی جگہ پر پھر سے اُگ آیا۔

(جیمس لیگی: اے ریکارڈ آف بدھسٹ کنگڈم، صفحہ 55-54، آکسفورڈ 1886ء)

اجودھیا کو روایتی طور پر کئی جین تیرتھنکروں یا مذہبی مبلغوں کی جائے پیدائش بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور جینی اسے تیرتھ گاہ مانتے ہیں۔ جین روایت میں اسے کوسل راج کی راجدھانی بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ ٹھیک کہاں پر واقع ہے، یہ نہیں دکھایا گیا ہے۔ گپت عہد کے بعد جاکر ہی کہیں موجودہ اجودھیا کو رام کی اجودھیا کے ساتھ جوڑا جانے لگا۔ اس وقت تک رام کو وشنو کا اوتار مانا جانے لگا تھا۔

مذہبی اور ادبی کتابوں کے بیانوں کے علاوہ تاریخ کے طالب علم کے لیے زیرزمین مدفون قدیم سکوں، اوزاروں، برتنوں، مورتیوں اور پتھر وغیرہ پر نقش شاہی و مذہبی عبارتوں کی اہمیت بھی کم نہیں ہوتی۔ عجائب گھروں میں محفوظ ان مذکورہ چیزوں کے مطالعے سے بھی کئی تاریخ گتھیاں سلجھائی جاتی ہیں۔ اس پہلو سے بھی اجودھیا کی حقیقت کے بارے میں پتہ لگانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اجودھیا کی بار بار آرکیولوجیکل سروے اور کھدائی ہوئی۔ اس کی تفصیلات ہم موجودہ دور کے مشہور مورخ رام شرن شرما کے ایک مضمون سے یہاں نقل کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ مضمون مسٹر شرما نے 10 رفروری

1990ء کو کاکتیا یونیورسٹی میں منعقدہ آندھرا پردیش ہسٹری کانگریس کے چودھویں اجلاس میں ''فرقہ وارانہ تاریخ اور رام کی اجودھیا'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اتر پردیش کے آثار قدیمہ کے سابق ڈائریکٹر رام چندر سنگھ نے اجودھیا میں سترہ مقامات کی کھدائی کروائی اور ''رن موچن گھاٹ'' و ''گپتار گھاٹ'' نام کے دو مقامات کی بھی کھدائی کروائی۔ ان کے مطابق وہاں زیادہ تر مقامات پر دوسری صدی قبل مسیح سے پہلے آبادی ہونے کے آثار نہیں ملتے۔ صرف مُنی پربت اور سوگریو پربت، نام کے دو مقامات کو موریہ عہد کا کہا جا سکتا ہے۔ بھارت سرکار کے محکمہ آثار قدیمہ کے سابق ڈائریکٹر جنرل برج واسی لال نے کئی بار اجودھیا کے کئی مقامات کی کھدائی کروائی اور اس کھدائی سے پتہ چلا کہ ساتویں صدی قبل مسیح تک اجودھیا نہیں بسی تھی۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی قبل مسیح بھی کچھ پہلے ہی جان پڑتی ہے کیونکہ اتری چھاپ والے پالیش دار برتنوں کی تاریخ کو، آسانی سے اس زمانہ تک کا نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ بات یاد رکھنی ہوگی کہ اجودھیا میں آبادی ہونے کی سب سے پرانے زمانے کے لئے ہمارے پاس کوئی کاربن ڈیٹنگ نہیں ہے۔ وہاں ابتدائی آبادی کی زیادہ قابل وثوق تاریخ کچھ مٹی کی مورتیوں کے وجود سے ملتی ہے۔ ان میں سے ایک چین کی شکل ہے جو موریہ عہد کی یا چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر اور تیسری صدی قبل مسیح کے ابتدائی دور کی ہے۔ بہر حال وسطی گنگا کے میدان کی کچھاری زمین میں جتنے مقامات کی کھدائی کی گئی، ان میں سے زیادہ تر مقامات ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح تک پورے طور پر بسے ہوئے اور آباد نہیں معلوم ہوتے۔ جو لوگ رام کی تاریخی شخصیت پر یقین رکھتے ہیں وہ ان کی تاریخ 2000 ق.م. کے آس پاس طے کر کے چلتے ہیں۔ ایسا اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ دشرتھ کے بیٹے رام مہابھارت کی جنگ عظیم سے تقریباً 65 نسل پہلے ہوئے تھے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مہابھارت کی جنگ 1000 ق.م. کے آس پاس ہوئی تھی۔ اس لیے ہمارے سامنے پورے طور پر اجودھیا کے بسنے اور اجودھیا میں رام کے عہد کے درمیان ایک ہزار سالوں سے زیادہ کا فرق سامنے آتا ہے۔ اس پریشانی کی وجہ سے کچھ اہل علم اجودھیا کو افغانستان میں بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

پھر وہ آگے لکھتے ہیں: ''اب تک خاص طور پر اجودھیا کا ذکر کرنے والی مہروں یا سکوں کا یہاں پتہ نہیں چلا ہے۔ ہمیں مختلف قسم کے سکے ضرور ملتے ہیں جنہیں اجودھیا سکوں کے نام سے جانا جاتا ہے، جو دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر پہلی صدی اور دوسری صدی عیسوی تک کے ہیں۔ لیکن ان

پر اجودھیا کا نام لکھا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اُجینی، تری پوری، ایرنو، کوشامبی، کپل وستو، وارانسی، ویشالی، نالندہ وغیرہ کی پہچان یا تو مہروں یا پھر سکّوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ اجودھیا سے موصول پہلی صدی کے ایک حجری کتبے میں پشیہ متر شنگ کے ایک خاندان کا ذکر ہے۔ لیکن سکّے اور حجری کتبے دشرتھ کے رام والی اجودھیا کی پہچان نہیں کرا پاتے۔ یہ سچ مچ حوصلہ شکن بات ہے کہ کافی کھدائی اور تحقیقات کے باوجود ہم موجودہ اجودھیا کو گپت عہد سے قبل کہیں بھی رام کے ساتھ یقینی طور پر نہیں جوڑ سکتے"۔

"بدقسمتی سے ہمارے پاس اس طرح کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جو 2000 ق.م. سے 1800 ق.م. کے درمیان ایک ایسا زمانہ جسے پرانوں کی راویت پر کام کرنے والے کچھ اہل علم نے رام کا زمانہ بتایا ہے، اجودھیا میں دشرتھ کے رام کی تاریخی حیثیت کو ثابت کر سکیں"۔

(رام رن شرما: فسطائی تاریخ نویسی اور رام کی اجودھیا)

اجودھیا رام جنم بھوم کی حثیت سے بہت بعد میں مانا جانے لگا۔ اس کا ثبوت ان تیرتھ کے مقامات کی فہرست سے بھی ملتا ہے جو قدیم مذہبی کتابیں فراہم کرتی ہیں کہ اس میں اجودھیا کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے تک اس کو یہ مقام حاصل نہیں تھا۔ اکبر کے عہد کے مشہور رام بھگت شاعر تلسی داس نے اپنی کئی کتابوں میں رام کی داستان بیان کی ہے، مگر کہیں بھی اجودھیا کو تیرتھ استھل کے طور پر پیش نہیں کیا ہے۔ اس طرح تلسی داس کی رام چرت مانس میں اجودھیا نہ تو رام مندر والے مقام کے طور پر ظاہر ہوئی ہے اور نہ ہی ہندوؤں کے تیرتھ مقام کے طور پر۔ اس کے برخلاف پریاگ (الہ آباد) کو تیرتھ راج یعنی سبھی تیرتھوں کا سرتاج کہا گیا ہے۔

اگر ہم ہندو عقیدوں کی تاریخ کو بنیاد بنا کر چلیں تو اجودھیا دھارمک تیرتھ استھل کے روپ میں عہد وسطیٰ میں اُبھری تھی۔ ایک قدیم کتاب "وشنو سمرتی" جسے تیسری صدی کے آس پاس کی تصنیف بتایا گیا ہے، اس کے باب 85 میں شہروں، تالابوں، ندیوں، پہاڑوں وغیرہ سمیت تیرتھ کے 52 مقامات گنائے گئے ہیں۔ لیکن اس فہرست میں اجودھیا کا نام کہیں نہیں ہے۔ یہ معاملہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس سمرتی میں تیرتھوں کی قدیم ترین فہرست موجود ہے۔ اب تک سولہویں صدی عیسوی سے پہلے کا کوئی رام مندر، اتر پردیش کے کسی بھی علاقے میں نہیں پایا گیا ہے۔ گھڑوال منتری بھٹ لکشمی دھر نے گیارہویں صدی میں ایک کتاب "کرتیہ کلپ ترو" لکھی۔ اس کے ضمیمہ کے

طور پر انہوں نے ''تیرتھ دوییچن کانڈ'' لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے زمانے کے اہم براہمن تیرتھ مقامات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف مشرقی اتر پردیش سے پوری طرح واقف تھے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ وہ نہ تو اجودھیا کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی رام جنم بھومی کا۔ اس لئے یہ واضح ہوتا ہے کہ اجودھیا کوئی بہت پرانا تیرتھ کا مقام نہیں رہی ہے۔

ہندو عقیدے کے مطابق شمالی ہندوستان میں اجودھیا سے زیادہ اہم کئی تیرتھ ہیں۔ پریاگ اور بنارس اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ صرف عہد وسطیٰ کے آخر میں یا عہد جدید کی ابتداء میں آکر ہی اجودھیا کو سات اہم تیرتھ استھلوں میں ایک مانا جانے لگا تھا۔

اجودھیا کی بہ نسبت دوسرے علاقوں میں رام کی پوجا اور رام مندروں کے پہلے سے ہونے کے ثبوت ملتے ہیں، جب کہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اجودھیا رام کی جائے پیدائش ہونے کے سبب پہلے سے رام کی پوجا اور مندروں سے آراستہ رہی ہے۔ رام بھگتوں میں ایک فرقہ رسک سمپر دائے کا رہا ہے۔ وہ رام کو کرشن اور گوپیوں کی راس لیلا کی طرح سیتا سے راس لیلا کرنے والا مانتا ہے۔ ان کے عشق کی داستان کو ڈرامہ کی شکل میں اسٹیج کر کے رام لیلا کرنا اور رامائن کی کہانیوں کا عوام میں پرچار کرنا رسک سمپر دائے والوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اس فرقہ میں رام کے ونواس اور مصیبتوں کا ذکر نہیں، بلکہ شاہی عیش و آرام اور کنک بھون (سونے کے محل) میں بیویوں، سکھیوں اور بڑی تعداد میں داسیوں (لونڈیوں) سے رنگ رلیاں منانا، سیر سپاٹے، شکار، ہاتھی گھوڑوں کی سجاوٹ، ناچ گانے وغیرہ رسک سمپر دائے کے رام کو پسند ہے۔ (رسک سمپر دائے کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ڈاکٹر بھگوتی پرساد سنگھ کی ہندی کتاب ''رام بھگتی میں رسک سمپر دائے'' دیکھئے) اسی فرقے نے شمالی ہندوستان یعنی مدھیہ پردیش سے نیپال تک اپنے ڈراموں اور کتھا کہانی کی محفلوں کے ذریعہ عوام میں رام کی بھگتی کا پرچار کیا تھا۔ اسی وقت سے اجودھیا بھی رام کی نگری اور تیرتھ استھل بن گئی۔

رام شرن شرما صاحب نے رام کے مندروں اور آثار کا بھی اپنے مضمون میں جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جہاں تک مجھے معلوم ہے ان لوگوں کے خیالات اور دعوے کی تائید میں تاریخی دلائل و شواہد کا ذرہ برابر عنصر بھی نہیں ہے، جو دعویٰ کرتے ہیں کہ گیارہویں، بارہویں صدیوں میں رام مندر کی تعمیر کی گئی تھی۔ تحقیقات اور کھدائی اس طرح کے کسی بھی دعوے کا ثبوت نہیں فراہم کرتیں۔ چھٹی صدی کے آس پاس رام، سیتا اور لکشمن حمیر پور ضلع میں مٹی کی مورت کی شکل میں ملتے

ہیں۔ جھانسی ضلع میں وشاوتار مندر کی باہری دیوار پر ان تینوں کی ایک تصویر بھی ملتی ہے۔ بہار کے نوادہ ضلع کے اکثر مقام پر تقریباً ساتویں صدی کی رام، سیتا اور لکشمن کی پلاسٹر کی مورتیاں بھی ملی ہیں۔ لگ بھگ اسی زمانے کی مٹی کی بنی رامائن کی تختی بکسر سے بھی حاصل ہوئی ہے۔

مدھیہ پردیش میں رام سے منسوب صرف تین مندر ہی تاریخی طور پر بارہویں صدی کے ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اتر پردیش میں ہمیں سولہویں صدی کے آخر تک نہ تو کوئی رام مندر ہونے کی بات سنائی دیتی ہے اور نہ رام جنم مندر ہونے کی۔ کنک منڈپ یا کنک بھون، جو سب سے پرانا مندر ہے، سترہویں صدی کا ہے۔ 1804-1805ء کی اودھی زبان میں لکھی کتاب 'شری مہاراج چرت' میں کہا گیا ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں کہا گیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں کنک بھون اور تلسنگھاسن رسک سمپر دائے کے مراکز کے طور پر اُبھرے تھے۔ یہ کنک بھون کے وجود کا تقریباً سب سے پرانا بیان ہے اور کنک مندر نیپال کی ترائی میں جنک پوری میں سیتا کا سب سے پرانا مندر ہے۔ کنک بھون اور کنک مندر دونوں ہی واضح طور پر سترہویں صدی میں مغل حکومت کے دوران تعمیر ہوئے۔ ان کی طرزِ تعمیر بھی ایک جیسی ہے۔ ان دونوں مندروں کے سترہویں صدی کے ہونے کی بات کا امکان اسلئے بہت زیادہ ہے کہ اسی دور میں رام کی بھگتی نے اہمیت حاصل کرنی شروع کی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے دوران اودھ کے نواب (جو شیعہ تھے) کے ہندو اور مسلمان دیوانوں نے اجودھیا کے ہندو مندروں اور مقدس مقامات کو اپنی طرف سے قبولیت کی سند عطا کر دی تھی۔ پھر بھی اس وقت تک کسی رام مندر کا خصوصی ذکر نہیں ملتا"۔

جب اجودھیا میں عہدِ مغلیہ کے آخر تک کسی رام مندر کا وجود ثابت نہیں ہوتا تو یہ بات کسی طرح تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ پہلے مغل حکمراں بابر نے رام مندر ڈھا کر اسی مقام پر بابری مسجد بنوائی۔ اجودھیا اور فیض آباد علاقے میں مسلم آبادی چودھویں صدی سے آباد ہے۔ اس لئے وہاں مسجد بنانا ان کی ضرورت تھی اور انہوں نے بنائی۔ اگر مندر توڑ کر بابری مسجد بنائی گئی ہوتی تو رام بھگتوں نے جو بڑی تعداد میں بھگتی کا لٹریچر تیار کیا ہے، اس میں اس سانحہ کا ذکر ضرور ملتا۔ حد تو یہ ہے کہ خود اجودھیا میں رام چرتر مانس لکھنے والے تلسی داس اس رام مندر کا کہیں ذکر نہیں کرتے۔ تلسی کا زمانہ بابر سے بہت قریب ہے۔ پھر مندر ڈھانے کا اتنا دردناک واقعہ اتنی جلد رام بھگت کیسے بھلا بیٹھے؟ بابر کے پوتے اکبر تو ہندوؤں پر بہت مہربان تھے۔ ان کی پوجا تک کی جاتی تھی۔ لیکن تاریخ اس بارے میں

خاموش ہے کہ تلسی داس یا کسی اور رام بھکت نے اکبر سے یہ درخواست کی ہو کہ ابھی چند سال قبل آپ کے دادا کے ہاتھوں ایک زخم کاری ہمیں لگا ہے۔آپ اس کا مداوا کر دیجئے۔

اجودھیا میں جھگڑے کی شروعات کیسے ہوئی اس کی تاریخ ہمارے پاس محفوظ ہے۔اس میں کسی قیاس آرائی اور اٹکل سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔اورنگ زیب کی حکومت کے مضبوط انتظام نے عوام میں امن وسکون قائم رکھا۔1707ء میں اس کے انتقال کے بعد ملک میں افراتفری پیدا ہو گئی۔آگے چل کر اجودھیا کے مندروں میں، جو اب تک تیرتھ مقام بن چکے تھے، کافی آمدنی اور چڑھاوے آنے لگے۔وہاں شیوسنیاسیوں اور ویشنو ویراگیوں کے منظم گروہ کے درمیان کھلم کھلا خونی ٹکراؤ ہونے لگا۔ان دونوں کے درمیان جھگڑے کا اصل سبب تھا کہ ان مذہبی مقامات پر کن کا قبضہ رہے اور تیرتھ یاتریوں کے چڑھاوے اور تحفے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر کن کا قبضہ ہو۔ 1804-1805ء کی لکھی ایک کتاب ''شری مہاراج چرت'' مصنفہ رگھوناتھ پرساد میں اس ٹکراؤ کا منظر اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

''اس وقت جب رام کی یومِ پیدائش کا موقع آیا، لوگ بڑی تعداد میں کوسل پور میں جمع ہوئے۔کون اس زبردست بھیڑ کا بیان کرسکتا ہے۔اس مقام پر ہتھیار لیے جٹا جوٹ دھاری (سر کے الجھے بالوں کی لٹ والے سنیاسی) اور بدن کے پورے حصے میں بھسم (راکھ) لپیٹے لامحدود سنیاسی لباس میں طاقتور جنگ جُو موجود تھے۔جنگ کے لیے مچلتی فوجوں کی لاتعداد پلٹن تھی۔ویراگیوں کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی۔یہ لڑائی ویراگیوں کے کسی کام نہ آئی کیونکہ ان کے پاس جنگی سوجھ بوجھ اور مہارت کی کمی تھی۔انہوں نے وہاں ان کی طرف بڑھنے کی غلطی کی۔ویراگی لباس اور علامات بدحالی کا سبب بن گئی۔ویراگی لباس والے سارے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ان سنیاسیوں سے بہت دور۔انہوں نے اودھ پور خالی کر دیا۔جہاں بھی سنیاسیوں اور ویراگی بھیس میں لوگ نظر آتے، وہ انہیں خوفناک طریقہ سے دہشت زدہ کرتے۔ان کے ڈر سے ہر کوئی خوف زدہ تھا اور جہاں بھی ممکن ہوسکا لوگوں نے انجان جگہوں میں پناہ لی اور اپنے کو چھپا لیا۔انہوں نے اپنا بانا (لباس وعلامات) بدل ڈالا اور اپنے فرقے کی مخصوص علامتوں سے متعلق نشانات چھپا دیئے۔کوئی بھی اپنی صحیح پہچان ظاہر نہیں کر رہا تھا۔''

جس وقت ویشنو ویراگیوں کی یہ شرمناک شکست شیوسنیاسیوں کے ذریعہ ہوئی، اس وقت تک

وہاں ہندو مسلم تفرقہ بابری مسجد سے متعلق کوئی تنازعہ سامنے نہیں آیا تھا۔ اسی زمانے میں (انیسویں صدی کی پہلی دہائی) ہندوؤں کے اس آپسی جھگڑے کو مسلمانوں کی طرف پھیرنے کے لئے فیض آباد گزیٹیر کے انگریز مصنف نیول نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ بغیر کسی تاریخی ثبوت کے اس نے لکھا کہ ''ایک قدیم مندر کو گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی گئی تھی۔'' پھر 1920ء میں مسز بیورج (Beveridge) نے بابر نامہ کا انگریزی ترجمہ کرتے ہوئے اس کے ضمیمہ میں فیض آباد گزیٹیر کا حوالہ پیش کرتے ہوئے بغیر کسی بنیاد کے ''ایک قدیم مندر'' لفظ کے بعد قوسین میں لکھ دیا کہ ''(رام کی جائے پیدائش ظاہر کرنے والا)''۔ اس طرح مسز بیورج ہی ہیں جو نیول کے فرضی ''قدیم مندر'' کو رام مندر کہتی ہیں۔ لیکن اس طرح کی کسی مسجد کی تعمیر کا کوئی ذکر بابر نامہ میں نہیں ملتا۔ اس لیے مسز بیورج نے ایک ایسے کتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جس کے مطابق میر باقی نے بابر کے حکم سے 935ھ میں جو 15/ستمبر 1528ء تا 5/ستمبر 1529ء کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک مسجد بنوائی تھی۔ کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے میر باقی کے بارے میں کوئی علم حاصل ہوسکتا ہو۔ پھر اس کتبہ میں مندر کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے یہ اٹکل لگانا کہ کسی رام مندر کو ڈھایا گیا تھا، پوری طرح بے بنیاد ہے۔

بابر نامہ (جو بابر کا یادداشت نما روزنامچہ ہے) میں 2/اپریل و 18/ستمبر 1528ء جو مدت ہجری 934 کے آس پاس ہے، کے بیان کے بیچ ایک خلا ہے۔ یا تو بابر نے ان تاریخوں میں کچھ لکھا نہیں یا پھر بابر نامے کے وہ اوراق کسی سبب ضائع ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے یہ قیاس کیا کہ اگر مندر تھا بھی تو اسے اس عرصہ کے دوران ہی ڈھایا گیا ہوگا اور مسجد بنائی گئی ہوگی۔ لیکن مسجد کی تعمیر کا ذکر کرنے والا کتبہ 935ھ کے عرصہ کا ہے جو 15/ستمبر 1528ء تا 5/ستمبر 1529ء کو محتوی ہے۔ اس طرح اس کتبے میں 15 سے 18 ستمبر 1528ء کے درمیان تین دنوں کا خلا ہی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ناقابل یقین ہے کہ مسجد ان تین دنوں کے اندر بنالی گئی ہوگی۔ لیکن فیصلہ کن مسئلہ مسجد کی تعمیر کا نہیں بلکہ مزعومہ رام مندر کے ڈھانے کا ہے۔ مسز بیورج کا اقتباس جو فیض آباد گزیٹیر کا ہے وہ خود دلیل کا محتاج ہے۔

بابر نامہ سے بابر کا جو مزاج اور اس کی سوچ سامنے آتی ہے، اس سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس نے ایسا عمل کیا ہوگا۔ بابر اودھ کا ذکر کرتا ہے لیکن اجودھیا کا نہیں۔ دوسری طرف وہ گوالیار کا بیان کرتا ہے۔ بڑے ہی طمطراق اور دلچسپی کے ساتھ وہ وہاں کی عام اور مذہبی عمارتوں کی فن تعمیر

کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں التمش کی تعمیر کردہ مسجد ہے، باقی تمام عمارتیں ہندوؤں کی ہیں۔ بابر مورتیوں اور مندروں یعنی چندیری سمیت گوالیار کے مندروں کی بڑی تعریف کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو نصیحت کی ہے کہ ہندوؤں کو خوش رکھا جائے تاکہ ہندوستان میں اس کی حکومت مستحکم رہے اور ہندو عوام کی تائید اور ہمدردی اس کو حاصل رہے۔ وہ یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ ہندوستان میں گاؤ کشی کو بھی ممنوع کرنے کی وصیت کر گیا۔ اس سوچ اور فکر کے حامل شخص سے رام کے مندر ڈھانے کا تصور کتنا بعید از قیاس ہے، یہ ہر عقلمند آدمی کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ہندوؤں کے منادر اور طرزِ تعمیر کے ثنا خواں بابر کے سر مندر ڈھانے کا الزام، وہ بھی ایک ایسا مندر جس کا کہیں وجود ہی نہیں تھا، کتنا مضحکہ خیز ہے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ بابری مسجد اجودھیا کے کسی رام مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔

ان سب حقیقتوں کے علی الرغم کچھ فتنہ پرور افراد کا دعویٰ اور ان کی سازشیں جاری رہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی صبح کے نمودار ہوتے ہی ان کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ قانون کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے انہوں نے دھاندلی کا راستہ پسند کیا۔ رام کی مورت رات کے اندھیرے میں بابری مسجد کے اندر داخل کر دی گئی اور مشہور یہ کر دیا گیا کہ رام خود بخود اپنے جنم استھان پر نمودار (پرکٹ) ہو گئے۔ عدالت کے حکم سے مسجد میں تالا لگوا دیا گیا۔ جواہر لعل کی جھولی میں کوئی انصاف نہ تھا، اس لئے بابری مسجد مقفل پڑی رہی۔ باہر عوام کو گمراہ کرنے کی سرگرمیاں اشتعال انگیزی کی حد تک جاری رہیں۔ پھر جواہر کے نواسے راجیو گاندھی کے دور میں قفل کھول کر مسجد فسطائیوں کے حوالے کر دی گئی۔ بالآخر فسطائیوں کے ہاتھوں 6/دسمبر 1992ء کو مسجد شہید کر دی گئی۔ اب وہاں رام مندر تعمیر کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ عدالتیں اور حکومت دم سادھے حالات کا نظارہ کر رہی ہے۔

رام کشن ترپاٹھی نے 1969ء میں ایک تاریخ لکھی ہے جس کا نام ہے ''جنم بھوم کا رکت رنجت اتہاس''، یعنی جنم بھومی کی خونیں تاریخ۔ اس کتاب کے ذریعہ جھوٹ کو سچ کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرقہ پرستوں کے جھوٹے پرچار کا ایک نمونہ رام شرن شرما کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''فرقہ پرستی کی تبلیغ کا ایک اہم نمونہ بابری مسجد کی دیوارں پر بنی ایک دم حال کی تین تصویریں ہیں۔ اس مسجد میں رام کی مورت کو زبردستی بٹھایا گیا ہے۔ جس ضلع مجسٹریٹ کے فیصلے کے سبب فرقہ پرست بابری مسجد کو اپنے قبضے میں لے سکے، اس کا مجسمہ بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ مسجد کے

دروازے پر نصب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے تو لگتا ہے کہ فرقہ پرست رام کی پوجا کرنے سے زیادہ اس جج کی احسان مندی کو اجاگر کرنے میں لگے ہیں۔ دراصل رام کو اپنی گھناؤنی سیاسی ہٹ دھرمیوں کو چھپانے کے لئے آڑ بنا لیا گیا ہے۔ ایک دیوار کی تصویر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح بابر کی فوجیں رام کے اس خیالی مندر کو ڈھا رہے ہیں اور ہندوؤں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہے کہ بابر کے سپاہیوں نے اجودھیا میں رام مندر پر حملہ کرتے وقت 75 ہزار ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور ان کے خون کو گارے کی طرح استعمال کر کے بابری مسجد کھڑی کی۔ آگ لگانے والی ایسی جھوٹی باتیں فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ پرچار اتنا ہی جھوٹا ہے جتنا یہ خیال کہ بابر نے رام مندر کو منہدم کیا اور اس کی جگہ پر بابری مسجد بنوائی''۔

فرضی داستان کبھی تاریخ کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی۔ چنانچہ پچھلی ایک صدی کی تحقیقات اور آثار سے رام مندر کا وجود اور پھر اس کا منہدم کیا جانا کسی طرح ثابت نہ ہو سکا، بلکہ ان کے خلاف ہی دلائل قائم ہوتے گئے۔ اس حالت سے گھبرا کر اب فسطائی قوتوں نے اسے عقیدت کا مسئلہ بنا دیا اور کسی بھی عدالتی فیصلہ کو ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدت کا مسئلہ نہیں بلکہ ملکیت کا مسئلہ ہے۔ اگر عدالتوں اور ہندوستانی سیاسی پارٹیوں نے اس دھاندلی کو اسی طرح آئندہ بھی نظر انداز کر دیا، جیسا کہ وہ اب تک کرتی آ رہی ہیں تو بات یہیں تک نہیں رکی رہے گی۔ اس سے ہزاروں نئے مسائل پھوٹ پڑیں گے۔ تیس ہزار مساجد اور مسلمانوں کے وجود کے خلاف جو گھناؤنے عزائم برسوں سے فسطائیوں نے تیار کر رکھے ہیں ان سب کو عملی جامہ پہنانے کا جواز مہیا ہو جائے گا۔ اس لیے نامور مورخ رام شرن شرما اس سے متنبہ کر رہے ہیں:

''سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ تاریخ کا استعمال بابری مسجد کو توڑ گرانے اور اس کی جگہ رام مندر کھڑا کرنے جیسے مطالبات سمیت تمام طرح کے تخریبی مطالبوں کو مبنی بر انصاف ٹھہرانے کے لیے کیا جاتا ہے۔''

(بشکریہ: افکار ملی، نئی دہلی ''بابری مسجد نمبر'')



# اجودھیا: مختلف مذاہب کا مرکز

از: خلیق احمد خاں

اجودھیا کو اگر یروشلم ثانی کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہاں موجود مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں اجودھیا کی اصل تصویر پیش کرتی ہیں جو گنگا جمنی وراثت کی آئینہ دار ہے۔ اجودھیا کی اہمیت کو محض ہندو کا دھرم تک محدود کرنا حقائق کو منہ چڑھانے کے مترادف ہوگا۔ یہ ایک مقدس جگہ ہے لیکن صرف ہندوؤں کے لیے نہیں۔

''وشنو سمرتی میں 52 زیارت گاہوں کا ذکر ہے جن میں قصبات، جھیلیں، دریائیں، پہاڑ وغیرہ شامل ہیں مگر اس فہرست میں اجودھیا کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ تلسی داس جنہوں نے اودھ پوری میں 1574ء میں رام چرتر مانس لکھی، انہوں نے بھی اس میں اجودھیا نام کی کسی زیارت گاہ کا ذکر نہیں کیا جبکہ پریاگ کو تمام تیرتھ استھانوں کا راجہ یعنی تیرتھ راج کہا گیا ہے۔''

(Communal History and Ram's Ayodhya آر.ایس.شرما، پیوپلس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 1990ء)

علاوہ ازیں اتر پردیش کے سیاحتی نقشے میں 1980ء سے قبل تک اجودھیا کو کبھی بھی زیارت گاہ کا درجہ حاصل نہیں رہا ہے۔

## بدھ کی اجودھیا

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوؤں کے لئے زیارت گاہ بننے سے پہلے اجودھیا کو ایک عظیم بودھ مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ شہرہ آفاق بودھ سیاح ہیون سانگ نے لکھا ہے کہ اجودھیا میں کم و بیش تین ہزار بودھ بھکشو رہا کرتے تھے۔ اس وقت وہاں ایک سو بودھ مٹھ اور دس بڑے مندر موجود تھے۔ ہیون سانگ ساتویں صدی میں اجودھیا آیا تھا۔

پانچویں صدی کے ایک دوسرے چینی سیاح فاہین نے اجودھیا میں ایک بدھ کنڈ کا ذکر کیا ہے جسے اب برہمنوں نے داتن کنڈ کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

## جینیوں کی اجودھیا

جینیوں کے لئے بھی اجودھیا ایک مقدس شہر ہے۔ پانچ جینی تیرتھنکر یا مذہبی گرو اجودھیا میں پیدا

ہوئے تھے جو رشبھ دیو، اجیت ناتھ، ابھی نندن ناتھ، شکتا ناتھ اور اننت ناتھ کے نام سے مشہور ہوئے۔

## سکھوں کی اجودھیا

اجودھیا کا تعلق سکھوں سے بھی رہا ہے۔ سرجو کے کنارے واقع گرودوارہ برہم کنڈ صاحب اجودھیا سے سکھوں کے تعلق کا آئینہ دار ہے۔ 1557ء میں گرونانک دیو، 1725ء میں گرو تیغ بہادر اور 1772ء میں سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ اجودھیا تشریف لائے تھے۔

## اجودھیا سے مسلمانوں کا تعلق

حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا اس دھرتی پر سب سے پہلے آدمی تھے۔ ان کے بیٹے شیث علیہ السلام بھی پیغمبر تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اجودھیا میں مدفون ہیں۔ ان کی قبر مبارک آج بھی موجود ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی اجودھیا سے ایک تعلق خاص حاصل ہے۔ دورِ رسالت محمدیہ ﷺ سے ہزاروں سال قبل کے ایک برگزیدہ نبی حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک عرصے تک اجودھیا میں مقیم رہے۔ ''نبی نوحؑ کا محلہ'' نام کی ایک بستی آج بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں 14 گز لمبی ایک پرانی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے۔

حالانکہ مورخوں نے اجودھیا میں بودھوں، جینیوں اور سکھوں کے تعلق پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن مسلمانوں سے اس کے تعلق خاص کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ اجودھیا اور اس کے قرب و جوار میں اس قدر بزرگانِ دین مدفون ہیں کہ یہاں کے باشندے اسے ''خورد مکہ'' تصور کرتے ہیں۔

بارہویں صدی سے ہی نہ جانے کتنے صوفیوں نے اسے روحانی تعلیمات اور رشد و ہدایات کا مرکز بنایا۔ ایسے ہی صوفیائے کرام میں قاضی قدوۃ الدین اودھیؒ کا نام سرفہرست ہے۔ شمالی ہند کے مشہور و معروف قدوائی خانوادے کے یہ مورث اعلیٰ ہیں۔ قاضی صاحب نہ صرف ایک بڑے عالم اور اسلامی دانشور تھے بلکہ ایک بڑے صوفی بھی تھے۔ آپ بارہویں صدی میں وسط ایشیا سے اجودھیا تشریف لائے تھے۔

اسی طرح ایک دوسرے بڑے صوفی شیخ بدر الدینؒ واعظ اولین قرون وسطیٰ میں اجودھیا میں جلوہ فرما تھے۔

پندرہویں صدی میں فردوسیہ صوفی سلسلہ کے اہم صوفی شیخ جمال کجرویؒ اجودھیا میں بارش انوار فرما رہے ہیں۔

چودہویں صدی کے شہرۂ آفاق صوفی خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعدد خلفاء کا مسکن بھی اجودھیا تھی۔ آپ کے خلفاء میں سب سے مشہور صوفی شیخ نصیر الدینؒ چراغ دہلی، جن کا مزار آج کی نئی دہلی میں واقع ہے، اجودھیا میں پیدا ہوئے تھے جہاں انہوں نے شیخ شمس الدین یحییٰ اودھیؒ سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ چالیس سال کی عمر میں آپ اجودھیا سے دہلی تشریف لائے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے قدموں سے وابستہ رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دیگر خلفاء میں شیخ جمال الدین اودھیؒ، قاضی محی الدین کاشانیؒ، مولانا قمر الدین اودھیؒ اور شیخ علاؤ الدین علیؒ مشہور و معروف ہیں۔ علاوہ ازیں شیخ زین الدین علی اودھی، شیخ فتح اللہ اودھی اور علامہ کمال الدین اودھی کے اسمائے گرامی بھی قابلِ ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا صوفیاء میں سے متعدد صوفی اور اجودھیا کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی ان کی خانقاہوں کے آثار و باقیات بابری مسجد کی تعمیر سے پہلے سولہویں صدی کے اوائل سے متعلق ہیں۔

آج اجودھیا اور اس کے گرد و نواح میں پھیلے سیکڑوں پرانے مقبروں اور شکستہ مسجدوں کے باقیات اپنوں اور بیگانوں کی بے توجہی کا شکوہ زبانِ حال سے کر رہے ہیں۔ صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی کے آثار بھی معدوم ہیں کیونکہ یہ علاقہ درحقیقت ایک میدانِ جنگ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

## اجودھیا کی چند مشہور درگاہیں

- درگاہ نوح علیہ السلام یا نوگزی پیر
- تین درویشوں کی درگاہ
- شہید مرد تابا کی درگاہ
- ننھے شاہ بابا کی درگاہ اور شہید بابا
- شیخ شمس الدینؒ فریادرس کی درگاہ
- مخدوم شاہ فتح اللہ کی درگاہ
- شاہ جمال کجروی کی درگاہ
- سید محمد ابراہیم علیہ السلام کی درگاہ
- بجلی شہیدؒ کی درگاہ
- شیخ سمن شاہ بابا کی درگاہ
- شیث علیہ السلام پیغمبر کی درگاہ
- بڑی بوا کی درگاہ
- سید شاہ مقدسؒ کی درگاہ

ان درگاہوں کے علاوہ اجودھیا میں پچاس سے زیادہ درگاہیں اور موجود ہیں۔

نزول اور محصولات کے ریکارڈ کے مطابق آدھی اجودھیا مسلمانوں کی مساجد 100، قبرستان (سو سے زائد)، مقبروں، امام باڑوں سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ اجودھیا پر مسلمان ایک مضبوط دعویٰ کے حامل ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کسی بھی شہر میں اتنے مذہبی مقامات نہیں ہیں جتنے اس چھوٹے سے قصبے میں موجود ہیں۔

## ماخذ:


① شہر اولیاء............ڈاکٹر دبیر احمد

② تاریخ گم گشتہ............غلام محمد

③ (Communal History and Ram's Ayodhya)............از: آر ایس شرما

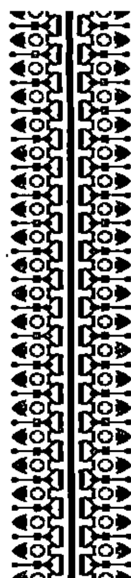
④ Babri Masjid: A Tale Untold............مرتب: محمد جمیل اختر

⑤ Sufi Shrines of Ayodhya............از: وِدّیا بھوشن راوت

⑥ سرکاری نزول ریکارڈ اور محصولات ریکارڈز فیض آباد (یو. پی)


ترجمہ: محمد صغیر حسین



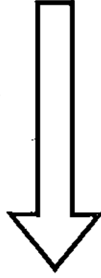





# بابری مسجد بنام رام جنم بھومی







"گھرائی سے چھان بین کرنے کے بعد یہ بات مخفی نہیں رهتی کہ موجودہ اجودھیا رام کے دور کی اجودھیا کی باقیات نہیں بلکہ ھزاروں سالوں بعد نئی تعمیر شدہ اجودھیائے اصغر ھے۔ جس کے تمام مناظر نئے اور خیالی ھیں۔ یہ کسی بھی طور ثابت نہیں ھو پاتا کہ اس قدر محدود رقبہ میں اجودھیا جیسی عظیم اور تاریخی نگری واقع رھی ھو گی۔"

کتاب: بلیا اور اس کے نواحی
از: درگا پرساد گپت

# شری رام کی پہیلیاں

از: ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر

زیرِ نظر تحریر میں بعض چونکا دینے والے انکشافات ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اصل تاریخ میں ردو بدل کرکے صورت واقعہ کو کیا سے کیا بنادیا جاتا ہے۔ایک نقطۂ نظر کے طور پر اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

شری رام، راماین کے ایک اہم کردار اور ہیرو ہیں۔ راماین کے اصلی مصنف والمیکی ہیں۔ رامائن کی کہانی بہت ہی مختصر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بہت ہی آسان ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں ہے۔ رام، اجودھیا کے راجہ دشرتھ کے لڑکے تھے۔ یہ اجودھیا آج کا بنارس کا شہر ہے۔ راجہ دشرتھ کی تین بیویاں تھیں۔ کوشلیا، کیکئی اور سومترا۔ رانی کیکئی نے راجہ دشرتھ سے چند خاص شرائط پر شادی کی تھی۔ اور راجہ دشرتھ نے ان شرائط کو کسی وقت بھی پورا کرنے کا وعدہ کیکئی سے کیا تھا۔ راجہ دشرتھ ایک عرصے تک اولاد سے محروم رہے تھے۔ دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ اپنے تخت و تاج کے وارث کی خواہش ہمیشہ ان کے دل میں پیدا ہوتی رہی۔ اپنی تینوں رانیوں سے اپنے وارث کی خواہش پوری نہ ہوتی دیکھ کر راجہ دشرتھ نے پتر شتی یگنہ (Putreshti Yajna) کا اہتمام کروایا۔ جس کے لئے بطور خاص رشی شرینگ (Shrung) کو بلوایا گیا جس نے قربانی کی اور تین پنڈ (Pind) بنوائے اور یہ انہیں کھانے کے لئے دیے۔ اس یگنہ کے بعد یہ تینوں رانیاں حاملہ ہوگئیں اور تینوں نے بیٹوں کو جنم دیا۔ کوشلیا نے ''رام'' کو جنم دیا، کیکئی نے ''بھرت'' کو اور سمترا نے دو لڑکوں ''لکشمن اور شترگھن'' کو جنم دیا۔

وقت کے ساتھ راجہ دشرتھ کے لڑکے بڑے ہو گئے، شری رام نے سیتا سے شادی کی، راجہ دشرتھ جو بہت بوڑھے ہو چکے تھے، نے شری رام کو اپنی جگہ اجودھیا کا راجہ بنانے کا سوچا۔ لیکن جب یہ

بات کیکئی کے کانوں تک پہنچی تو اس نے راجہ دشرتھ کو اپنا دیا ہوا وچن یاد دلوایا اور اپنی شرائط سے آگاہ کیا۔ اس نے راجہ دشرتھ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا وارث اس کے بیٹے ''بھرت'' کو بنائیں اور رام کو بارہ برس کا بن باس دیں۔ راجہ دشرتھ نے مجبور ہو کر کیکئی کی شرائط کو تسلیم کر لیا۔ رام سیتا اور اپنے سوتیلے بھائی لکشمن کے ہمراہ بارہ برس کے بن باس پر چلے گئے۔ یہ تینوں جنگل میں رہنے لگے۔ راون جو لنکا کا بادشاہ تھا، اس نے سیتا کو جنگل سے اغوا کر لیا اور اپنے ساتھ لنکا لے بھاگا اور لے جا کر اپنے محل میں نظر بند کر دیا۔

''والی'' اور ''سگریو'' دو بھائی تھے ان کا تعلق وانر قبیلے سے تھا۔ یہ دونوں بھائی حکمراں خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا اپنا علیحدہ ملک تھا اور اس کا پائے تخت کیشکنڈ تھا۔ جس وقت راون نے سیتا کو اغوا کیا تھا اس وقت ''والی'' کیشکنڈ کا راجہ تھا۔ اس کی لڑائی ایک راکشش جس کا نام مایہ وی تھا سے ہو رہی تھی۔ جب والی اور سگریو لڑتے لڑتے مایہ وی کے دو بدو آ گئے تب مایہ وی اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور زمین کے ایک تاریک غار میں جا گھسا۔ والی اور سگریو نے اس کا پیچھا کیا۔ والی نے سگریو سے کہا کہ وہ غار کے دہانے پر کھڑا رہ کر اس کا انتظار کرے اور خود اکیلا غار میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غار سے خون کا دریا بہنے لگا۔ سگریو کو یہ یقین ہو گیا کہ بھائی والی کو تنہا پا کر مایہ وی نے اس کو مار ڈالا ہے۔ وہ واپس کیشکنڈ آ گیا اور خود راجہ بن بیٹھا اور ہنومان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ والی غار میں مارا نہیں گیا تھا بلکہ اس نے مایہ وی کو قتل کر ڈالا تھا۔ والی جب غار سے باہر آیا تو سگریو کو غار کے دہانے پر نہ پا کر اسے غصہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی۔ وہ سیدھا کیشکنڈ کی ہی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں اسے یہ معلوم کر کے بے حد غصہ آیا اور افسوس بھی ہوا کہ اس کا بھائی راجا بن بیٹھا ہے۔ اس کو غصہ اس بات پر زیادہ تھا کہ سگریو نے بغیر جانچ پڑتال کیے خود راج پاٹ کیسے سنبھال لیا۔ اگر وہ مایہ وی کے ساتھ لڑائی میں مارا بھی جاتا تو اس کو چاہئے تھا کہ خود کو راجہ بنانے کے بجائے اس کے لڑکے انگد (Angad) کو راجہ بناتا۔ یہ تو کھلا دشواس گھات ہے، دھوکہ ہے۔ والی نے سگریو سے جنگ کی اور اس کو نکال باہر کیا اور پھر سے وہ کیشکنڈ کا راجہ بن گیا۔ اس طرح سے دونوں بھائی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ والی اور سگریو کی یہ لڑائی ایک دوسرے کے ساتھ حق تلفی کی لڑائی تھی۔ یہ واقعہ ٹھیک اس وقت ہوا جب راون

نے سیتا کا اغوا کیا تھا۔ رام اور لکشمن سیتا کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہے تھے۔ سگریو اور ہنومان بھی جنگلوں میں چھپتے پھر رہے تھے۔ انہیں تلاش تھی ایسے دوستوں کی جو ان کو تخت و تاج حاصل کرنے میں ان کی مدد کرسکیں۔ اتفاقاً دونوں پارٹیوں کی ملاقات ایک جنگل میں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مشکلات سے ایک دوسرے کو آگاہ کیا۔ اور پھر دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت سگریو اور ہنومان سیتا کو تلاش کرنے میں رام کی ہر طرح مدد کرنی تھی اور رام کو لڑائی کے وقت سگریو کا ساتھ دینا تھا۔ یہ منصوبہ تیار ہوا کہ جب سگریو اور والی کی لڑائی ہوگی تب رام کو پہچاننے میں آسانی کے لئے سگریو اپنے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال رکھے گا۔ جبکہ والی کا گلا خالی رہنا تھا اور رام کسی محفوظ مقام پر چھپ کر تیر چلائیں گے۔ اس طرح منصوبہ کے مطابق سگریو نے لڑائی کے وقت اپنے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال لی اور رام ایک درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے اور موقع ملتے ہی رام نے والی کو اپنے تیر سے مار ڈالا۔ اس طرح رام کی مدد سے سگریو اپنے بھائی والی کو مار کر دوبارہ کیشکنڈ کا راجہ بن بیٹھا۔ والی کا یہ خون منصوبہ بند طریقے سے اور سازش کے ذریعہ کیا گیا۔ جب کہ والی کی رام سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ رام کے کردار پر والی کا یہ خون ایک بدنما داغ ہے لیکن یہ ان کی مجبوری تھی کیونکہ سیتا کو ڈھونڈھنے کے لئے انہیں سگریو اور ہنومان کی مدد چاہئے تھی جبکہ سگریو نے والی کا یہ خون ایک سازش کے تحت بہت سوچ سمجھ کر اور ایک مقصد کو سامنے رکھ کر کرایا تھا۔

سگریو اور ہنومان نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی تاکہ لنکا پر چڑھائی کی جاسکے۔ رام نے لنکا میں بھی منصوبہ بندی سے کام کیا۔ لنکا میں رام نے وبھیشن کی مدد لی اور منصوبہ میں اس کو شامل کر لیا۔ یہ وبھیشن راون کا بھائی تھا۔ رام نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ راون اور اس کے لڑکے اندر جیت کو مار ڈالے گا اور لنکا کا تخت و تاج اس کے حوالے کر دے گا۔ جب رام نے راون اور اس کے لڑکے کو مار ڈالا تو رام نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ انہوں نے راون کی ارتھی کو بڑے اہتمام کے ساتھ اُٹھایا۔ اس کے بعد وبھیشن کی تاج پوشی کی رسم ادا کی۔ اور تاج پوشی کی رسم کے بعد رام نے ہنومان کو سیتا کے پاس روانہ کیا۔ اور یہ پیغام دیا کہ وہ خود اور لکشمن و سگریو صحت مند ہیں اور انہوں نے راون کو مار ڈالا ہے۔ حالانکہ راون کی ارتھی کو جلانے کے بعد ہی رام کو چاہئے تھا کہ وہ پہلے سیتا

سے ملاقات کرتے اور پھر کسی اور طرف توجہ دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا! بجائے خود سیتا سے ملاقات کرنے کے، انہوں نے ہنومان کو سیتا کے پاس روانہ کیا۔

سیتا نے ہنومان سے رام کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ دس ماہ سے زائد عرصے تک راون کے محل میں نظر بند تھیں۔ اور رام سے ملاقات کرنے کی ان کی شدید خواہش تھی۔ آخر سیتا کو رام کے سامنے لایا گیا۔ تب جانتے ہو رام نے سیتا سے کیا کہا؟...... ایک عام آدمی جس میں تھوڑی بہت سی بھی انسانی ہمدردی ہو اس بات پر یقین نہیں کر سکتا ہے جب اسے یہ معلوم ہو کہ اس کی بیوی جو ایک عرصے تک اپنے گھر سے باہر رہی ہو۔ اپنے شوہر سے الگ رہی ہو۔ جسے زبردستی بھگا کر لے جایا گیا ہو جس نے کافی اذیتیں برداشت کی ہوں۔ اس کے جذبات اور احساسات کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کو صرف اور صرف والمیکی جیسا قلم کار ہی جان سکتا ہے۔ اور جب سیتا اپنے شوہر سے ملتی ہے تب رام نے ان کو اس طرح مخاطب کیا۔

''میرا دشمن جس نے کہ تجھے بندی بنا لیا تھا، اس کو جنگ میں میں نے شکست دے دی ہے۔ مین نے اس کو ہرا دیا ہے اور اس کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں نے محنت کی اور اس کا پھل مجھے ملا۔ میں صرف راون کو ختم کرنے کی نیت سے ہی آیا تھا تاکہ اپنے دامن پر لگا داغ دھو سکوں۔ تو یہ مت سمجھ یہ جنگ میں نے تیری خاطر لڑی ہے میں نے تیری خاطر یہ خطرناک اقدام نہیں کیا! میں نے تجھے جنگ کی لُوٹ کی طرح دوبارہ حاصل کر لیا ہے''۔ رام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے سیتا سے مزید کہا: ''مجھے اب تیرے کردار پر بھی شک ہے۔ راون نے تجھے خراب کیا ہوگا۔ تو اب میری نظروں میں پاکیزہ نہیں رہی۔ میری نظروں میں تیری خوبصورتی بے حد گھناؤنی ہے۔ اے جنک کی بیٹی، میں تجھے اجازت دیتا ہوں، تو جہاں جانا چاہتی ہے چلی جا۔ مجھے اب تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں نے تجھے جنگ کی ایک ''لُوٹ'' کی طرح حاصل کیا ہے۔ میں نے تجھے دوبارہ جیت کر حاصل کر لیا ہے۔ اس سے مجھے بیحد تسلی ملی ہے۔ یہاں میرا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا ہوں کہ تیری جیسی خوبصورت عورت کو راون نے یوں ہی چھوڑ دیا ہوگا''۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ رام کے یہ زہریلے جملے سیتا کو بے حد عامیانہ لگے۔ انہوں نے رام سے کہا کہ کاش وہ خودکشی کر لیتی تاکہ ہر قسم کی پریشانی سے بچ جاتی۔ اگر ہنومان پہلی مرتبہ آ کر اسے یہ پیغام نہ دیتا کہ رام اسے ایک بے بس عورت سمجھتا ہے کیونکہ اسے زبردستی اغوا کیا گیا اور بھگا کر لے جایا گیا تھا۔ سیتا نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ اب بھی پاکیزہ ہے، اگنی پریکشا دینا منظور کر لیا۔ وہ آگ میں اُتر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلوں میں سے زندہ اور صحیح سلامت واپس آ گئی۔ دیوتاؤں نے اس ثبوت پر اطمینان کا اظہار کیا اور گواہی دی کہ سیتا پاک ہے۔ اس کے بعد رام نے سیتا کو قبول کیا اور وہ اُن کے ساتھ ہی واپس اجودھیا آ گئیں۔

اجودھیا آنے کے بعد رام نے راج پاٹ سنبھالا اور سیتا ان کی رانی کہلائیں۔ لیکن جب شہر میں راون کے حوالے سے سیتا کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کہی جانے لگیں تو رام اُلجھن میں پڑ گئے۔ والمیکی نے اپنی رامائن میں اس طرح واضح کیا ہے:

رام سیتا پر شک کرنے لگے۔ رام کا یہ شک شہر میں پھیلی افواہوں کی وجہ سے اور بھی روز بہ روز بڑھنے لگا۔ محل کے بھانڈ بھدرا نے اجودھیا میں پھیلی سیتا کے تعلق سے زہریلی افواہیں رام کو بتلائیں۔ رام کو یہ زہریلی باتیں دن رات بری طرح ڈسنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بے حد بے عزت محسوس کرنے لگے۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ اور رام نے سیتا کو اپنے سے الگ کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور اپنے مقصد میں جلدبازی سے کام لیتے ہوئے رام نے ہر راستہ اختیار کیا۔ سیتا کو لاوارث سمجھ کر بے یار و مددگار ایک ایسے وقت چھوڑ دیا گیا جب کہ وہ ماں بننے والی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سیتا کو گھر سے بے گھر کرنے کا منصوبہ اچانک نہیں بنا تھا، یہ فیصلہ رام نے بغیر سوچے سمجھے نہیں کیا تھا۔ اس منصوبے کو کہاں اور کیسے بنایا گیا اور اس پر عمل درآمد کیلئے ہمیں کافی باریکی سے چھان بین کرنی ہوگی۔

جب اجودھیا میں پھیلی افواہوں کی جانب محل کے بھانڈ بھدرا نے رام کی توجہ مبذول کروائی تب رام نے اپنے بھائیوں کو خفیہ طور سے بلوا کر ان کو اپنے احساسات بتلائے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو بتلایا کہ لنکا میں سیتا نے اگنی پریکشا دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک پاکیزہ عورت ہے

اور دیوتاؤں نے بھی اس بات کی گواہی دی ہے۔ لیکن اجودھیا کے عوام سیتا کو بدنام کر رہے ہیں۔ ان کے کردار پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں، جس کی وجہ سے مجھے شرم سے سر جھکانا پڑ رہا ہے۔ اپنی یہ بدنامی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ دیوتاؤں اور بڑے لوگوں نے ہماری عزت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی ہے۔ عزت مجھے بھی بے حد عزیز ہے۔ اپنی بدنامی اور بے عزتی سے بچنے کے لئے اگر مجھے آپ لوگوں کو بھی چھوڑنا پڑا تو میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ مت سوچو کہ میں سیتا کو چھوڑنے کے لئے کسی پس وپیش سے کام لے رہا ہوں۔ رام نے اپنے ذہن میں سیتا کو چھوڑنے کا خیال صرف اس لئے ہی کیا تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی عزت و وقار کو محفوظ رکھے۔ سیتا کی زندگی اور اس کے مستقبل کے لئے کچھ بھی نہیں سوچا گیا۔ صرف اور صرف اپنی عزت اور شہرت کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ یہ بات صاف ہے کہ رام نے بہادری سے افواہوں کا مقابلہ نہیں کیا۔ حالانکہ ایک طاقتور راجہ ہونے کے ناطے وہ ان افواہوں کی روک تھام کر سکتے تھے۔ ایک بیوی کا شوہر ہونے کے ناطے وہ اپنی بیوی کی خوبیاں بتا سکتے تھے۔ رام ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہوتے لیکن وہ عوام کی زہریلی افواہوں کے سامنے جھک گئے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اُن ہندوؤں کی کمی نہیں ہے، جو رام کو ایک جمہوریت پسند راجہ سمجھتے ہیں لیکن یہ کہنے والے بھی کم نہیں ہیں کہ رام نہایت ہی کمزور اور بزدل راجہ تھے۔

جو بھی سچ ہو یہ ایسا منصوبہ تھا جس سے رام نے اپنی عزت و شہرت بچانے کی کوشش کی۔ لیکن سیتا کے سامنے اپنے دل کی بات نہیں رکھی۔ حالانکہ اس منصوبے کا تعلق براہِ راست سیتا کی زندگی سے تھا اس لئے سیتا کو ہر حالت میں یہ بات بتلانی ضروری تھی۔ لیکن سیتا کو پوری طرح اندھیرے میں رکھا گیا۔ اور رام نے اپنے منصوبے کو مکمل راز میں رکھا۔ سیتا کی بدقسمتی سے رام کو وہ موقع جلد ہی مل گیا جس کے وہ منتظر تھے۔

جو عورتیں حمل سے ہوتی ہیں اکثر وہ اپنی خواہشوں کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ رام اس بات کو جانتے تھے۔ ایک روز سیتا سے رام نے پوچھا کہ کیا اس کا دل بھی کسی چیز کو کھانے کے لئے چاہ رہا ہے۔ تو سیتا نے ہاں کہا تھا۔ رام نے سیتا سے پوچھا کہ اسے کون سی چیز کی خواہش ہے۔ تو سیتا نے کہا کہ وہ کسی رشی کے آشرم میں گنگا کے کنارے کچھ جڑیں اور پھل کھا کر کم سے کم ایک رات

وہاں گزارنا چاہتی ہے۔

اس بات کو سنتے ہی رام خوشی سے اچھل پڑے۔ اور سیتا سے کہا کہ اطمینان رکھو، میں کل ہی تمہیں وہاں روانہ کرنے کا انتظام کردوں گا۔ سیتا نے اس بات کو محبت کرنے والے ایک شوہر کا وعدہ سمجھ کر قبول کیا۔

رام نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے اقدام کیے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو سیتا کی سفارش کرنے سے روک دیا اور انہیں سختی سے تاکید کی کہ اگر کوئی ان کے راستے میں آئے گا تو وہ انہیں اپنا دشمن سمجھیں گے۔ انہوں نے لکشمن کو حکم دیا کہ وہ سیتا کو رتھ میں سوار کرکے جنگل کے کسی آشرم میں گنگا کے کنارے چھوڑ کر واپس آ جائے۔ لکشمن کو رام کے دل کی بات سیتا کو بتلانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُسے تذبذب میں دیکھ کر لکشمن کی مشکل حل کرنے کے لئے رام نے بتایا کہ سیتا نے خود گنگا کے کنارے کسی آشرم میں کچھ وقت گزارنے کی خواہش اس کے سامنے ظاہر کی ہے۔

یہ منصوبہ رات میں بنایا گیا۔ دوسرے روز لکشمن نے سونتا کو رتھ میں گھوڑے جوتنے کے لئے کہا۔ سونتا نے جلد ہی آ کر خبر دی کہ رتھ تیار ہے۔ تب لکشمن نے محل میں جا کر سیتا کو یاد دلایا کہ اس کی خواہش کے مطابق اور اپنے وعدہ کے مطابق رام نے اسے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ اسے جنگل میں لے جائے۔ اس نے رتھ کی طرف اشارہ کرکے کہا رتھ تیار ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہئے۔ سیتا بڑی خوشی سے اپنے شوہر رام کی شکرگزاری کرتی ہوئی رتھ میں بیٹھ گئی۔ رتھ بہت جلد خاص جگہ گنگا کے کنارے پہنچ گیا۔ سیتا لکشمن کی مدد سے گنگا کے اس پار نکل گئی۔ وہاں کنارے پر پہنچنے کے بعد لکشمن نے سیتا کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے روتے ہوئے کہا: ’’اے بے داغ رانی مجھے معاف کرنا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تجھے یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں کیونکہ تجھے گھر میں رکھنے سے عوام کو بے حد اعتراض ہے، جس سے رام بدنام ہو رہے ہیں‘‘۔

اس طرح سے سیتا تنہا ویران جنگل میں والمیکی کے آشرم میں پہنچ گئی جو نزدیک ہی واقع تھا۔ سیتا والمیکی کے ساتھ اس کے آشرم میں رہنے لگیں۔ وہاں انہوں نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا جنہیں لَو (Lav) اور کُش (Kush) کہا جانے لگا۔ یہ تینوں آشرم میں رہنے لگے۔ والمیکی نے ان لڑکوں کو

اپنا شاگرد بنا لیا اور انہیں رامائن سکھائی جسے خود اس نے لکھا تھا۔ 12 برس تک یہ بچے والمیکی کے آشرم میں رہے۔ یہ آشرم اجودھیا سے بہت دور نہیں تھا۔ جہاں رام راج کر رہے تھے۔ ان بارہ برسوں میں کبھی بھی اس مثالی شوہر رام نے اور شفیق باپ رام نے اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی کوئی خبر نہ لی۔ سیتا کیسی ہے، زندہ ہے یا مرگئی۔ سیتا کا کیا ہوا؟ رام نے کبھی اس بارے میں جاننا نہ چاہا۔ بارہ برس کے بعد رام کی سیتا سے اچانک ملاقات ہوگئی۔

رام نے ایک یگیہ کا اہتمام کیا۔ جس کے لئے دعوت نامے تمام رشیوں کو روانہ کیے گئے۔ اور ان سے شرکت کی درخواست کی گئی، لیکن اجودھیا سے قریب والمیکی کا آشرم ہونے کے باوجود بھی ان کو دعوت نامہ نہیں دیا گیا۔ حقیقت کیا تھی؟ اس سے رام ہی اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے باوجود بھی والمیکی خود بغیر دعوت نامے کے اس یگیہ میں شرکت کے لئے آئے اور اپنے ہمراہ سیتا کے دونوں لڑکوں کو ساتھ لائے۔ اور انہیں اپنا شاگرد کہہ کر متعارف کروایا۔ جب یگیہ جاری تھا، سیتا کے دونوں لڑکوں نے خوبصورتی سے رامائن گائی۔ رام اور اس کے درباریوں کے سامنے یہ رامائن گا کر سنائی تو رام بہت خوش ہوئے۔ ان بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر انہیں پتہ چلا کہ یہ دونوں بچے سیتا کے ہیں تو انہوں نے بچوں کو اپنے قریب بلوایا۔ یہ معصوم بچے جو اپنے ماں باپ کے تعلقات سے لاعلم تھے۔ رام نے والمیکی سے کہا کہ اگر سیتا پاکیزہ ہے تو اسے دربار میں خود ہی حاضر ہوکر اور قسم کھا کر اپنی بدنامی کو دور کرنا چاہئے جس طرح اس نے لنکا میں اپنی پاکیزگی کا ثبوت دیا تھا۔

والمیکی سیتا کو دربار میں لے کر آئے اور جب رام اور سیتا آمنے سامنے ہوئے تو والمیکی نے کہا:
''اے دشرتھ کے بیٹے! یہ سیتا ہے! جسے تم نے لوگوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں پر تنہا ویران جنگل میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا اور اگر تیری اجازت ہے تو اب بھی سیتا اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ تیرے دونوں جڑواں لڑکے ہیں جنہیں میں نے اپنے آشرم میں پالا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' رام نے کہا ''سیتا پاک ہے اور یہ میرے ہی لڑکے ہیں۔ لنکا میں سیتا نے اپنی پاکیزگی کو ثابت کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے اسے قبول کر کے لنکا سے اجودھیا لے آیا۔ لیکن عوام

کے دلوں میں ابھی تک شک و شبہ ہے۔ اس لئے سیتا کو چاہئے کہ پھر سے اگنی پریکشا دے تاکہ یہ تمام رشی بھی اس بات کی گواہی دیں''۔ اپنی آنکھیں نیچے کیے، دونوں ہاتھ جوڑے سیتا سامنے آئی اور اس نے کہا: ''میں نے من سے ہمیشہ اپنے شوہر رام کو چاہا ہے۔ اور میرے ذہن میں ہمیشہ اس کی ہی تصویر رہی ہے۔ میں نے کبھی کسی دوسرے آدمی کو نہیں چاہا ہے۔ اے دھرتی ماتا کھل جا تاکہ میں تجھ میں سما جاؤں۔ رام ہمیشہ میرے من میں تھے۔ لفظوں میں اب بھی کس طرح بتلاؤں۔ اے دھرتی ماتا کھل جا اور مجھے اپنے اندر سما لے''۔ اسی وقت اس کے سر پر سوَرگ سے پھول برسے اور دیکھنے والے ہکا بکا رہ دیکھتے رہے کہ اچانک دھرتی کھل گئی اور سیتا سونے کے ایک تخت پر بیٹھ کر دھرتی میں سما گئی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ سیتا نے مرنا پسند کیا، لیکن واپس رام کے پاس جانا پسند نہیں کیا۔ یقیناً اس کی وجہ رام کا برتاؤ تھا۔ اس طرح سے سیتا کی زندگی کا یہ ایک المیہ ہے۔

اب میں آپ کو رام بہ حیثیت راجہ کے بارے میں بتلاؤں گا۔

عام طور سے رام ایک مثالی راجہ تصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ بات حقیقت پر مبنی ہے؟ درحقیقت رام نے کبھی راج پاٹ کیا ہی نہیں۔ والمیکی لکھتے ہیں کہ راج پاٹ کا تمام انتظام بھرت کرتا تھا۔ رام نے اپنے آپ کو رعایا، راج پاٹ کی پریشانیوں سے اور حکومت کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رکھا۔ والمیکی نے رام کے شب و روز کا باریکی سے مطالعہ کیا ہے۔ والمیکی لکھتے ہیں کہ رام نے اپنی روزانہ زندگی کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ دوپہر سے پہلے کا وقت اور دوپہر کے بعد کا وقت۔ صبح سے دوپہر تک وہ مذہبی رسموں کو ادا کرتے تھے۔ اور پوجا پاٹ میں مصروف رہتے تھے۔ دوپہر میں وہ کبھی درباریوں کے ساتھ رہتے تو کبھی تخلیہ میں۔ جب وہ تخلیہ سے بیزار ہو جاتے تو پھر درباریوں کے ساتھ وقت گزارتے۔ والمیکی نے اس بات کو تفصیل سے لکھا ہے کہ

**نوٹ:**

| | | | |
|---|---|---|---|
| اترکھنڈ | 42 | شلوک | 27 |
| | 43 | | 1 |
| | 44 | | 1 |

رام کی آرام گاہ اشوک ون میں بنائی گئی تھی۔ وہاں رام کھانا کھایا کرتے تھے۔ والمیکی لکھتے ہیں کہ اکثر ان کے دستر خوان پر ہرن کا مزے دار گوشت ہوا کرتا تھا۔ وہ خود بھی شکاری تھے اور بن باس میں بھی شکار پر ہی گزارا کیا تھا۔ ان کے زنان خانے میں اپسرائیں بھی تھیں، آرگا (Urga) اور (Kinnari) بہترین گانے والی خوبصورت رقاصائیں تھیں ان کے علاوہ دیش بدیش کی خوبصورت عورتیں بھی تھیں۔ والمیکی نے رام کو ''عورتوں کا شوقین راج کمار'' کہا ہے۔

دوسرے راجاؤں کی طرح رام کو راج پاٹ سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔تاہم وہ بھی دوسرے راجاؤں کی طرح رعایا کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو سن کر اسے دور کرتے اور انصاف دلوایا کرتے تھے۔ والمیکی نے اس تعلق سے صرف ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ والمیکی لکھتے ہیں کہ رام کے دور میں ان کے راج میں کمسن بچے نہیں مرتے تھے لیکن ایسا ہوا کہ ایک برہمن کا بیٹا کمسنی میں ہی مر گیا۔ اس کا غم زدہ باپ اس کی لاش لیے رام کے محل کے دروازے پر پہنچا اور لاش کو وہاں رکھ کر چیخنے چلانے لگا۔ اس نے رام کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ وہ دھمکیاں دینے لگا اور کہنے لگا کہ رام خود گنہ گار ہوگا، اگر وہ اس موت کے قصوروار کو سزا نہ دے۔ پھر اس برہمن نے بھوک ہڑتال کر کے مرنے کی ٹھانی تاوقتیکہ رام اس کے مردہ بچے کو زندہ نہ کر دے۔ اس معاملے کو سلجھانے کے لئے رام نے اپنے دربار کے آٹھ قابل رشیوں اور ''نارد'' کو دربار میں بلوایا۔ نارد نے رام سے کہا کہ اس کے رام راج میں کوئی شودر تپسیا کر رہا ہے جو مقدس قانون اور دھرم کے خلاف ہے۔ کیونکہ تپسیا کرنا صرف برہمن کا کام ہے جب کہ شودر کا فرض ہے کہ وہ صرف برہمن کی خدمت کرے۔

نارد کی اس بات سے رام پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ دھرم کے خلاف کسی شودر نے یہ پاپ کیا ہے جس کی وجہ سے اس برہمن کے لڑکے کی کمسنی میں موت ہوئی ہے۔ اس لئے رام اپنی ہوائی گاڑی (Aerial Car) پر سوار ہو کر گنہگار کی تلاش میں جنگل جنگل گھومنے لگے۔ آخر جنوب کی جانب ایک گھنے جنگل میں انہیں ایک آدمی تپسیا میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ اس آدمی کے قریب گئے اور اس کا سر قلم کر دیا اور اُسی لمحے برہمن کا مردہ لڑکا اجودھیا میں پھر سے سانس لینے لگا۔ اس گھنے جنگل میں تمام دیوتاؤں نے خوش ہو کر رام پر پھول برسائے۔ کیونکہ اُنہوں نے ایک شودر کو جو اپنی تپسیا سے

جنت میں جانا چاہتا تھا۔ جہاں جانا اس کا حق نہیں تھا وہاں آنے سے روک دیا ہے۔ بعد میں خوش خوشی تمام دیوتا وہاں سے چلے گئے۔

رام یہاں سے ایک آشرم میں جو رشی اگیاسا کا تھا وہاں پہنچے، اور اُس رشی نے بھی شودر کو مارنے پر ان کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ انہوں نے بڑا ہی قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے اور خوش ہوکر رام کو تحفے میں ہاتھوں کے مقدس کڑے دیے۔ وہاں سے رام واپس اپنے پائے تخت اجودھیا واپس آ گئے۔ تو بقول ڈاکٹر امبیڈکر: ایسے تھے رام!

ترجمہ: ڈاکٹر مجاہد علی

(افکار ملی، نئی دہلی، بابری مسجد نمبر)

*Edited Version*



# رام ایک ''افسانوی'' کردار؟

ثناء اللہ علیگ

ہندوستانی ادب میں رام کی کتھا صدیوں سے مختلف شکلوں میں اپنا ایک اہم مقام پیدا کر چکی ہے۔ اس کی ابتدائی صورت اور بعد کے اضافوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کتھا کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ لیکن والمیکی نے اپنی رامائن میں کہانی کا تانا بانا ایسا بُنا کہ رام، سیتا، لو اور کش حقیقی کرداروں کی طرح زندہ شخصیت بن گئے اور ہندوستانی تہذیب میں رام جی کی شخصیت بھگوان کا درجہ پا گئی۔ اور یہ کہانی رچ بس کر حقیقت کی طرح مانی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس فرضی کتھا (Myth) کی سچائی جاننے کے لئے پچھلے دو سو سالوں سے ہندوستانی ماہرین زبان و ادب کے ساتھ یوروپی اور امریکی مستشرقین کی ایک بڑی ٹیم بھی سرگرداں رہی ہے۔ ان سب نے گہرے مطالعے اور بحث و تمحیص کے بعد اپنا اپنا نتیجہ نکالا ہے، لیکن ان نتائج میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

کچھ ماہرین رامائن کے اصل متن کو تاریخی مانتے ہیں، لیکن دوسری تفصیلات کو غیر ملکی یا فرضی بتاتے ہیں۔ کچھ لوگ مکمل کہانی کو تاریخی مانتے ہیں۔ وہیں دوسرے لوگ پوری کہانی کو خیالی و تصوراتی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر یعقوبی صرف اجودھیا کانڈ کو تاریخی تسلیم کرتے ہیں۔

(H. Jacobi: Das Ramayana)

ڈاکٹر اے. ویبر پوری کہانی کو آریہ تہذیب کے ارتقاء کا استعارہ (Allegory) تصور کرتے ہیں اور راون سے جنگ والے حصے کو یونانی ادب کے مشہور شاعر ہومر (1000 قبل مسیح) کے ادب سے مستعار مانتے ہیں۔

(A. Weber: Veber das Ramayana, History of Indian Literature)

جے. ٹی. وہیلر کا کہنا ہے کہ رامائن برہمن اور بودھ دھرم کے ٹکراؤ کا مظہر ہے۔

(J.T. Wheeler: History of India)

دنیش چندر سین بھی یقین کرتے ہیں کہ بالمیکی نے بودھ کے بھکشوپن کے ردعمل کے نتیجہ میں برہمن گھریلو زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے مقصد سے رامائن لکھی تھی۔

(D.C. Sen: The Bengali Ramayanas)

مسٹر ملادی وینکٹ رتنم، سابق وائس چانسلر، گورنمنٹ ٹریننگ کالج، راج مہندری (دکن) اگر چہ رامائن کی کہانی کو تاریخی مانتے ہیں مگر ہندی الاصل تسلیم نہیں کرتے۔ان کا یقین ہے کہ یہ کہانی حقیقت میں ملک مصر کے بادشاہ ریمسس ثانی (رعمسس دوم 1292 تا 1225 قبل مسیح) کی تاریخ ہے۔ (M. Venkataratnam: Rama, the Greatest Pharaoh of Egypt).

یہ وہی رعمسس بادشاہ ہے جو فرعون (Pharaoh) کے لقب سے مشہور ہے۔اور جس نے قوم بنی اسرائیل پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گود لیا تھا۔وینکٹ رتنم صاحب کا استدلال لسانیات کی بنیاد پر ہے۔ان کا کہنا ہے کہ رام لفظ ہندی الاصل نہیں بلکہ سامی الاصل ہے۔ملک شام کے ایک بادشاہ کا بھی یہ نام تھا۔مصر اور شام کے علاقے میں سورج دیوتا کی پوجا کا قدیم زمانے میں رواج تھا۔قرآن مجید سے بھی یہ ثابت ہے جیسا کہ سورہ انعام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مکالمے سے واضح ہے۔اب رام یا ریمسس نام کا تجزیہ کریں۔''رع'' یا ''رے'' کا معنیٰ سامی زبان میں سورج ہے، جس کا باپ آسمان اور ماں دھرتی ہے۔ریمسس یا رعمسس کے معنی ہیں کہ رع نے اسے جنم دیا۔(مس مادہ کا لغوی معنی ہے جنم لینا، پیدا ہونا)۔ یعنی سورج سے یا سورج کے طفیل سے پیدا ہوا (سورج بنشی) رعمسس مصر کے عظیم بادشاہوں میں سے ایک ہے۔اپنے دورِ حکومت کے نصف اول میں وہ حطّی قوم پر حملہ آور ہوا۔اس کی پہلی فتح کادیسا (شام) میں ہوئی تھی۔لیکن اس کے بعد بھی 1278 ق.م تک جنگ ہوتی رہی۔آخر کار رعمسس کو فتح ہوئی۔ اور اس نے حطّی قوم کی شہزادی سے شادی کی اور اس کے بعد عظیم سلطنت پر فرماں روائی کرتا رہا۔ رامائن کا دوسرا اہم کردار سیتا جی کا ہے۔سیتا بھی ایک بہت ہی مقدس مصری نام ہے۔وہاں اب بھی دولت مند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے واسطے اس کو لگایا جاتا ہے۔قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے۔وینکٹ رتنم نے رامائن کے دیگر کرداروں کی تطبیق بھی مصری ناموں سے کی ہے۔

(دیکھئے ایم۔وینکٹ رتنم، رام دی گریٹیسٹ فاراؤ آف ایجپٹ، راج مہندری 1934ء)

ہندوستان کے مشہور عالم زبان و ادب ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کا کہنا ہے کہ'' رام جی کی تاریخی حیثیت قدیم ہندوستان کے کسی بھی سنجیدہ طالب علم کو اپیل نہیں کرتی۔''

(Journal Asiatic Society of Bengal Vol. 16 (1950) page 73-87).

ہندوستان کے قدیم ادب میں تلاش کرنے پر 'رام' نام کی چار شخصیت قدیم ویدک لٹریچر میں ملتی ہیں۔مگر وہ راماین کے رام سے بالکل مختلف ہیں۔ فادر کامل بلکے نے ویدک لٹریچر میں راماین کی کہانی کی موجودگی سے صاف انکار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''ویدک زمانہ میں رامائن لکھی گئی تھی یا رام کی شخصیت سے متعلق داستانیں مشہور ہو چکی تھیں، اس کا اشارہ ویدک لٹریچر میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ کئی تاریخی شخصیات کے نام راماین کے کردارں کے ناموں سے ملتے ہیں۔ اس سے اتنا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ نام قدیم زمانے میں بھی مستعمل تھا۔''

(رام کتھا، صفحہ 19، از: کامل بلکے، چوتھا ایڈیشن)

رامائن کی کتھا بودھوں کے زمانے میں (400 ق.م) مشہور ہونی شروع ہوئی۔ مگر اس کو قصہ گو زبانی سناتے تھے۔ بالآخر بودھ مذہب کی کتابوں میں وہ شامل کر لی گئی اور مہاتما بدھ کی طرف منسوب کر دی گئی کہ انہوں نے یہ کہانی سنائی۔ کہانی اس طرح ہے۔

''دشرتھ نام کے مہاراجا بنارس میں مذہبی اصولوں کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ ان کی بڑی بیوی سے تین بچے ہوئے۔ دولڑکے رام پنڈت اور لکھمن ، اور ایک لڑکی سیتا دیوی۔ بڑی رانی کے مرنے کے بعد دوسری رانی کو راجا نے اول رانی کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس رانی سے ایک لڑکا بھرت کمار پیدا ہوا۔ راجا نے اسی موقع پر اس رانی کو ایک ور (وعدہ، عہد) دیا۔ جب بھرت سات سال کے ہوئے، رانی نے اپنے بیٹے کے لئے راج مانگا۔ راجا نے انکار کر دیا۔ لیکن جب رانی بار بار اس کے لئے ضد اور اصرار کرنے لگی تو راجا نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا: ''یہاں رہنے سے تم دونوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ کسی دوسرے راج یا جنگل میں جا کر رہو، اور میرے مرنے کے بعد ہی تم راج کرنے کے حقدار ہو گے۔ تب راجا نے جیوتشیوں کو بلا کر ان سے اپنی موت کے بارے میں دریافت کیا۔ جواب ملا کہ بارہ برس کے بعد وہ اس سنسار کو چھوڑیں گے۔ تب راجا نے کہا: ''اے بیٹے، بارہ برس کے بعد آ کر گدی حاصل کرنا، باپ سے رخصت ہو کر دونوں بھائی چلنے ہی والے تھے کہ سیتا دیوی بھی باپ سے اجازت لے کر ساتھ ہولیں۔ تینوں کے ساتھ اور بہت سے دوسرے لوگ بھی ہو لیے لیکن ان لوگوں کو رام نے واپس لوٹا دیا اور تینوں ہمالیہ پہنچ گئے اور وہاں جھونپڑی بنا کر رہنے لگے۔

نو برس کے بعد راجا دشرتھ اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں چل بسے۔ رانی بھرت کو راجہ بنانے

میں کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ حکومت کے منتری اور خود بھرت بھی اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ تب بھرت چتورنگی سینا (فوج کے چاروں کمان) لے کر رام کو واپس لانے کے مقصد سے نکل پڑے۔ رام کی جھونپڑی سے کچھ دور فوج کو رکھ کر بھرت اپنے کچھ منتریوں کے ساتھ رام کے پاس جاتے ہیں۔ اس وقت رام اکیلے ہیں، بھرت ان کو والد کے انتقال کی خبر سنا کر رونے لگتے ہیں۔ رام پنڈت نہ تو غم کرتے ہیں اور نہ روتے ہیں۔

شام کو لکھن اور سیتا لوٹتے ہیں۔ والد کی وفات کا سن کر دونوں بہت زیادہ غم کا اظہار کرتے ہیں۔ اس پر رام پنڈت ان کو دلاسہ دیتے اور دھرم کی تعلیم سناتے ہیں جس سے سبھوں کا غم دور ہو جاتا ہے۔ بعد میں بھرت کے بہت اصرار کرنے پر بھی رام پنڈت گھر لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کہتے ہیں: ''میرے باپ نے مجھے بارہ سال کی مدت کے بعد حکومت لینے کا حکم دیا ہے۔ اب لوٹ کر میں ان کی حکم عدولی نہیں کروں گا۔ میں اب تین برس کے بعد لوٹوں گا۔'' جب بھرت بھی راج کے لیے تیار نہ ہوئے تو رام پنڈت اپنے تنکوں کے بنے کھڑاؤں دے کر کہتے ہیں: ''میرے آنے تک یہ حکومت کریں گے''۔ کھڑاؤں کو لے کر بھرت، لکھن اور سیتا دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ بنارس لوٹتے ہیں۔ کھڑاؤں کو تخت پر رکھا جاتا ہے اور منتری حکومت کی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔

تین برس گزر جانے پر رام پنڈت گھر لوٹ کر آتے ہیں۔ پھر سولہ ہزار (16000) برس تک مذہبی اصولوں کے مطابق حکومت کر کے سورگ سدھارتے ہیں۔''

''دشرتھ جاتک'' کے اس خلاصے میں سیتا ہرن اور راون سے لڑائی کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ والا حصہ بعد میں جوڑا گیا اور ہومر کی نقل کر کے کہانی کو طول دیا گیا ہے۔ لیکن دنیش چندر سین مانتے ہیں کہ بالمیکی نے دشرتھ، راون اور ہنومان جی کے تین بالکل الگ الگ قصوں کو ایک ساتھ ملا کر رام کی کہانی پیش کی ہے۔

بودھ دھرم میں ایک دوسری ہی کہانی ہے اس کے مطابق رام اپنی سوتیلی ماں کے سبب باپ کے حکم سے جنگل نہیں جاتے بلکہ ان کا ایک ماموں، جو بڑا ہی حریص و ظالم راجا تھا، ان پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ماما کے حملے کی تیاریاں سن کر اپنی مرضی سے اپنا راج چھوڑ کر جنگل چلے جاتے ہیں۔ ماما ان کے راج پر قبضہ کر کے ظلم ڈھاتا ہے۔ پھر ماما کے مرنے کے بعد وہ جنگل سے واپس

آ کر حکومت سنبھالتے ہیں۔ جنگل میں وہ پھل توڑنے گئے تھے کہ ادھر رانی کو سمندر میں رہنے والے ایک ناگ نے اپنا روپ بدل کر چرا لیا۔ راستہ میں وہ ایک تنگ گھاٹی سے گزرا۔ پہاڑی پر رہنے والا ایک بڑا پرندہ اپنے پر پھیلا کر ناگ کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناگ نے اس پرندے کو مارا اور اس کا دایاں بازو توڑ ڈالا۔ اور سمندر کے ایک جزیرے میں اپنے مستقر کو لوٹ گیا۔ راجا جب پھل توڑ کر لوٹا تو اپنی بیوی کو نہ پایا۔ وہ جنگل میں ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگا۔ وہیں ہنومان جی سے ملاقات ہوئی۔ ہنومان جی کے چچا نے ان کا راج چھین لیا تھا۔ اس طرح راجا اور ہنومان جی میں باہمی تعاون کا معاہدہ ہوا۔ راجا نے ہنومان جی کے چچا سے لڑ کر ان کا راج دلایا اور ہنومان جی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ راجا کی بیوی کا پتہ لگایا اور ناگ سے لڑ کر رانی کو واپس لایا۔ رانی کی عصمت کا امتحان ہوا۔ اس طرح گھر واپس آ کر مذہبی اصولوں پر انہوں نے حکومت کی۔

یہ کہانی ''اناملکم جاتکم'' میں ہے۔ اس میں راجا اور رانی کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ انہیں ایک بودھ سادھو کہا گیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ والمیکی کے رامائن سے اس قصے میں مدد لی گئی ہوگی۔

ایک چینی بودھ گرنتھ ''دشرتھ کتھانم'' ہے۔ اس میں سیتا جی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کے مطابق پہلے زمانے میں جب لوگوں کی عمریں دس دس ہزار برس کی ہوتی تھیں، جمبودیپ (جزیرہ) میں دشرتھ نام کا ایک راجا راج کرتا تھا۔ اس کی بڑی بیوی سے رام نام کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دوسری رانی کو بھی ایک لڑکا ہوا جس کا نام لومن (لچھمن) تھا۔ رام میں قدرتی طاقت تھی۔ تیسری رانی سے بھرت اور چوتھی سے شترگھن پیدا ہوئے۔ تیسری رانی سے راجا کو بے پناہ محبت تھی۔ ایک دن راجا نے کہا: ''میں تمہاری خواہش پر اپنا سارا دھن اور راج قربان کر سکتا ہوں''۔ رانی نے جواب دیا: ''مجھے اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ کچھ دنوں بعد راجا بیمار پڑے۔ انہوں نے رام کو حکومت سونپ دی۔ رام کو راجا کے عہدے پر دیکھ کر تیسری رانی نے حسد سے مغلوب ہو کر راجا سے کہا: ''میں اب آپ کے وعدہ کی وفا چاہتی ہوں اور وہ اس طرح کہ رام گدی سے اُتار دیئے جائیں اور میرے بیٹے کو راجا بنایا جائے، یہی میری خواہش ہے۔'' یہ سن کر راجا کو بہت دکھ ہوا۔ راج دھرم کے مطابق وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت لومن نے رام سے اپنی طاقت اور ہمت دکھانے کی درخواست کی۔ رام نے اپنے باپ کے احترام میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تب دشرتھ نے دونوں بیٹوں کو جنگل جانے اور بارہ سال بعد واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ بھرت اس وقت دوسرے ملک،

ہیں تھے۔ دشرتھ کی موت کے بعد بھرت لوٹے۔ ان کو اپنی ماں کی حرکتوں سے نفرت ہوگئی۔ وہ فوج کے ساتھ اس پہاڑ پر گئے جہاں رام رہتے تھے۔ بھرت نے رام سے راجا بننے اور راجدھانی لوٹنے کی درخواست کی۔ رام نے باپ کے حکم کو توڑنا قبول نہ کیا۔ تب بھرت نے رام کی کھڑاؤں حاصل کی اور واپس لوٹ آئے۔ کھڑاؤں کو راج گدی پر رکھ کر بھرت حکومت کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ روزانہ وہ ان کھڑاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اس سے اجازت لیتے تھے۔ دھیرے دھیرے جنگل میں رہنے کی مدت پوری ہوگئی۔ رام اپنے دیش کو لوٹ آئے۔ بھرت نے رام سے حکومت سنبھالنے کی درخواست کی۔ پہلے رام نے انکار کیا لیکن بھرت کے بہت ضد کرنے پر انہوں نے قبول کرلیا۔ سب لوگ اپنے اپنے دھرم پر چلنے لگے اور ہر طرف خوشی اور چین کا ماحول ہوگیا۔

بودھوں کے یہاں مختلف زمانوں میں یہ کہانیاں رواج پائیں۔ ان میں سب سے قدیم دشرتھ جاتک کی کہانی ہے۔ دھیرے دھیرے بودھوں کی دلچسپی رام کی کہانی سے ختم ہوگئی۔ بودھوں کے زوال کے بعد والمیکی کی راماین تیار ہوئی۔ اس کو صدیوں تک برہمنی رنگ میں ڈھالا گیا۔ یہاں تک کہ اصل والمیک راماین گم ہوگئی۔ اس کے مختلف نسخوں کے اختلاف اور کہانی میں پھیلاؤ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف نظریات و خیالات کا اس پر اثر پڑا ہے۔ شیو، شاکت، ویشنو، جین، واسو دیو، کرشن جی کی کتھا اور اوتار کے اثرات اس پر نمایاں ہیں اس کہانی کی مقبولیت کے سبب مختلف زبانوں اور مختلف علاقائی زبانوں میں بہت سی رامائنیں لکھی گئیں۔ شعرا و مصنفین نے اس میں جزوی طور پر نئے نئے ایجادات و خیالات شامل کئے۔ یہاں تک کہ والمیک راماین کے مختلف نسخوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ پاس پڑوس کے ملکوں میں بھی یہ کہانی پہنچی اور وہاں بھی مقبول ہوئی۔ وہاں کے شعرا و ادباء نے بھی کئی رامائنیں تیار کر دیں۔ تبت، کشمیر، جاوا، ہند چین، سیام، برما (میانمار)، کمبوڈیا، سنہالی وغیرہ ملکوں میں کئی رامائنیں ملتی ہیں۔ مگر ہر ملک کی رامائن رام جی کو اپنے ہی ملک کا باشندہ اور اپنی ہی کہانی قرار دیتی ہے۔ تلسی کی رام چرتر مانس اپنی والمیکی رامائن کے متن پر انحصار کرتی ہے۔

ہندوستان کے سنسکرت ادب میں مہابھارت، ہیر ونش پران، اسکند پران، پدم پران، بھاگوت پران، وشنو پران وغیرہ مذہبی کتابوں کے علاوہ خالص ادبی کتابوں میں رگھو ونش، راون، بھٹ کادیہ، مہاویر چرت، اتر رام چرت، جانکی ہرن، کند مالا، انرگھ راگھو، بال راماین، مہاناٹک وغیرہ میں

رام کی کہانی کو مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ رام جی کی بھکتی شروع ہونے پر سنسکرت میں ادھیاتم راماین، اوبھت راماین، آنند راماین، سوسنگرہ راماین جیسے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

تمل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، اسمیہ، بنگالی، اڑیہ، ہندی، مراٹھی وغیرہ علاقائی زبانوں میں بھی بہت سی رامائنیں لکھی گئی ہیں۔ اس سے اس دھارمک کتھا کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جین دھرم میں بھی رام جی کی کہانی ہے۔ پراکرت، سنسکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں بہت سے مصنفوں نے اس کہانی کو اپنے اپنے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ان میں بہت سے اختلافات کے باوجود بڑی حد تک والمیک رامائن کی کہانی کا چربہ اتارا گیا ہے۔ رام، لکشمن اور راون جین دھرم کے تین مہاپرش مانے گئے ہیں۔ یہاں رام کے ساتھ ان کا دوسرا نام پدم بھی ہے۔ اس کے مطابق رام جی ایک جین سادھو ہیں۔ وہ جین مندروں کی مرمت کرواتے اور جانوروں کی قربانی پر روک لگاتے ہیں۔ رام جی کی آٹھ ہزار اور لکشمن کی سولہ ہزار بیویوں کا ذکر ہے۔ یہاں لکشمن ہی راون کو مارتے ہیں اور اس گناہ کے سبب نرک (دوزخ) میں جاتے ہیں۔ اب پھر اگلے جنم میں ان کو مکتی ملے گی۔ لکشمن کے مرنے کے بعد رام دنیا سے منہ موڑ کر سنیاس لیتے ہیں۔ پانچ سو راجاؤں اور ایک سو اسّی (180) بیٹوں اور دیگر بہت سے لوگوں کے ساتھ جنگل میں سادھنا کرنے جاتے ہیں۔ 395 سال گزرنے پر رام کو کیول گیان حاصل ہوا۔ سیتا جی بھی بہت سی رانیوں کے ساتھ سادھنا کرتی ہیں اور آخر میں سب کو موکش (نجات) مل جاتا ہے۔ یہ بھی بیان ہوا کہ رام جی نے سترہ ہزار سال سادھنا کر کے نروان حاصل کیا۔ جنگل جانے سے قبل لکشمن کے بیٹے پرتھوی چند کو راج گدی دی گئی اور سیتا جی کے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد بنایا گیا۔

والمیک رامائن کے وجود میں آنے کے بعد سے رام جی کی کہانی کو ادب میں اونچا مقام دیا گیا۔ ادب میں اس کی مقبولیت کے سبب ہی اس کو مکمل کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ اور ہر گروہ نے اسے اپنے آدرش کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ رائے کرشن داس رامائن کے الحاقات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ والمیک رامائن میں ابتداء میں تین ہزار اشلوک تھے۔ پھر اس میں بہت سے اضافے ہوئے اور اشلوکوں کی تعداد چھ ہزار ہوگئی۔ اس وقت تک اس میں اول باب ''بال کانڈ'' اور آخری باب ''اتر کانڈ'' شامل نہیں ہوا تھا۔ پھر اس کو مہا کاویہ بنانے کے لیے اس میں اضافے ہوئے اور مذکورہ دونوں ابواب بھی داخل ہو گئے۔ اب اس میں اشلوکوں کی تعداد چوبیس

ہزار ہوگئی۔ یہ مطالعہ اور درجہ بندی راماین کے ارتقاء کے مراحل پر مبنی ہے۔ پھر بھی والمیک کی لکھی ہوئی کتاب میں اشلوکوں کی تعداد متعین کرنا ممکن ہے۔

فادر کامل بلکے کے مطابق بالمیک راماین کی کہانی تین منزلوں کو پار کر کے موجودہ شکل میں آئی ہے۔ والمیک راماین ایک سادہ اور مختصر شکل میں رہی ہوگی۔ اس کا کوئی مستند نسخہ موجود نہیں۔ اس میں اجودھیا کانڈ سے لے کر یدھ کانڈ تک کی کہانی تھی۔ اس میں بہت سے خلا تھے۔ رام جی کون تھے؟ سیتا جی کون تھیں؟ ان کی پیدائش اور شادی کس طرح ہوئی اور کب ہوئی؟ راون کون تھا؟ راون کے قتل کے بعد رام و سیتا جی کی زندگی کیسے گزری؟ ان کو کتنے بچے ہوئے؟ وغیرہ سوالات فطری تھے۔ سامعین کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بالکانڈ اور اتر کانڈ کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ راماین (یعنی رام کا سفر) اب بدل کر رام چرت یعنی رام کی حالاتِ زندگی بن گئی۔ اس وقت تک رام صرف ایک آدرش چھتری تھے۔ یہ ان کی پہلی منزل تھی۔

تیسری صدی قبل مسیح سے کرشن جی کو وشنو کا اوتار مانا جانے لگا تھا۔ اس سے اوتار واد کے تصور کی ہمت افزائی ہوئی۔ پہلی صدی قبل مسیح میں کرشن جی کی طرح رام جی بھی وشنو کے اوتار کی شکل میں قبول کر لیے گئے۔ اس کے نتیجے میں راماین میں اوتار سے متعلق باتوں کا اضافہ کر دیا گیا اُس پر برہمنوں کا اثر اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ اب رام صرف آدرش چھتری نہیں بلکہ وشنو کے اوتار مانے گئے۔ بودھ اور جین ادب کو چھوڑ کر ہر جگہ رام کی مقبولیت اسی شکل میں ہوئی ہے۔ یہ راماین کے ارتقاء کی دوسری منزل تھی۔

اس منزل میں عوام کے مذہبی تصورات میں نہ تو رام جی کے لئے کوئی مخصوص مقام تھا اور نہ رام جی کی بھگتی کی ابتدا ہوئی تھی۔ رام کی طرح ان کے سب بھائی بھی وشنو کے اوتار مانے جاتے تھے۔ مگر رام کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس وقت کے مذہبی لٹریچر میں رام کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔ لیکن ادبی لٹریچر میں اسے بڑی وسعت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ صدیوں تک رام کی کتھا صرف ادبی حوالے سے مقبول رہی۔ رام بھگتی سے پہلے رام کی کہانی کا یہ ادبی روپ ہندوستان کے باہر پڑوسی ملکوں میں پھیل گیا اور اس پر بعد کے رام بھگتی کا اثر نہیں پڑا۔ اس لیے غیر ممالک میں رام بھگتی کا فقدان ہے۔

اس کے بعد بارہویں صدی میں رائج سمپر دائے کے تحت رام بھگتی اور پوجا کی کئی کتابیں لکھی

گئیں۔ چودھویں صدی سے ہندوستان میں رام جی کو مقدس مقام حاصل ہوا۔ رام جی وشنو کے اوتار کے علاوہ خالق کائنات (پر برہم) کے پورن اوتار مانے جانے لگے۔ یہ رام کی کتھا کے ارتقاء کی تیسری منزل ہے۔

مختلف راماین میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ نمونے کے طور پر چند کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ دشرتھ کے خاندان کا شجرہ دیا ہوا ہے۔ اس میں کافی اختلاف ہے۔ رام کو دشرتھ کا بیٹا، دشرتھ کا پوتا، اور سہسر باہو کا بیٹا، پرمیشور کا بیٹا، وشنو کے سیناپتی (کمانڈر) کا بیٹا بتایا گیا ہے۔ دشرتھ کی بیویوں کی تعداد مختلف رامائینوں میں اس طرح ہیں: 2; 3, 4, 6, 7, 8, 350, 500, 700, 750, 16000۔ یعنی دو سے لے کر سولہ ہزار تک۔ ان کی اولاد میں کہیں صرف دو بیٹوں کا ذکر ہے، کہیں دو بیٹوں رام اور لکشمن کے ساتھ ایک بیٹی شانتا، چار بیٹوں (رام، لکشمن، بھرت وشتروگھن) کا ذکر ہے تو کہیں چھ بیٹوں کا، کہیں سیتا جی کو بھی دشرتھ کی کی بیٹی بتایا گیا ہے۔ شانتا بیٹی کے بارے میں ہے کہ اسے لوم پاد کو دان میں دیا گیا تو کہیں یہ ہے کہ راون سے اس کی شادی ہوئی۔ راون کو دشرتھ کا بھتیجا بتایا گیا ہے۔ دشرتھ کی ایک بیٹی ہیم لتا، کہیں کیکئی کے بطن سے ہے، کہیں گکو کے، تو کہیں کیکوی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ راجا دشرتھ کو کہیں بنارس، تو کہیں اجودھیا کا، تو کہیں جمبو دیپ کا راجہ بتایا گیا ہے۔

ہندو دھرم میں رام جی اور اُن کے سب بھائی وشنو کے اوتار مانے گئے ہیں۔ مگر رامائنوں میں بہت سے دوسرے دیوتاؤں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ نیچے ان کے ناموں کے سامنے وہ نام لکھے جاتے ہیں جن کے وہ اوتار مانے گئے ہیں۔

رام: وشنو، واسودیو، پر برہم، شیو، برہما، سورج، ہریہر، تری مورتی، سچد انند، جگن ناتھ وغیرہ۔

لکشمن: وشنو، شنکرشن، وشنو کے بیٹے، شیش، مہادیو، شیو، سنھدر وغیرہ۔

بھرت: وشنو، پردیومن، پانچ جنیہ، شنکھ، چکر، وشنو کی دائیں بانہہ، اننت، اندر وغیرہ۔

شتروگھن: وشنو، انرودھ، سدرشن چکر، شنکھ، وشنو کی بائیں بانہہ، اننت، گدا، برہما وغیرہ۔

اوتار ہونے کی وجہ کیا تھی اس کے لیے بھی مختلف وجوہ بتائی گئی ہیں۔ کہیں راون کا قتل کرنا تو کہیں بھگتوں کو بھوساگر پار کرانا، کہیں سکن روپ دکھانا بتایا گیا ہے۔ کہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ وشنو نے کسی سے خوش ہو کر اس کو وردان دیا کہ ہم تمہارے بیٹے کی شکل میں پیدا ہوں گے یا فلاں کام

کے لیے آئیں گے اور اسی وردان کو پورا کرنے کے لیے وہ اوتار لیتے ہیں۔ کہیں کسی رشی یا برہمن نے ناراض ہو کر شاپ (شراپ، لعنت) یا بد دعا دی کہ تم انسان بن کر دنیا میں مصیبتیں اُٹھاؤ گے۔ اسی سزا کے طور پر دیوتاؤں کو آدمی کے روپ میں جنم لینا پڑا۔

رامائن کی دوسری اہم شخصیت سیتا جی ہیں۔ ان کو جنک کی بیٹی، دشرتھ کی بیٹی، راون کی بیٹی کے علاوہ بھاٹ کی بیٹی، کسان کی بیٹی، دھرتی سے پیدا ہونے والی، مہل کی دیہہ سے پیدا، مینکا کی بیٹی، مندودری کی بیٹی ہی نہیں بتایا گیا بلکہ ان کا جنم کنول کے پھول سے، سیتا پھل سے، خون سے، آگ سے اور درخت سے بتایا گیا ہے۔

رام اور سیتا کی شادی کے سلسلے میں متضاد کہانیاں ملتی ہیں۔ کہیں کہا گیا ہے کہ رام نے راجہ جنک کی بہت خدمت کی تھی۔ خوش ہو کر راجہ نے سیتا جی سے ان کی شادی کر دی تھی۔

کہیں مختلف شرطوں کو پورا کر کے تب شادی ہوتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ وہ مختلف شرطیں اس طرح ہیں: کمان پر تانت چڑھانا، کمان کو اُٹھانا، کمان کو توڑنا، کمان پر تیر رکھ کر چلانا، ایک مخصوص نشانہ پر تیر مارنا، سات تال کے درختوں کو ایک ہی تیر سے چھیدنا، چالیس تال کے درختوں کو ایک ہی تیر سے چھیدنا وغیرہ۔ کہیں اس سے مختلف دوسرے امتحان کا ذکر ملتا ہے۔ ایک مندر میں ایک ہزار خوبصورت کنیائیں قطار میں ہیں وہ سب سیتا کی ہم شکل ہیں۔ اسی قطار میں کہیں سیتا کو کھڑی کر کے اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہونے والے سے شادی ہونے کی شرط رکھی جاتی ہے۔ کہیں یہ ذکر ملتا ہے کہ رام نے گدگدی لگا کر سیتا کو پہچان لیا تو کہیں یہ ذکر ہے کہ ناک پر پھول مار کر اسے پہچان لیا۔ کہیں یہ ذکر ہے کہ سویمبر کے موقع پر ہی شادی ہوئی تو کہیں ہے کہ سویمبر کے بعد الگ سے رام نے امتحان مکمل کیا۔ کہیں یہ ذکر ہے کہ صرف رام کی شادی ہوئی، کہیں یہ ہے کہ اسی موقع پر بھرت کی بھی سیتا کی بہن ارملا سے شادی ہوئی۔ کہیں اسی محفل میں چاروں بھائیوں کی شادی ہونے کا ذکر ہے۔ شادی شبھ مہورت (سعد وقت) پر نہ ہو یا دیوتا چاہتے تھے کہ رام جی سیتا سے جدا ہو کر تکلیف اُٹھائیں۔ اسی لیے دیوتاؤں نے سازش رچی اور چاند کو حسین رقاصہ کی صورت میں بھیج کر پوری محفل کو ناچ گانے میں اس طرح بے خود کر دیا کہ پنڈتوں کے بتائے ہوئے شبھ مہورت کا کسی کو

دھیان ہی نہ رہا اور اشُبھ مہورت میں ہی شادی ہوگئی۔ اسی لیے ان کو تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔ اسی طرح شادی کے وقت رام جی اور سیتا جی کی عمریں بھی مختلف بتائی گئی ہیں۔ رام کی تیرہ اور سیتا کی چھ، رام کی پانچ اور سیتا کی چھ، رام کی پندرہ اور سیتا کی چھ اور اگر چھ سال سے کم عمر میں شادی ہوئی تو کمان توڑنے کی شرط انہوں نے کیسے پوری کی۔ رام اور سیتا کی شادی سے قبل کے عشق اور ملاقات کا ذکر بھی کئی طرح سے مختلف رامائنوں میں ہوا ہے۔

رام جی کے جنگل جانے کے اسباب بھی مختلف رامائنوں میں یکساں نہیں بیان ہوئے ہیں۔ کہیں یہ بتایا گیا ہے کہ شنی گرہ کے برے اثرات سے بچنے کے لئے اکیلے جنگل چلے گئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سیتا جی کے اجودھیا آتے ہی اجودھیا میں نامبارک حالات پے در پے پیدا ہونے لگے۔ اس لیے سیتا جی کو بدشگون مان کر آفات سے بچنے کے لیے انہیں رام جی کے ساتھ جنگل میں بھجوا دیا گیا۔ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ رام جی نے 'تاڑکا' کو قتل کیا تھا اس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے جنگل میں جانا پڑا۔ یہ بھی ہے کہ کیکئی کی سازش کے خوف سے راجہ دشرتھ نے حفاظت کی غرض سے انہیں جنگل بھیجا۔ یہ بھی ہے کہ باپ کا قول نبھانے کے لیے خوشی سے بن باس لیا۔ کہیں یہ کہا گیا ہے کہ تپسیا کرنے کی غرض سے جنگل گئے۔ کہیں یہ بیان ہوا ہے کہ ماموں کے حملہ کے خوف سے اجودھیا چھوڑ کر جنگل چلے گئے۔ یہ بھی آیا ہے کہ سیتا جی نے سویمبر کے موقع پر دیوتاؤں سے دعا کی تھی کہ رام جی کے لیے دھنش پھول کی طرح ہلکا ہو جائے تو چودہ سال تک وہ جنگل میں رہنے کا برت پورا کریں گے اور اسی کے سبب بن باس پر گئے۔ اسی طرح کے اور بھی اسباب بیان ہوئے ہیں۔ جنگل میں کہیں رام اکیلے جاتے ہیں تو کہیں سیتا کے ساتھ تو کہیں صرف لکشمن کے ساتھ اور کہیں تینوں ایک ساتھ۔ جنگل میں رہنے کی مدت بھی غیر متعین ہے، کہیں بارہ برس، کہیں چودہ برس اور کہیں سولہ برس ہے، اس طرح کے بہت سارے تضادات رام جی کی کہانی کے اندر مصنفین نے پیدا کر دیئے ہیں۔

رام جی کی شخصیت، ان کا زمانہ، ان کی تعلیمات اور ان کے کارناموں کے بارے میں مستند روایات نہیں ملتی ہیں۔ مختلف رامائنوں کے مصنفین کے پاس رام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ کیا رہا ہے، اس بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ آج تو والمیک اور تلسی کی رامائنیں، رام کی کہانی کا ماخذ ہیں مگر ان میں بھی وقت کے ساتھ تصرف ہوا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف

مصنفین نے اپنے تخیلات اور اب تصورات کے مطابق ہی رام جی کے حالات کو دیکھا گیا ہے اور روایات کی کڑیاں نہ ملنے کے سبب اس کتھا میں متضاد باتیں شامل ہو گئی ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں مؤرخوں کو چاہئے کہ وہ ازسرِ نو رام جی پر تحقیق کریں تا کہ حقیقی صورت حال سے ہم واقف ہوسکیں۔

(افکارِ ملی، نئی دہلی، بابری مسجد نمبر)

*Edited Version*



# رام اور اجودھیا: ہندو مذہب کی کتابوں میں

از: ڈاکٹر محمد احمد (ایڈیٹر کانتی ہندی ویکلی، نئی دہلی)

''والمیکی رامائن'' رام کتھا کی سب سے پرانی کتاب مانی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''آدی رامائن'' اس سے بھی پرانا ہے جواب دستیاب نہیں ہے۔ اس کا نام مہارامائن بھی بتایا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں جو تفصیلات مروج ہیں ان کے مطابق ''آدی راماین'' کے خالق شنکر جی تھے اور وہ مفصل کتاب تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو زمانہ از خود (سوالمبھو منونتر) سے قبل ست یگ میں شنکر جی نے پاروتی کو سنایا تھا۔ ریونڈ فادر کامل بلکے نے اپنی اہم تحقیق ''رام کتھا'' میں لکھا ہے کہ ''رام، راون اور ہنومان سے متعلق متفرق بیانیہ منظوم مروج تھے اور انہیں کے باہمی انضمام سے رامائن نظموں کی تخلیق ہوئی۔

مہابھارت کے باب درون (پرو) اور باب شانتی (پرو) میں رام کتھا ہونے کی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن اس کے عصری اسباق میں کوئی چیز رام کتھا کے بطور موجود نہیں ہے۔ ویدوں میں بھی رام کتھا کے کئی کردار کے نام ملتے ہیں، لیکن یہ متفرق طور سے ہیں، اور ان میں باہم کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔ (رگ وید 4,57,6، رگ وید 6-1 وغیرہ)

فادر کامل بلکے لکھتے ہیں کہ ''رام کتھا سے متعلق بیانیہ منظوم کی حقیقی تخلیق ویدک دور کے بعد اشواک خاندان کے راجاؤں کی اولادوں (سوتوں) نے شروع کی۔ انہیں بیانیہ منظوم کی اساس پر والمیکی نے ''آدی رامائن'' لکھی۔ جوں جوں رام کتھا مشہور ہوتی چلی گئی عوام کو یہ تجسس ہونے لگا کہ رام کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟ سیتا کا تولد کس طرح ہوا؟ راون کون تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسی تجسس کو ختم کرنے کے لیے بال کانڈ اور اتر کانڈ (بعد میں) لکھے گئے اس تفصیل پر اکثر اسکالروں کا اتفاق ہے۔ انہیں دونوں کانڈوں میں ہی رام چندر جی کو وشنو کے اوتار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ دیگر کانڈوں میں انہیں ایک مہا پرش (شخصیت) کے طور پر دکھایا گیا ہے۔

---

## رام اور اجودھیا

''والمیکی رامائن'' رام کتھا کی سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب دیگر مختلف رامائنوں

کی تخلیق کی اساس ہے۔ ''والمیکی رامائن'' میں اجودھیا کو رام کی جائے پیدائش بتایا گیا ہے۔ لیکن اجودھیا کہاں ہے؟ اس سلسلے میں والمیکی رامائن میں ہے ادھیر دھ یوجن گتواسرتھواد کھشن تٹے......

(بال کانڈ:12-11-12)

یعنی اجودھیا سے ڈیڑھ یوجن دور جاکر سرجو کے جنوبی ساحل پر وشوامتر نے لحن شیریں میں رام کو مخاطب کیا اور کہا: ''اے پسر رام! اب سریو سے شرب عقیدت (آچمن) کرو۔ اس اہم کام میں تاخیر نہ ہو''۔

ایک دوسرے موقع سے سیتا کے اخراج کا تذکرہ والمیکی رامائن میں ملتا ہے۔ جب کہ یہ تذکرہ عام ہو گیا کہ سیتا ناپاک ہو گئی تھیں اور راون انہیں اغوا کر لے گیا تو پھر رام نے انہیں دوبارہ اپنے پاس کیوں رکھ لیا۔ چنانچہ رام نے سیتا کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ لچھمن انہیں لے جا کر والمیکی کے آشرم میں چھوڑ آئے۔ ان دونوں واقعات کی مکمل تفصیلات کے ذریعہ یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رام کی اجودھیا، فیض آباد کی اجودھیا نہیں ہے۔ بلکہ رام کی اجودھیا حال کے بلیا اور مئو اضلاع کے مابین کہیں ہوگی۔

اس رامائن کے بال کانڈ کے پانچویں باب (سرگ) میں اجودھیا کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ کوشل نام سے مشہور ایک بہت بڑا ضلع ہے جو دریائے سرجو کے ساحل پر بسا ہوا ہے۔ اسی ضلع میں اجودھیا نام کی ایک نگری عوام میں مشہور ہے۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ اجودھیا ساحل سرجو پر واقع ہے بلکہ کوشل کو سرجو ندی کے کنارے بتایا گیا ہے۔ لیکن موجودہ اجودھیا ساحل سرجو پر واقع ہے۔

اجودھیا کے تذکرہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ بڑے بڑے پھاٹکوں اور رکاوٹوں سے مزین ہے۔ اس کے اندر الگ الگ بازار تھے۔ وہاں عظیم بالاخانے تھے۔ جن پر پرچم لہراتے رہتے تھے۔ سیکڑوں توپوں سے وہ آبادی آراستہ تھی۔ اجودھیا کے چہار جانب گہری کھائی کھدی ہوئی تھی، جس میں داخل ہونا یا جسے عبور کرنا دشوار تھا۔ (اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ موجود اجودھیا کے چاروں جانب گہری کھائی تھی) یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ ساکنان اجودھیا کے گھروں سے اس کی آبادی اس قدر گھنی ہو گئی تھی کہ کہیں ذرا سا بھی مقام خالی نظر نہیں آتا تھا۔

## موجودہ اجودھیا رام کی اجودھیا نہیں

''والمیکی رامائن'' کے مطابق حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ اجودھیا رام کی اجودھیا نہیں ہے۔ اور اس سے رام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر دین بندھو تیواری اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں۔ (والمیکی رامائن میں) متذکرہ حقائق کے مطابق اصل اجودھیا کا گنگا، سرجو کے مقام اتصال سے 50-40 کلومیٹر کے مابین شمال مشرقی جانب میں کہیں واقع ہونا چاہئے، لیکن موجودہ اجودھیا (فیض آباد کی اجودھیا) متذکرہ مقام اتصال سے 250 کلومیٹر سے بھی زیادہ دوری پر واقع ہے۔ (ہفت روزہ ہندوستان 4/اکتوبر 1992، صفحہ 19)

''والمیکی رامائن'' کے حقائق کی اساس پر اجودھیا کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ موجودہ اجودھیا سے متعلق یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کالی داس کے ناٹک ''رگھوونش مہا کاویم'' (رام کتھا پر ناٹک) سے متاثر ہو کر چندر گپت وکرمادتیہ (دوئم) اجودھیا جانے کے لئے اپنے درباریوں کے ہمراہ نکل پڑا۔ وہ اجین کا راجہ تھا۔ اس کا دورِ حکومت 415-375ء تھا۔ درباریوں نے اس سے کہا کہ اجودھیا نام کا مقام معلوم نہیں ہے لیکن راجہ نے ایک نہ سنی اسے اس وقت مایوسی ہی ہوئی جب اصلی اجودھیا کہیں نہیں مل سکی۔ ایسے حالات میں اس نے اپنے تصور و خیال کے مطابق ساحل سرجو (فیض آباد) کی جنگلوں سے آراستہ زمین کو اجودھیا ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہاں اسے کچھ کھنڈرات بھی ملے۔ انہیں کھنڈروں کے قریب اس نے رام گڑھ نام سے قلعہ کی تعمیر کروائی اور ''رگھوونش مہا کاویم'' کی کہانی کی بنیاد پر رام کتھا کے 360 مقامات تعمیر کروائے۔

درگا پرساد گپت لکھتے ہیں کہ ''گہرائی سے چھان بین کرنے کے بعد یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ موجودہ اجودھیا رام کے دور کی اجودھیا کی باقیات نہیں بلکہ ہزاروں سالوں بعد نئی تعمیر شدہ اجودھیائے اصغر ہے۔ جس کے تمام مناظر نئے اور خیالی ہیں۔ یہ کسی بھی طور سے ثابت نہیں ہو پاتا کہ اس قدر محدود رقبہ میں اجودھیا جیسی عظیم اور تاریخی نگری واقع رہی ہوگی۔ (بلیا اور اس کے نواحی، کتاب سے)

## دیگر رامائنوں اور کتھاؤں میں رام نگری

بودھوں کے ''دشرتھ جاتک'' میں دشرتھ کو بنارس کا راجہ بتایا گیا ہے۔ وہیں رام کا جنم ہوتا ہے۔ سنبھلی، ملیشیائی، تبتی، لنکائی، وغیرہ رام کتھاؤں میں رام کا جنم ان کے اپنے ملک میں بتایا گیا ہے۔

# رام جنم بھومی کا شوشہ: انگریزوں کی سازش

محترمہ شہلا نواب نے اپنی نئی کتاب [مطبوعہ 2003ء ''بابری مسجد ـــــ رام جنم بھومی تنازعہ'' کے ایک باب میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی تنازعہ کو انگریزوں کی سازش قرار دیا ہے۔ زیر نظر مضمون کے تجزیے سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ تاہم اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے میں ایک نقطہ نظر کے بطور یہ مضمون معاون ہوسکتا ہے۔ (مرتب)

انگریز چونکہ ہندوستان پر مکمل طور پر اپنا قبضہ چاہتے تھے جس کے لئے انہوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' (Divide and Rule) کی پالیسی اپنائی۔ ہندو مسلم اتحاد ہمیشہ سے ہی ان کے لئے پریشانی کا سبب بنا رہا۔ وہ اس اتحاد کو توڑنا چاہتے تھے کیونکہ آپسی بھائی چارہ ان کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ ان کو ہمیشہ سے ہی یہ تکلیف رہی کہ دو الگ الگ مذاہب کے ماننے والے لوگ ایک ہی مقام پر کس طرح سے مل جل کر رہتے ہیں بلکہ اپنی اپنی مذہبی رسومات بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ادا کرتے ہیں اور تیوہار تو بالکل مل جل کر مناتے ہیں۔

اودھ میں اسلامی حکومت تھی اور یہاں ہندو پرسکون تھے۔ یہ بات انگریزوں کے گلے نہیں اتر رہی تھی۔ مگر نوابوں کے دور حکومت میں لکھنؤ اور فیض آباد میں چھوٹا موٹا ٹکراؤ ہوا۔ جیسا ایک گھر یا خاندان کے رہنے والوں کے درمیان ہونا فطری مانا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی اودھ سماجی اعتبار سے ہندو مسلمانوں میں بٹا ہوا تھا۔ مسلمان شیعہ اور سنی میں منقسم تھے۔ ادھر ہندو سماج بہت سے حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے سنی مسلمانوں کی حالت اور بگڑنے لگی محرم کے زمانے میں یہ ایک ٹکراؤ کی شکل میں سامنے آیا کیونکہ شیعہ اور سنی واقعات کربلا کے لئے الگ الگ نظریہ رکھتے ہیں یہاں ہندو مسلمانوں میں ٹکراؤ کم اس لئے تھا کیونکہ یہاں ویسے بھی سنی مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کی پوزیشن مضبوط تھی۔ ہندو، شیعہ اور سنی مل کر مزاروں کی زیارت پر جاتے تھے۔ لیکن 1853 اور 1855 میں دونوں کے درمیان نفاق پڑا، جس نے بڑے ٹکراؤ کی صورت اختیار کر لی ان کے درمیان پہلی خونی لڑائی ہوئی۔ اجودھیا میں ہندوؤں کی مذہب کی از سر نو شروعات کی تحریک شروع ہوگئی تھی۔ 1722ء میں مغل حکمراں محمد شاہ نے میر محمد خاں کو اودھ کا صوبے دار مقرر کیا تھا۔ اس نے باغی

سرداروں کا سر کچل کر اودھ کو اور بھی مضبوط بنایا تھا اجودھیا میں پرانے قلعے کی مرمت کرا کر اس کو قلعہ مبارک کا نام دیا۔ اس کے دور میں ہندو مندر اور آشرم بنے اور کچھ رامانندی اکھاڑے بھی سامنے آئے۔ ساتھ میں وشنو فرقے نے شیوؤں سے اجودھیا کے کچھ اہم مذہبی مقامات بھی واپس لینے کی کوشش کی۔ ہنومان پربت شیوؤں کا آخری گڑھ تھا۔ سعادت خان کے جانشین ابو منصور خاں 1739-1754 کے دورِ حکومت میں رامانندی پنتھ کے نروان اکھاڑے کے ایک سادھو ابھے رام نے اسے پھر سے فتح کر لیا تھا۔

نواب نے اپنا دربار فیض آباد میں منتقل کر دیا۔ 1750ء میں اجودھیا کو نواب صفدر جنگ کے طاقتور وزیر نول رائے کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔ جو ہندو کائستھ تھے اور رامانندی فرقے سے ہمدردی رکھتے تھے انہوں نے سورگ دوار گھاٹ کے نزدیک بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ جس میں ناگیشور مندر خاص ہے۔ زیادہ تر انگریزوں کا ماننا ہے کہ نواب کا دربار نہ ہونے اور نول رائے کی حمایت ملنے سے یہ علاقہ ہندو شہر میں تبدیل ہو گیا۔ یہ جواز قابل قبول نہیں ہے، اجودھیا سے دربار ہٹ جانے سے یہ مطلب نہیں تھا کہ ہندو ارگزاریوں کے لیے ایک مناسب ماحول تیار ہو گیا کیونکہ یہ ماحول رامانندی اکھاڑوں کے ساتھ اُبھرا جو ایک گرم جوشی کا نتیجہ تھا۔

آہستہ آہستہ اجودھیا میں ویشنوؤں کی سرگرمیاں زور و شور سے چلنے لگیں اور بہت سے سادھوؤں کے مٹھ بھی بن گئے تھے۔ کارنیگی کا ماننا ہے اس دور میں بہت سے مذہبی اداروں کی بنیاد پڑی۔ وہ 1750 کے بعد بننے والے 290 ہندو مذہبی ادارے گنواتا ہے۔ نواب آصف الدولہ نے ان اکھاڑوں کو سیاسی سرپرستی دی اور دل کھول کر دان دیا۔ یہیں سے اجودھیا کی سیاسی حالت میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں اس دور میں نواب کی ماں بہو بیگم کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ 1775ء میں شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ آصف الدولہ نے نواب بننے کے بعد لکھنؤ کو اپنی راجدھانی میں ملا لیا۔ مگر آصف الدولہ ہر اعتبار سے ایک کمزور نواب ثابت ہوئے۔ بہو بیگم کو نواب سے کوئی امید نہیں تھی اس لئے انہوں نے 1816ء میں برٹش ریزیڈنٹ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ انہوں نے بہو بیگم کو یقین دلایا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے شوہر کے مقبرے اور ان کے نوکروں کی مکمل دیکھ بھال ہوگی۔ جس کے بدلے میں انہوں نے اپنا محل ریزیڈینٹ کے حوالے کر دیا۔

1816ء کے اس معاہدے کے تحت اودھ کا محل جس میں اجودھیا بھی تھی انگریزوں کو دے دیا

گیا۔ ان پر اجودھیا میں مال گزاری کی وصولی اور پرامن ماحول بنائے رکھنے کی ذمہ داری بھی تھی۔ اس دور میں ان اکھاڑوں کی طاقت بڑھنے لگی۔ برطانوی حکومت ان کی طاقت پر کوئی پابندی نہ لگا سکی۔

1857ء کے غدر اور وہابی تحریک نے انگریزوں کا جینا مشکل کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوؤں کو ساتھ میں لینا ضروری سمجھا۔ ادھر مسلمان انگریزوں کے ہاتھوں بادشاہت سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اسلئے وہ انگریزوں سے ناراض تھے اور تمام تحریکیں ان کے خلاف تھیں۔ اس لیے انگریزوں نے ہندو مذہب کی نئی شروعاتی تحریک کو حمایت دینے میں ہی اپنی بھلائی مانی۔

ادھر صوفی تحریک نے سنتوں کو بہت متاثر کیا۔ برہمن واد سے صوفی اصولوں کے تعلق سے بھکتی تحریک نے فروغ پایا۔ ڈاکٹر بدری ناتھ شری واستو کا خیال ہے کہ 1100 عیسوی تک ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں کرشن بھکتی مشہور ہو چکی تھی۔ جبکہ رام بھکتی کی روایت بنارس میں سوامی رامانند کے ظاہر ہونے کے بعد پھیلی"۔[1] اجودھیا کافی بعد میں آکر اہم مذہبی مقامات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تیرتھ یاتراؤں پر تیار بہت سے گرنتھوں میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہندو تیرتھ کی شکل میں ایودھیا کی ترقی بہت بعد میں ہوئی۔ آٹھویں صدی کے جین گرنتھ میں اجودھیا کو ایسا مقام کہا گیا ہے جہاں تیرتھ تھنکر رہتے تھے۔ حالانکہ رام کے جنم استھان کی شکل میں بھی اس کی وضاحت کی ہے مگر اسے برہمنوں کے اہم مذہبی مقام کی شکل میں نہیں گنا گیا ہے۔

یہ بھی حیرت کی بات ہے ایک مذہبی گرنتھ جو تلسی داس کی رام چرتر مانس کی ہی طرح ہے۔ رام یا اجودھیا کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بادشاہ اکبر کے درباری سامنت ٹوڈرمل کاشی شہر کا پابندی سے سفر کرتے تھے۔ انہوں نے بنارس کے بہت سے پنڈتوں کو ایک بھاری بھرکم دھرم گرنتھ بنانے کے کام پر لگایا۔ اس گرنتھ کو ٹوڈر نندم کہا جاتا ہے۔[2] جو 1585ء میں پورا ہوا یہ نہ تو رام کی وضاحت کرتا ہے اور نہ اجودھیا کی۔ کہتے ہیں کہ ٹوڈرمل کاشی میں تلسی داس سے ملے تھے۔

گپت حکمراں وشنو کے بھکت تھے۔ کمار گپت نے اپنے دربار میں وشنو سے جڑے ہوئے نشان اپنا رکھے تھے۔ اس کے جانشین اسکند گپت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی راجدھانی کو پاٹلی پتر سے ہٹا کر ساکیت (اجودھیا) لے گیا تھا ایسا مانا جاتا ہے کہ وہ اپنا مقابلہ رام سے کرتا تھا اور راجدھانی بدلنے کے پیچھے یہی وجہ مانی جاتی ہے۔[3]

سولہویں صدی کے بعد رام کتھا اتنی مشہور ہو گئی کہ دیہاتی ثقافت کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی

ایک اہم حصہ بن گئی مریادہ پرشیوتم، ہیرو بادشاہ اور وشنو کے ایک اوتار کی شکل میں رام کی پوجا کی جانے لگی۔ رام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے برہمن واد نے انہیں ایک اوتار مانا اور بہت سے مقامات، ندیوں، جھیلوں اور کنوؤں سے بھگوان رام سیتا اور لکشمن کے ساتھ تعلق کا تصور کیا گیا۔ اس لیے ان کو پاکیزہ مانا جانے لگا۔ اجودھیا میں رام نومی کا سالانہ میلہ لگنے لگا اور جلد ہی اس میں بھاری بھیڑ شامل ہوگئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی میں ایک موقع پر اس سالانہ تہوار کے لئے پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہوئے تھے۔[4]

ظاہر ہے کہ ہندو تحریک بہت حد تک صوفی تحریک کے بڑھتے اثرات کو روکنے میں کامیاب ہو گئی اور اجودھیا کے نئے سیاسی ماحول میں ان ہندو تحریکات کو پنپنے کا پورا موقع ملا کیونکہ اودھ کے نواب شیعہ تھے۔ 1765ء میں بکسر کی لڑائی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ثابت ہو جانے کے بعد سنی مغل حکمرانوں کے اثر سے باہر آنے کے لئے بے چین تھے۔ اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کی طاقت تسلیم کرلیا تھا۔ 1765ء میں ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے کچھ عرصے کے بعد مغل بادشاہ کے میواتی فوجی اجودھیا اور فیض آباد سے ہٹا لئے گئے۔ اس دور میں ہندو فرقہ بھی اجودھیا میں بڑھنے لگا۔ اس وقت یہاں مختلف فرقوں کے سات اکھاڑے تھے۔ ہنومان گڑھی کا نرباکی (مکو) اکھاڑہ، نرموہی اکھاڑہ، دگمبری (نگن) اکھاڑہ، خاکی اکھاڑہ، مہانربانی اکھاڑہ، سنتوش اکھاڑہ، اور نرلبھی اکھاڑہ۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ سے ان اکھاڑوں کو بڑی بڑی زمینیں دان میں ملیں۔ ان کو درباری افسروں اور مال گزاری وصول کرنے والوں سے بھی دان اور حمایت ملتی تھی۔ 1900 میں فقیروں اور ویراگیوں کے پاس فیض آباد ضلع میں کل ملا کر 647 جاگیریں تھیں۔[5] ہندو مذہب کی از سر نو شروعات کی تحریک نے نوابوں کے عہد میں اپنی جڑیں پکڑنی شروع کیں اور انگریزوں کے ذریعے اجودھیا کے قبضے کے بعد اپنی حالت کو اور بھی مضبوط کیا اسی دور میں لیڈن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بابر 1528ء میں اجودھیا آیا تھا۔ یہیں سے بابری مسجد/رام جنم بھومی تنازعہ کی شروعات ہوئی۔ جس کے نتیجے میں 55-1853 کا فساد سامنے آیا۔ اس دور میں علاقائی مسلمانوں خاص طور سے سنی مسلمانوں نے ایک ہندو مندر پر دعویٰ کیا اور یہ خیال عام ہوگیا کہ ہنومان گڑھی کا مندر ایک مسجد کے کھنڈر پر بنایا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ آگ بھڑکتی رہی 1855 میں مسلمانوں نے ہنومان گڑھی میں نماز پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجتاً ٹکراؤ ہوا۔ نواب نے اس

معاملے کی تفتیش کے لئے کہا۔ بعد میں کوئی بھی تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے نواب نے ہنومان گڑھی کو تحفظ دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن بابری مسجد پر دعویٰ کرنے والی علاقائی کمیٹی نے رام کے جنم استھان کی یاد میں بابری مسجد کے باہر ایک چبوترہ بنانے کا فیصلہ کیا۔

1857ء کے غدر کے بعد انگریزوں نے بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ فیض آباد میں باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریز افسر تیار ہونے لگے۔ انہوں نے رسد جمع کرنا شروع کر دی۔ کیپٹن تھربرن کے گھر کی قلعہ بندی کرنی شروع کر دی۔ کمپنی کو اپنے وفاداروں سے پوری امید تھی۔ اجودھیا کے راجہ مان سنگھ، ٹھاکراین رگھوناتھ کنور، میر باقر حسین اور نادر شاہ نے پناہ کی تجویز رکھی جس سے انگریزوں کو تقویت ملی۔ ہنومان گڑھی کے مہنتوں نے بھی ایسی ہی تجویز رکھی باغیوں کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے مدد دینے والوں کو انعام دیا۔ راجہ مان سنگھ کی جاگیر بڑھی اور وہ فیض آباد کے سب سے زیادہ طاقتور تعلقدار بن گئے۔6 ہنومان گڑھی کے مہنتوں کو بھی انعام ملا اور ممکن ہے انگریزوں نے بابری مسجد پر دعویٰ کرنے کی مہم کو اور ہوا دینی شروع کر دی ہو۔

1859ء میں اس تناؤ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حالات کو کشیدہ بنتے ہوئے انگریزوں نے دونوں مذہبی مقامات کے بیچ میں حد بندی کرنے کی بات کہی۔ چبوترے کو مسجد سے الگ کرنے کے لئے ایک لوہے کی جالی لگا دی گئی۔ بابری مسجد کا پورا مشرقی حصہ مہنتوں کو مل گیا۔ بابری مسجدؒ کے مشرقی حصے کی زمین پر مہنتوں نے ناجائز قبضہ کیا اور حکومت خاموش رہی قانونی نکتہ نظر سے حکومت مداخلت کر سکتی تھی کیونکہ اجودھیا کی ساری زمین نزول کی زمین قرار دی جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ ہندو دھرم اجودھیا میں مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا۔ مندر بننے لگے اور ان میں سے زیادہ تر ایسے مقامات پر بنے جن کو رام کی زندگی سے جڑے کسی نہ کسی واقعہ سے جڑا بتایا جاتا ہے۔ 1902ء میں ایسے مندروں کی تلاش شروع ہوئی۔ رام منوہر پرشاد کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے اجودھیا میں مقدس مقامات کی تلاش کرنے اور پتھر کے کھمبے لگانے کے لئے 1000 روپے جمع کئے۔ اس کمیٹی نے 145 مقامات کو چنا اور بابری مسجد کے مشرقی دروازے پر سب سے پہلا پتھر لگایا جس پر رام جنم بھومی مندر لکھا تھا۔

اس وقت حکومت کی خاموشی نے پورے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس مسئلے نے پھر سیاسی صورت حال اختیار کر لی اب تو سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے اس

مدعے کو ایک مضبوط کڑی مانا جانے لگا۔ ہندوؤں نے شدھی کرن تحریک شروع کی جس میں گائے کے تحفظ کی بات بھی کہی گئی۔ مسلمانوں کے عید الاضحیٰ کے تہوار پر گائے کی قربانی کے خلاف ایک مہم شروع ہوئی اور اسے کامیابی بھی ملی۔ مسلمانوں نے بھیڑ اور میمنوں کی قربانی دی۔ 1910ء میں گائے کے تحفظ کی تحریک نے بہار میں زور پکڑا۔ 13-1912ء میں تشدد بھڑکا۔ اجودھیا میں اور آس پاس کے علاقوں میں اس مسئلے کو لے کر تشدد بھی ہوا۔ 17 راپریل 1934ء کو معاملات بگڑ گئے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں نے گائے کی قربانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لئے انہوں نے ضلع مجسٹریٹ اور میونسپل کارپوریشن کے چیئرمین سے اجازت مانگی جو انہوں نے دے دی۔ مگر علاقائی ہندو پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ وہ قربانی نہیں ہونے دیں گے۔ قربانی کے بعد ایک فساد کھڑا ہو گیا۔ ویراگیوں نے بابری مسجد پر قبضہ کر لیا تقریباً دو گھنٹے میں بابری مسجد کے گنبد پوری طرح سے شہید کر دیئے گئے۔ پولیس نے بروقت کاروائی کر کے مسجد کو شہید ہونے سے بچا لیا۔ علاقائی انتظامیہ نے اس کے لئے ہندوؤں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ علاقائی ہندوؤں نے 1,25000 روپے جمع کر کے اس مسجد کے گنبد اور توڑ پھوڑ کو ٹھیک کرا دیا۔ مگر تناؤ برقرار رہا، دسمبر 1969ء میں یہ تناؤ پوری طرح سے سامنے آیا اور یہ دونوں مذہبوں کے لیے انا کا مسئلہ بن گیا۔ کیونکہ سیاسی چالوں نے ان دو فرقوں کو مکمل طور پر ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا۔

اودھ میں نوابوں کے دورِ حکومت میں بھی لوگوں کے درمیان آپسی نفاق موجود تھا۔ مگر اس کی اتنی خطرناک صورت نہیں تھی کیونکہ پھر بھی لوگ آپس میں مل جل کر رہتے تھے حکمراں طبقہ منظم تھا ان کی تہذیب نے آگے چل کر مشترکہ تہذیب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مذہبی اختلافات کم ہوتے چلے گئے یہ لوگ اپنے تہوار مل جُل کر منایا کرتے تھے۔ ہندو مسلمان مل کر ایک ہی پیر فقیر کی زیارت کرتے تھے اور ان کے مزار پر جا کر دعائیں مانگتے تھے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب اودھ کی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے کیونکہ یہاں بھی کئی ہزار ہندو سید سالار مسعودؒ کے مزار پر سالانہ عرس میں شریک ہوتے تھے۔[7] فیض آباد میں ہندو مسلمان مل کر مہندی کا تہوار مناتے تھے۔[8] اس موقع پر حکمراں طبقے کی طرف سے تہواروں میں برابر شریک ہوتے، نذرانے اور تحفے دیئے جاتے تھے۔ گھروں کے آگے ایک چبوترہ ہوتا تھا جس پر وہ اپنا نذرانہ پاتا تھا۔ محرم کے تعزیے بھی اس چبوترہ پر رکھے جاتے تھے۔ چاہے کوئی آدمی شیعہ نہ بھی ہو اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہو وہ بھی محرم کے پہلے عشرے کو مانتا تھا۔ ملی جلی

تہذیب کا یہ رواج اس طرح سے اپنی گرفت بنا چکا تھا کہ نوابوں کے بعد بھی عوام نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔[9] زمین دار لوگ بھی چاہے کسی بھی مذہب کے ہوں ملنے والے نذرانے کے تحت اس تہوار کو مل جل کر منایا کرتے تھے۔

جہاں تک اودھ کی سلطنت کا تعلق ہے یہاں انیسویں صدی سے پہلے کبھی کوئی مذہبی تشدد نہیں بھڑکا۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان سب سے پہلے خونی ٹکراؤ کی داستان 55-1853 میں ملتی ہے۔ یہ فساد بابری مسجد کو لے کر دونوں فرقوں کی اپنی اپنی دعوے داری سے متعلق تھا۔ ہنومان گڑھی کے ویراگیوں کا ماننا تھا کہ رام کا جنم اس مقام پر ہوا تھا۔ پہلے اس مسجد کو جامع مسجد یا سیتا رسوئی مسجد کہا جاتا تھا اس تناؤ کے بعد اس کو بابری مسجد کہا جانے لگا۔

دراصل لکھنؤ کے برٹش ریزیڈینٹ کرنل سلیمن نے اودھ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک رپورٹ لکھی۔ اس رپورٹ کے لکھنے کے کچھ عرصے بعد ہی یہ تناؤ پیدا ہوا۔ کیونکہ 1850ء کے بعد کے کچھ سالوں میں کرنل سلیمن نے اودھ کا دورہ کیا تھا اور یہی رپورٹ تھی جس کو بنیاد بنا کر انگریزی حکومت نے اودھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1850 کے بعد کرنل سلیمن نے اودھ کا دورہ کیا اور کہا تھا کہ قانون و انتظامیہ کمزور ہے۔ دیہی علاقوں میں نواب کی طاقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ شہروں میں جان و مال کی کوئی حفاظت نہیں ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کے برطانوی ریزیڈنٹ کے اقتدار کے تئیں عوام کی عزت اور ان کے یقین کی بھی بات کہی۔ انہوں نے لکھا کہ ریاست کے سیاسی، سماجی، انتظامی اور مالگزاری کے انتظام میں شیعہ لوگوں اور دوسرے فرقے کے لوگوں کے درمیان بہت سی باتیں جدا جدا ہیں۔[10] حالانکہ حالات اس کے برخلاف تھے۔ 1857ء کا غدر اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ دیہاتی علاقے بھی انگریزوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے اودھ پر اپنے قبضے کو جائز ٹھہرانے کے لئے انگریزوں نے بھی اس بات کی حمایت کی۔ جس زمین پر بابری مسجد بنی ہوئی تھی اس کو لے کر اجودھیا کے ہندو مہنتوں اور مسلمانوں کے درمیان کچھ وقت سے ایک اختلاف چل رہا تھا۔ ہندو پجاریوں نے اس خیال کو عام کر دیا کہ مغل بادشاہ بابر نے اسی جگہ رام جنم مندر کو گرا کر یہاں بابری مسجد بنوائی تھی۔ بابری مسجد جس زمین پر کھڑی تھی اسے بھی ہندوؤں نے مقدس مانا اور ویراگیوں نے اس کو مدعا بنا لیا۔[11] 1853 میں مغلوں نے آسانی سے بابری مسجد پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب ایک مہنت کو مٹھ سے نکالا گیا تو حالات اور بھی بگڑ گئے اس نے لکھنؤ جا کر بچے رہنے کی غرض

سے اسلام مذہب قبول کرلیا اور اس نے یہ افواہ سرگرم کردی کہ ہندوؤں نے بابری مسجد کو برباد کر دیا ہے۔ لکھنؤ میں اس کی مولوی امیر علی سے دوستی ہوگئی۔ یہ مولوی اکبر بادشاہ کے ذریعہ اپنے آباء و اجداد اور امیٹھی کے مشہور صوفی سنت شیخ بندگی میاں کو دان میں دی گئی زمین کے سلسلے میں آیا تھا۔ امیٹھی لوٹ کر مولوی امیر علی نے بابری مسجد کی آزادی کے لئے جہاد کا اعلان کر دیا۔ اس نے ہنومان گڑھی کو بھی ختم کرنے کی مانگ کی۔ نواب واجد علی شاہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھی بھڑک اُٹھے۔ انہوں نے فوراً رپورٹ مانگی۔ انہوں نے امیٹھی کے بدرالدولہ کو بھی حکم دیا کہ وہ جاکر مولوی کے دستے کو روکیں۔ نواب اس فساد کو روکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ویراگیوں کے قبضے سے پہلے مسجد کے امام کو (جو مسجد کی دیکھ بھال کر رہے تھے) مسجد لوٹا دی جائے۔ ایک ماہ تک یہی حالات رہے۔ مولوی نے ضبط سے کام نہیں لیا۔ اپنے دستے کو فیض آباد اور امیٹھی کے بیچ میں دریاباد تک لے آیا جہاں وہ 20 دنوں تک رہا۔ نواب نے مجبور ہوکر برٹش ریزیڈنٹ سے دخل دینے کی گزارش کی۔ 1819 کے معاہدے کے تحت اجودھیا کا محل انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تھا اور یہاں ان کی ہی ذمہ داری تھی۔ مگر انگریزوں نے یہاں کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب نے چار مفتیوں کو مولوی کے خیمے میں جانے کا حکم دیا۔ مولوی کے خیمے میں کھلبلی مچ گئی۔ آدھے سے زیادہ سپاہی اس کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ باقی فوجی اجودھیا کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ویراگیوں کے خاص مرکز ہنومان گڑھی کو برباد کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔

اودھ میں پیدل فوج کے پہلی ریجیمینٹ کے کمان دار کرنل بالرز کو مولوی کی فوج کو روکنے کا حکم دیا۔ رام پور کے رائے اُبھے رام بالی کی مدد سے کرنل بالرو نے مولوی کی فوج کا سامنا شجاع گنج میں کیا۔ بالرو کو کامیابی ملی۔ اس میں تقریباً 120 سے 700 لوگ مارے گئے۔ مولوی کا سر کاٹ کر نواب کے پاس لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ مگر مولوی کی پہچان ایک ہیرو سے کم نہ تھی۔ بارہ بنکی میں ردولی کے رحیم گنج میں اس کی یاد میں ایک سالانہ جلسہ بھی ہونے لگا۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں جاتے تھے۔ مگر 1905ء تک اس کا باقاعدگی سے منایا جانا بند ہو چکا تھا۔[12] بابری مسجد پر ہندو مہنتوں کا قبضہ بنا رہا۔ 1855ء میں ایک بار پھر ٹکراؤ ہوا۔ مسلمانوں نے بابری مسجد پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ہنومان گڑھی مندر کی سیڑھیوں پر بھی دھاوا بول دیا۔ مگر ان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مسجد کے دروازے پر 75 مسلمان مارے گئے اس مقام کو گنجِ شہیداں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بار بار یہ قصہ سر اُٹھانے لگا۔ اجودھیا

میں امن ناکام ہوگیا۔ دونوں فریقوں کے بزرگوں نے مل کر اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی۔ ان بزرگوں کا فیصلہ تھا کہ دونوں فرقے کے لوگوں کو ایک ہی جگہ نماز پڑھنے اور پوجا کرنے کی اجازت دینی ہوگی۔ یہ عمارت مسجد رہے گی جہاں مسلمان نماز پڑھیں گے اور ہندو مسجد کے سامنے پوجا کریں گے۔ انگریزوں کے ذریعے 13/فروری 1856ء اودھ کے قبضے تک یہ انتظام رہا جو 1857-58 کے غدر تک ایسا ہی رکھا گیا۔ 1857ء کے غدر میں ویراگیوں نے انگریزوں کو پناہ دی اور بھاگ کر گونڈا چلے جانے میں مدد کی[13]۔ انگریزوں نے اپنی مدد کرنے والوں کو انعامات دیئے۔ اجودھیا کے راجہ مان نگھ اور ویراگیوں کو حکومت سے بھاری انعامات ملے۔ بابری مسجد/رام جنم بھومی تنازعہ پھر پیدا ہوا۔ انگریزوں نے کہا کہ معاملہ نازک ہے اس لئے دونوں فرقوں کے مذہبی مقامات کو حد بندی کے ذریعے بانٹ دیا جائے۔ علاقائی انتظامیہ نے ہندو مہنتوں کو شری رام کے مقام پر مسجد کے سامنے ایک چبوترہ بنانے کی اجازت دے دی۔ اجودھیا کی زمین نزول کی زمین تھی۔ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن تھا۔

اس کے بعد ہندوستان میں تناؤ بنا رہا اور دونوں ہی اپنے اپنے طور پر اس مسجد پر اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے افواہوں اور اپنے بزرگوں کے ان سے جڑے قصوں کو عام کرنے میں لگ گئے۔ جس سے یہاں کا ماحول کشیدہ رہا۔ دراصل یہ آگ انگریزوں کے ذریعے پھیلائی گئی تھی جس کا انہوں نے کھل کر فائدہ بھی اُٹھایا۔

اگر یہاں رام کا کوئی مندر ہوتا تو وہ بہت مشہور ہوتا بلکہ پندرہویں صدی تک اجودھیا میں آنے والے چینی اور عرب سیاحوں نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ یہاں سب سے پہلے یونانی سیاح ولیم فنچ 1608 سے 1611 کے بیچ میں آیا تھا۔ وہ نہانے کے گھاٹوں اور کھنڈر بنے رام کے مندر کے بارے میں بتاتا ہے۔ وہ سورگ دوار کی وضاحت بھی کرتا ہے جسے اس کے مطابق رام کو جلائے جانے کے بعد دفنائے جانے کا مقام مانا جاتا ہے۔[14]

انیسویں صدی تک اجودھیا کی تاریخی اہمیت کی تفصیل تو ملتی ہے مگر رام جنم بھومی و بابری مسجد سے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ اکبر نامہ اور آئینِ اکبری میں بھی اجودھیا کا ذکر ہے ان کے مطابق اجودھیا کو رام جنم بھومی بھی کہا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں داراب علی خان کے زمانے میں محمد فیض بخش کو فیض آباد کی تاریخ لکھنے کی

ذمے داری دی گئی جو تاریخ فرح بخش کہی جاتی ہے۔ اس میں امیر تیمور، غازی گورگنی کے دورِ حکومت میں 1720ء میں برہان الملک کو اودھ بھیجے جانے تک دہلی میں ہوئے حادثات کی تفصیل ہے۔1720 سے 1819 تک فیض آباد کے تاریخی واقعات بھی درج ہیں مگر اس میں بابری مسجد و رام جنم بھومی تنازعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔

تاریخ اس بات کا کھلا ثبوت پیش کرتی ہے کہ انگریزوں کی منشاء چونکہ دونوں فرقوں کو آپس میں بانٹ کر حکومت کرنا تھا اس لئے انہوں نے اس من گھڑت واقعہ کو عام کیا۔ تزکِ بابری کے غائب اوراق نے ان کے اس خیال کو تقویت دی۔

انگریزوں نے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرلیا۔

جہاں تک بابری مسجد کا تعلق ہے۔ یہ اجودھیا کے سب سے اونچے اور اہم مقام پر بنی ہوئی ہے۔ اس کے چاروں طرف ہندو مندر ہیں۔ ہوسکتا ہے اس لئے یہ تنازعہ کا سبب بنی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں ہی اپنے اپنے طور پر دعویٰ کر رہے ہیں جبکہ یہاں پر اور مسجدیں بھی کھنڈر بن چکی ہیں۔ جو بابری مسجد کے نزدیک ہیں مگر اس کو لے کر ہندو مسلمان دونوں ہی خاموش ہیں۔ علاقائی کہانیوں کے مطابق یہ دونوں مسجدیں بھی مندروں کو توڑ کر بنائی گئی تھیں۔

مسلم فاتحین کے زمانے میں اجودھیا میں صرف تین مقامات تھے جس میں تھوڑے سے ہی بھکت آتے تھے اور جب تک اجودھیا لگ بھگ ویران تھی۔ یہ استھان تھے جنم استھان، سورگ دوار مندر جسے رام دربار بھی کہا جاتا ہے۔ اور تریتا کے ٹھاکر۔ اس میں پہلے پر بابر بادشاہ نے 1528ء میں مسجد بنوائی جس سے ابھی بھی اس کا نام جڑا ہوا ہے۔ دوسرے کے ساتھ اورنگ زیب نے 1658-1707 بھی یہی کیا اور تیسرے پر اس بادشاہ نے یا اس کے ماتحتوں نے عوام پر اپنا مذہب لادنے کی غرض سے مسجد بنوائی۔[15] یہ تینوں ہی مقامات رام کے جنم سے جڑے ہوئے ہیں جنم استھان جہاں رام کا جنم ہوا۔ سورگ دوار جہاں سے وہ سورگ میں گئے۔ تریتا کے ٹھاکر جہاں انہوں نے ایک بڑا یگیہ کیا تھا اور انہوں نے اپنی اور سیتا کی مورتیاں لگائی تھیں۔

بابری مسجد / رام جنم بھومی اپنے تقدس کی وجہ سے ہی آج ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ تاریخ اجودھیا کی اہمیت کو تو واضح کرتی ہے مگر اس تنازعہ کی حقیقت سامنے نہیں آتی ہے۔ اے. جے. نارائن اور بی. بی. لال کے ذریعہ کی گئی آثارِ قدیمہ کی کھدائی چوتھی سے چھٹی صدی کے دوران

اجودھیا میں کسی آبادی کا اشارہ نہیں ملتا ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آج کی اجودھیا کو ہی اجودھیا نگری مانا جاسکتا ہے۔ اس لئے رام جی کی زندگی سے متعلق 360 پوجا استھلوں کے قیام کے خیال کو تسلیم کرنا بھی مشکل ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے شری رام کے جنم استھان کی یاد میں کسی مندر کا کوئی علم نہیں تھا۔ مشہور رام جنم مندر کی جگہ پر بابری مسجد سے متعلق من گھڑت قصوں کی وضاحت سب سے پہلے یوروپی سیاحوں نے کی تھی۔ ان میں سب سے پہلا ذکر 1838ء کا ہے اس سے پہلے ولیم فنچ نے محل اور قلعے کے بارے میں بتایا تھا اور کھنڈر بنے قلعے کا ذکر بھی کیا تھا۔ جس کو علاقائی لوگ رام کا محل کہتے ہیں اس نے آگے لکھا ہے: یہ مانا جاتا ہے کہ رام نے اس شہر میں انسانی شکل اختیار کی تھی۔ ایک غار کے بارے میں لکھا ہے جس کے مطابق رام جی یہیں سے سورگ کے لیے گئے تھے۔ لیکن یہ کسی رام جنم مندر کا حوالہ نہیں دیتا ہے۔[16] اس کے بعد 1830 میں مارٹن نے اپنا حوالہ دیا اور کہا علاقائی کہانیوں میں بابر کے ذریعے ایک رام جنم بھومی مندر کو برباد کر کے اس کی جگہ ایک مندر بنوائے جانے کی بات کہی گئی ہے۔[17]

یوروپی سیاحوں کے ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وکرم جیت کے رام جنم بھومی مندر کی اہمیت 11-1608 تک خاموش تھی۔ لیکن 1838ء تک عوام یہ جاننے لگے کہ بابری مسجد مشہور رام جنم بھومی مندر کو گرا کر بنوائی گئی ہے اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے ان باتوں کو انیسویں صدی میں مشہور کر دیا گیا۔ 1819ء میں فیض آباد سے متعلق اپنی یادداشت میں محمد بخش نے نہ تو بابری مسجد کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی کسی مندر کا۔ 1819ء میں لیڈن نے بابر کی یادداشت کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور اس میں بتایا کہ بابر اجودھیا گیا تھا۔

اجودھیا کے پوجا استھان کی وضاحت کی غرض سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں جو مقامات کی نشاندہی کے علاوہ رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ یہ کتابیں علاقائی دکانوں پر بیچی جاتی ہیں۔ اب تک 36 کتابوں کا پتہ چل چکا ہے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ یہ راجکمار اپنے ماتا پتا کے کمروں میں ہی پیدا ہوئے۔ ان سلسلہ وار کتابوں کے باب 10 میں کہا گیا ہے سیتا رسوئی جنم استھان کے مغربی حصے میں ہے۔ جنم استھان سے چالیس گز دور جنوب میں کیکئی کا محل ہے۔ جہاں بھرت کا جنم ہوا تھا۔ اس کے سات گز دور جنوب میں تیسرا محل ہے، جہاں لکشمن اور شتروگھن کا جنم ہوا۔ جنم استھان کے جنوب

مشرق میں سیتا کوپ ہے جسے گیان کوپ کہا گیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ کوشلیا بھون ہی رام کا جنم استھان ہے جو بابری مسجد کی سمت سے ایک دم مختلف ہے۔

اتر پردیش کے آثارِ قدیمہ کے محکمہ کے سابق ڈائریکٹر رام چند سنگھ نے اجودھیا میں 17 مقامات پر کھدائی کرائی تھی۔ ترنموجن گھاٹ اور گیسار گھاٹ نام کے دو مقامات بھی واضح کئے۔ ان کے مطابق زیادہ تر مقامات پر دوسری صدی قبل مسیح سے پہلے آبادی کے آثار نہیں ملتے ہیں صرف منی پربت اور سگر یو پربت نام کے دو مقامات کو موریہ دورِ حکومت کا کہا جا سکتا ہے۔ حکومتِ ہند کے آثار قدیمہ محکمہ کے سابق مینیجنگ ڈائریکٹر ہر جواس رائے نے بھی کئی بار اجودھیا کے مقامات کی جانچ کرائی۔ جس میں اجودھیا میں آبادی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ان میں ایک جین شبیہہ ہے جو موریہ دورِ حکومت اور چوتھی صدی قبل مسیح کی آخری اور تیسری صدی قبل مسیح کی ابتداء کی ہے جو لوگ رام کی تاریخ میں یقین رکھتے ہیں ان کی تاریخ 2000 قبل مسیح کے آس پاس طے کر کے چلتے ہیں، کیونکہ راجہ دشرتھ مہابھارت کی لڑائی سے لگ بھگ 65 پیڑھی پہلے ہوئے تھے۔ عام طور پر یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ مہابھارت کی لڑائی 1000 قبل مسیح کے آس پاس ہوئی تھی اس لئے ہمارے سامنے اجودھیا کے بسنے اور اجودھیا میں رام کے بعد کے بیچ کے 1000 سالوں سے زیادہ کا فرق آتا ہے۔ اس لئے کچھ دانشور اجودھیا کو افغانستان میں بتاتے ہیں۔

1000-800 قبل مسیح میں گرنتھ ارتھ وید (x.2.31.33) میں اجودھیا کا سب سے پہلا ذکر ملتا ہے مگر یہ ایک خیالی تصور ہے۔ اسے دیوتاؤں کے شہر کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ جو آٹھ چکروں سے گھرا ہے اور نو داخلی دروازوں سے سجا ہے۔ جو ہر طرف سے روشنی میں نہایا ہوا ہے۔

مشترکہ ادارے (نالندہ سنسکرن حصہ III صفحہ 358، حصہ IV صفحہ 162) جو لگ بھگ 300 قبل مسیح کا گرنتھ ہے۔ اس میں اجودھیا کو گنگا ندی کے کنارے بسا ہوا دکھایا گیا ہے۔ جس کا فیض آباد ضلع میں سرجو ندی کے کنارے بسی ہوئی اجودھیا سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ ابتدائی پالی گرنتھ اس خیال کی تائید بھی نہیں کرتے کہ گنگا ندی کا استعمال سرجو کے ساتھ ساتھ سبھی ندیوں کے لئے عام معنوں میں کیا گیا ہے۔ یہ بالمیکی راماین کی بنیاد پر ہندوستانی آثارِ قدیمہ سروے کے علاوہ مینیجنگ ڈائریکٹر مہیش چند جوشی نے اجودھیا کو سرجو سے کچھ دوری پر ڈھونڈھ نکالا۔ بالمیکی راماین کے مطابق سرجو ندی سے

اجودھیا کی جو دوری بتائی گئی ہے اس کا مطلب 12 میل کہا جاتا ہے اس سے یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ جو اجودھیا سرجو ندی کے کنارے ہے۔ یہ ندی مشرق کی اور بہتی ہے اور بلیا اور سارن علاقوں میں اس کے مشرقی بہاؤ کو گھما کر گھا گھرا کہتے ہیں۔ سارن علاقے میں جا کر یہ گنگا سے مل جاتی ہے۔ سریو اپنا راستہ بدلتی ہوئی چلتی ہے۔ جس کی وجہ سے کچھ دانشور بلیا کے کھیراڑیہہ علاقے کو اجودھیا ماننا چاہتے ہیں۔

ہیون سانگ کے مطابق اجودھیا ملک میں 3000 بودھ بھکشو تھے اور سادھوسنتوں اور غیر بدھوں کی تعداد اس سے کم تھی۔ اجودھیا حکومت کی راجدھانی کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ ایک پرانے مٹھ کا ذکر کرتے ہیں۔ جو کافی عرصے سے بودھ دھرم کی تعلیمات کا مرکز بنا رہا۔ اس بات سے ساتویں صدی میں اجودھیا میں بدھ مذہب کے اثرات کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ اجودھیا میں 110 ویہار اور 10 مندر تھے۔ اس سے پہلے 5 ویں صدی عیسوی میں فاہیان ساکیت میں بدھ کی مسواک کی وضاحت کرتا ہے۔ جو سات ہاتھ اونچی اگی ہوئی تھی حالانکہ برہمنوں نے اس پیڑ کو برباد کر دیا تھا وہ اس جگہ پر پھر سے اگ آیا۔ اجودھیا کو کئی جین تیرتھ تھنکروں اور مذہبی پیشواؤں کی جائے پیدائش بھی مانا جاتا ہے۔ اور جینی اسے تیرتھ مانتے ہیں جین روایت کے مطابق اسے کوسل حکومت کی راجدھانی بتایا گیا ہے۔ مگر کسی مقام پر اس کی صحیح شناخت نہیں ملتی کہ یہ کہاں پر ہے؟

اب تک خاص طور سے اجودھیا کی وضاحت کرنے والی مہروں اور سکوں کا بھی پتہ نہیں چلا ہے۔ مختلف طرح کے سکے ضرور ملے ہیں جنہیں اجودھیا سکوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر پہلی صدی قبل مسیح اور دوسری صدی عیسوی تک ہیں مگر ان پر اجودھیا کا نام نہیں ہے۔

رام کتھا کو ہندی زبان میں رام چرت مانس نے مقبول بنایا اور اودھی زبان کا یہ مہا کاویہ بالمیکی کی رامائن پر منحصر ہے۔ اس میں 6000 اشلوک تھے جنہیں بعد میں بڑھا کر 12000 کر دیا گیا اور پھر 24000 کر دیا گیا۔ اس کو گرنتھ کا باریکی سے مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چار حالتوں سے ہو کر گزرا تھا۔ اس کا آخری دور 12 ویں صدی کے آس پاس بتایا جاتا ہے۔ جو سب سے ابتدائی دور 400 قبل مسیح کے آس پاس ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ہمارے پاس اس طرح کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جو 2000 قبل مسیح سے 1800 قبل مسیح کے بیچ کا ہو۔ یہ ایک ایسا دور ہے جسے پرانوں کی

روایت پر کام کرنے والے کچھ دانشوروں نے رام کا دور بتایا ہے۔ جو اجودھیا میں راجہ دشرتھ کی تاریخ کو واضح کر سکے گا۔

اگر ہم ہندو خیالات کو تاریخ بنا کر چلیں تو اجودھیا مذہبی مقام کی شکل میں عہدِ وسطیٰ میں اُبھری تھی۔ رام چرتر مانس کو اودھ پوری میں شروع کیا تھا۔ مگر اس کی وضاحت مقدس مقام کی شکل میں نہیں کرتے ہیں۔

تاریخ میں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا ہے جو اس بات کی وضاحت کر سکے کہ اس مقام پر کوئی رام مندر تھا ساتویں صدی کے آس پاس رام، سیتا اور لکشمن حمیر پور ضلع میں مورتیوں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ جھانسی ضلع میں دشاوتار مندر کی باہری دیوار پر ان تینوں کا ایک فلک بھی ملا ہے۔ بہار کے نوادا علاقے میں افسد کے مقام پر لگ بھگ ساتویں صدی کی رام، سیتا اور لکشمن کی مورتیاں بھی ملی ہیں، لگ بھگ اسی عہد کا مٹی کا بنا ہوا رامائن فلک بکسر سے بھی ملا ہے۔

مدھیہ پردیش میں رام کے نام منسوب تین ایسے تاریخی مندر ہیں جو بارہویں صدی کے ہیں۔ مگر اتر پردیش میں سولہویں صدی کے آخر تک نہ تو کوئی رام مندر ہونے کی کوئی بات سنائی دیتی ہے اور نہ ہی رام جنم بھومی مندر ہونے کی۔ کنک منڈپ یا کنک بھون جو سب سے پرانا مندر ہے سترہویں صدی کا ہے۔ کنک مندر نیپال کی ترائی میں جنک پوری میں سیتا کا سب سے پرانا مندر ہے۔ کنک بھون اور کنک مندر دونوں ہی سترہویں صدی میں مغل حکمراں کے دورِ حکومت میں تعمیر ہوئے۔ ان دونوں مندروں کی سترہویں صدی میں ہونے کی بات اس لئے ممکن ہے کیونکہ اسی مدت میں رام بھگتی نے اہم شکل اختیار کر لی تھی۔ کیونکہ رام کے پہلے کی تعلیمات اور پھر بعد میں کبیر داس، ملوک داس اور دادو جیسے طالب علموں کی تعلیمات۔ اٹھارویں صدی کے دوران اودھ کے نواب جو شیعہ تھے ہندو اور مسلمانوں نے اجودھیا کے ہندو مندروں اور مقدس مقامات کے ساتھ تعاون کیا۔ مگر کسی رام مندر کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اجودھیا میں کچھ جین اور شیو مندر رہے ہوں گے۔ اجودھیا میں شیو طبقہ وشنو مذہب سے پہلے آیا تھا۔ جس کے ساتھ عہدِ وسطیٰ میں رام کو پوری طرح پیش کیا گیا۔ شیو کے بیٹے کارتیا کیے کے میور کا پہلی اور دوسری صدیوں کے اجودھیا کے سکوں پر نشان ملتا ہے۔

جہاں تک بابری مسجد کی تعمیر کا سوال ہے اس پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کسی مسجد کی تعمیر میں کسی شیو یا جین مندر کا سامان بھی ہو سکتا ہے۔ کسی مسجد کی تعمیر میں پرانے سامان کا استعمال عام ہے جیسے

قطب مینار کے پاس کے محل۔ ایک مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشان کے دورِ حکومت میں اینٹوں کا استعمال گپت دورِ حکومت کی تعمیرات میں کیا گیا تھا لیکن بابری مسجد کے لئے کوئی بھی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ کہ یہ مندر رام جنم بھومی مندر کے اوپر بنایا گیا ہے اجودھیا اور فیض آباد میں مسلم آبادی 14 ویں صدی کے آس پاس بسنی شروع ہوئی تھی۔ اس لیے یہاں مسجد بنانا ضروری تھا۔ مگر بابر نامہ میں بھی اس قسم کی مسجد کی کوئی وضاحت نہیں ہے۔

بابر نے اودھ کا تو ذکر کیا ہے مگر اجودھیا کا نہیں اس لئے تاریخ بھی بابری مسجد/رام جنم بھومی مندر سے متعلق خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخ نہ تو اس بات کا کوئی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس مقام پر مسجد بابر نے بنوائی تھی اور نہ ہی اس بات کے لئے کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اس مسجد کی تعمیر رام مندر پر کی گئی ہے۔ مگر ایسا ممکن ہے کہ اس مقام پر کوئی تاریخی محل ضرور رہا ہوگا۔ ایسا اس لئے ہے کہ یہ مسجد ایک ٹیلے پر ہے جو مشرق میں 20 فٹ سے زیادہ اور مغرب میں 40 فٹ سے زیادہ اونچا ہے۔ مسجد کا مقام پرانے شہر کے مرکز میں ہے۔ اس لئے یہاں کسی پرانے محل کے ہونے کا امکان ہے۔

اے۔ کے۔ نارائن اور بی۔ بی۔ لال کے ذریعہ ہونے والی آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح میں بھی اجودھیا میں بڑی آبادی تھی۔ کننگھم کے ذریعہ کھدائی جو 1862ء کے بیچ ہندوستان آیا تھا۔ ہیون سانگ بعد میں آیا۔ اور کہتے ہیں یہ راجہ ہرش وردھن کے دورِ حکومت میں آیا تھا۔ کننگھم نے اپنا سفر دہلی سے شروع کیا اور متھرا اور قنوج ہوتے ہوئے اجودھیا گیا۔ اس کے مطابق قنوج سے دونوں چینی سیاحوں نے الگ الگ راستے اپنائے۔ فاہیان سیدھے شاچی گیا جبکہ ہیون سانگ گنگا کے کنارے کنارے پریاگ روانہ ہو گیا۔ پھر دونوں سیاحوں کی سیاحت کا پہلا حصہ ایک ہی لگتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ فاہیان کا شاچی اور ہیون سانگ کی وشاکھا بالمیکی کی اجودھیا ہے۔

کننگھم کو یہ بھی یقین ہے کہ آج کی اجودھیا ہی اس زمانہ میں ساکیت یا اجودھیا تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اجودھیا بودھ دھرم کا مرکز تھی۔ گیارہویں صدی سے پہلے بودھ اور جین اور ہندو دھرم سب ہی اس شہر میں پھلتے پھولتے رہے تھے۔

چھٹی صدی تک اجودھیا میں بودھ دھرم ایسی زبردست طاقت بنا رہا۔ جس کے بھاری تعداد

میں ماننے والے تھے۔ پانچویں صدی کی شروعات میں جب فاہیان نے شاچی اجودھیا کا سفر کیا تو اس نے وہاں زبردست بدھ سرگرمیاں دیکھیں۔ لیکن جب ہیون سانگ ساتویں صدی میں وشاکھا یا اجودھیا آیا تب بودھ مذہب اہمیت کی نظر سے برہمن کے مقابلے میں شروع ہو چکا تھا۔ کننگھم نے یہ بھی کہا کہ ساتویں صدی کے بعد دکنی ہندوستان میں بودھ دھرم کی اہمت کم ہونے لگی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ دھرم کی شکل میں بدھ دھرم ابتدائی ہندو دھرم کے ہاتھوں 1000 عیسوی تک ہار چکا تھا۔

کننگھم کو یقین تھا کہ اجودھیا ہی واحد قدیم عمارت رہی ہے جس کا تعلق بودھ دھرم سے ہے۔ انہوں نے اس خیال کی تردید کر دی کہ اجودھیا میں کوئی ہندو مندر بھی تھا۔ ان کے مطابق ہنومان گڑھی یہاں کی قدیم عمارت تھی ان کا ماننا ہے کہ اورنگ زیب کے دورِ حکومت سے پہلے کی بھی نہیں ہے۔ انہوں نے یہاں مٹی کے تین ٹیلوں کی بھی وضاحت کی ہے۔ منی پربت، کبیر پربت اور سگریو پربت۔ یعنی یہ ٹیلہ بھی کننگھم کے ٹیلوں سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے مطابق جن اینٹوں کا ذکر ان ٹیلوں میں کیا گیا ہے ایسی ہی اینٹیں بابری مسجد والے ٹیلے پر بھی تھیں۔ جب پروفیسر رومیلا تھاپر کو بڑی اینٹوں کے بارے میں بتایا گیا تو وہ حیران رہ گئیں ان کو لگا یہ اینٹیں شنگ دور کی بھی ہو سکتی ہیں۔

اجودھیا والوں کا ماننا ہے کہ پربت اجودھیا میں رام کوٹ کی تعمیر کے لئے مزدوروں نے بنائے تھے۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ مزدور جب شام کو اپنے ٹوکرے جھاڑتے تھے جس سے دھول جھڑ کر ٹیلے بن گئے اسلئے ان ٹیلوں کو جھاڑ جھاڑیا اور اجھاڑ کہتے ہیں مگر اینٹوں کے بارے میں وہ خاموش ہیں۔

منی اور کبیر پربت کے بیچ ایک چھوٹا سا مسلم علاقہ ہے۔ جو مشرق سے 64 فٹ لمبا اور چوڑائی میں 47 فٹ ہے۔ اس میں بہت سی قبریں ہیں جس میں شیث علیہ السلام اور ایوب علیہ السلام کی قبریں ہیں۔ ان قبروں کے بارے میں مسلمانوں کے مطابق شیث علیہ السلام کا مقبرہ 90 فٹ لمبا تھا مگر وقت اور بدلتے حالات نے اسے گھٹا کر 27 فٹ کر دیا ہے کسی کا کہنا ہے کہ وہ بہت لمبے تھے اور ان کا ایک قدم 90 فٹ کا ہوتا تھا۔ کننگھم کا ماننا ہے یہ دونوں قبریں اجودھیا اور بہرائچ پر ہونے والی ابتدائی ترکی مہموں میں آنے والے مسلم فوجیوں کی ہیں مگر علاقائی مسلمان اس کی تردید کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ان فوجیوں کو سڑک کے کنارے اجودھیا لکھنؤ سڑک سے بہت دور دفنایا گیا تھا۔ ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ مردہ فوجیوں کی روحیں رات کے سناٹے میں ابھی بھی اس علاقے میں

منڈراتی ہیں۔ نیول نے 1905ء میں اجودھیا کے نزدیک پایا تھا کہ لوگ آدھی رات کے بعد ادھر سے نہیں گزرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس وقت سڑک پر سر کٹے گھڑسواروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اور سپہ سالار مسعودؒ کے یہ خاموش فوجی یقیناً بہرائچ کی طرف جا رہے تھے۔[18] ان کا یہ بھی ماننا تھا مسلم حصے میں موجود چار مقبرے حقیقت میں ان چار چبوتروں پر بنائے گئے تھے جہاں پہلے سے چار بدھ بیٹھا کرتے تھے۔ ہیون سانگ نے داتون والے پیڑ کی جگہ اور پہلے کے چار بودھوں کے بیٹھنے اور دھیان کرنے کے مقام کو استوپ کے بہت نزدیک بتایا ہے۔

وہاں کے مسلمان اس بات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ یہ قبریں بعد میں بنیں انہوں نے اپنا دعویٰ ظاہر کرنے کے لئے یہاں پر گھیرے کے اندر لال پتھر کے دو ٹکڑے بھی لگا رکھے ہیں اور ان پتھروں پر 1100 ہجری اور 1173 ہجری لکھا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ پتھر کے گھیرے کے اندر بعد میں لگائے گئے ہوں۔ تاکہ اس مقام کو قدیم ثابت کیا جا سکے۔ علاقائی ہندو اس گھیرے پر اپنا دعویٰ ثابت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہاں بھی مندر ہوا کرتا تھا۔ کننگھم کے مطابق ان ٹیلوں پر بودھ استوپ تھے۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ ان کو اشوک نے بنوایا تھا۔ یہ استوپ 200 فٹ اونچا تھا۔ اور اسی مقام پر تھا جہاں ساکیت میں اپنے چھ سال کے قیام کے دوران بودھ نے دھرم کا اپدیش دیا تھا۔ کننگھم کے مطابق یہ مٹی پربت تھا۔

ہیون سانگ نے پہلے جس یادگار کا ذکر کیا ہے وہ انام دیہار تھا۔ ہوسکتا ہے یہ ساکیت کا ملک رام پور وارام رہا ہو۔ اس دیہار کو کننگھم نے سگریو پربت سے جوڑا ہے اس کے مطابق لگ بھگ 500 فٹ لمبا اور 300 فٹ چوڑا تھا۔ مگر اس بارے میں سارے خیالات کی اندر کنویں اور بند کمروں کی وجہ سے تردید ہوئی ہے۔ جو گھیرے کے چاروں طرف ہیں۔

کننگھم کو ہیون سانگ کے ذریعے آخری یادگار کی کھوج تھی۔ یہ ایک استوپ ہے جس میں بدھ کے بال اور ناخن رکھے تھے کہا جاتا ہے کہ اس یادگار کے چاروں کونے ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور پانی میں اس عمارت کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

ان پرانے ٹیلوں پر بابری مسجد والے ٹیلے بھی مرکز پر ہیں اور ممکن ہے کہ یہ اور عمارتوں سے گھرا رہا ہو۔ ٹیلے کے مغرب میں ایک بڑا گڑھا جیسا بھی کچھ ہے جسے کننگھم نے کسی ندی کی شکل میں جانا ہے۔ ہیون سانگ کے سفر کے وقت ٹیلے کے مغرب میں پانی رہا ہوگا جس ٹیلے پر بابری مسجد ہے ہو

سکتا ہے یہ وہی استوپ ہو جس پر بدھ کے بال اور ناخن تھے۔

تاریخ جہاں تک ثبوت فراہم کرتی ہے وہ بتاتے ہیں کہ بابری مسجد کسی پرانی عمارت پر تعمیر کی گئی ہے یہ عمارت رام جنم بھومی نہیں تھی اس کا بھی ثبوت پیش نہیں کیا جا چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کسی قدیم بدھ عمارت پر بنائی گئی ہو۔

## حواشی

1. بدری ناتھ شری واستو راما نندی: سمپر دائے کتھا ہندی ساہتیہ پر اس کا پربھاؤ، الہ آباد۔ 1957، صفحہ 151
2. پی.ایل.ویدھ ٹوڈ رنندم: این انسائکلوپیڈک ورک آن دادھرم شاستر راج کمپائلڈ انڈر دا پیٹرونیز آف راجہ ٹوڈرل، 1948
3. آر.سی.مجمدار: اے ہسٹری آف انڈیا، کلکتہ صفحہ 151
4. بینیٹ، باب 2، صفحہ 455
5. نیول کا فیض آباد، گزیٹیر صفحہ 178
6. نیول کا فیض آباد گزیٹیر صفحہ 163
7. گزیٹیر آف دی پروونس آف اودھ، تین جلدوں میں، کلکتہ 1877 باب 2 صفحہ 112-110
8. ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: تاریخ فرح بخش، مصنف محمد فیض بخش، الہ آباد 1889
9. ایچ.سی.اروِن: دی گارڈن آف انڈیا آور چیپسٹرس آن اودھ ہسٹری اینڈ افیئرس 1880، صفحہ 186
10. نیول کا بارہ بنکی گزیٹیر صفحہ 170
11. نیول کا فیض آباد گزیٹیر صفحہ 163
12. ولیم فوسٹر (ترجمہ) ارلی ٹریولس ان انڈیا 1619-1513 لندن 1921 صفحہ 176
13. ڈبلیو.سی.بینیٹ صفحہ 6
14. ولیم فوسٹر صفحہ 176.
15. مانٹ گمری مارٹن صفحہ 336-334
16. ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر: ص 165-31
17. جان لیڈن صفحہ 333
18. نیول کا فیض آباد گزیٹیر صفحہ 32

# اجودھیا کے مندر کے انہدام میں بابر کا ہاتھ۔ چند شکوک

روزنامہ دکن ہیرالڈ کے 20 رستمبر کے شمارے میں مسٹر وی. ایم. بدولہ کا بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ پر ایک مضمون "وہ جگہ جس کے لئے وہ لڑ رہے ہیں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے بنگلور کے پی. ایس سری دھرموورتی نے اخبار کے ایڈیٹر کے ڈاک کالم میں ایک خط لکھا تھا جو صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ذیل میں اس خط کا انگریزی متن اور اس کا اُردو ترجمہ دیا جا رہا ہے، تاکہ تاریخی اعتبار سے ایک غیر مستند مضمون کا جواب بھی ریکارڈ ہو جائے۔ (مرتب)

**Doubts over Babar's hand in Ayodhya Temple Demolition**

Sir, - Mr.V.M. Badola, in his article, "The place they are fighting over" (DH September 20) has stated that Mr. D.N. Agarwal, a former Judge of the Allahabad High Court and a Vishwa Hindu Parishad activist, produced (during an interview) a copy of the "Faizabad Gazetteer 1928," which said that in 1528 A.D., Babar came to Ayodhya and halted there for a week. He destroyed the ancient temple and on its site built a mosque still known as Babar's mosque."

We all believe that when a publication whether Government or private, is reprinted with changes in a subsequent edition. it has been either corrected or improved. Strangely, in the 1960 Gazetteer, the confidence with which the event was stated in the 1928 Gazatteer is missing. By adding the crucial phrase 'it seems' the certainty is diluted and the whole thing is made a probability. Secondly, it does not say "He destroyed," but suggests that someone destroyed the temple. This is what the 1960 Gazetteer says: "It seems that in 1528 A.D. Babar visited Ayodhya and under his orders this ancient temple was destroyed and on the site was built what came to be known as Babar's mosque." No reasons are given for this change.

Let me give another example to show how the Gazetteers are not dependable as a source of history. The Gazetteer of Oudh 1877 Vol. I, page 7, describes the black stone pillars of Babri Masjid as Buddhist: "To my thinking, these more strongly resemble Buddhist Pillars than those I have seen at Benaras and elsewhere" - P. Carnegy. The Gazetteer of 1905 has omitted this, and the Gazetteer of 1960 carries an altogether different description of these pillars by referring to them as Kasauti bearing various Hindu bas-reliefs." (Kasauti is a type of black stone).

Let me furnish yet another instance or irresponsibility on the part of those who produce Gazetteers. Kasauti black stones are used to test the purity of gold ornaments. When the black stone pillars of Babri Masjid were tested by a history

research team with gold (pure and impure) it was found that the pillars were not made of kasauti.

Gazetteers are therefore very poor sources of history as they are written by officials and not historians. They are like sanddunes changing shape with the winds. The Hindu fundamentalists have nothing – absolutely nothing – except the 1928 Gazetteer to say that Babar demolished the temple to build the mosque. All other theories of theirs have been successfully demolished by scholars. The most notable of these books is "Babar the Secular Emperor" by Mrs. Surinder Kaur and Mr. Tapan Sanyal, published in April 1987 with a foreword by Mr. B.N. Pande, Governor of Orissa.

Again Mr. Badola is not entirely correct when he says, "But a section of historians claim that Babar never came to Ayodhya but that he camped at a site many kilometers away....". Not a single historian, Hindu or Muslim, Indian or Western – and some of them have written detailed biographies of Babar – have stated anywhere that Babar came to Ayodhya, nor have they said anything about his demolition of any temple anywhere. In fact, Babar gave donations to several temples including Janmasthan Temple situated to the north of the Babri Masjid, now separated by a tar road. Mr. Ram Raksha Tripathi has given a long list of temple which received donations from Babar. Many temples have preserved Babar's grants bearing the royal seal as documents or title deeds of the lands belonging to them.

In the light of many proven facts, Syed Shahabuddin is correct when he says that Muslims are under attack.

**P.S. Sridhara Murthy**, Bangalore

(Courtesy: Deccan Herald, Bangalore, October 1987)

## ترجمہ:

مسٹر وی.ایم.بدولہ نے اپنے مضمون [The Place they are fighting over (D.H. September 20)] میں لکھا ہے کہ الہ آباد کے ایک سابق جج اور وشو ہندو پریشد کے کارکن مسٹر ڈی.این. اگروال نے ایک انٹرویو کے دوران فیض آباد گزیٹیر 1928ء کی ایک نقل پیش کی تھی جس میں بتایا گیا ہے کہ 1528ء میں بابرؔ نے اجودھیا آکر ایک ہفتہ تک قیام کیا اور ایک قدیم مندر کو ڈھا کر اس نے وہاں ایک مسجد تعمیر کی جو اَب بھی بابری مسجد کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

مگر ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ جب ایک سرکاری یا غیر سرکاری مطبوعہ دوسری مرتبہ تبدیلیوں کے ساتھ طبع کیا جاتا ہے تو یا تو کوئی تصحیح ہوتی یا متن کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ 1960ء میں فیض آباد گزیٹیر جب ازسرِ نو طبع کیا گیا تو حیرت کی بات ہے کہ وہ اتنا مستند نہیں ہے جس سے 1528ء کے گزیٹیر میں

اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''ایسا لگتا ہے'' کہ الفاظ جوڑ کر پورے واقعے کی صداقت کو مشکوک کر دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ''اس نے مندر کو ڈھایا'' بلکہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے نے مندر ڈھایا۔ 1960ء کے گزیٹیر کا متن اس طرح ہے ''ایسا لگتا ہے کہ 1528ء میں بابر نے اجودھیا کا دورہ کیا۔ اس کے حکم پر ایک قدیم مندر ڈھا دیا گیا اور اس جگہ ایک مسجد کی تعمیر کی گئی جو بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے''۔ مگر گزیٹیر میں اس تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔

میں ایک اور مثال پیش کروں گا جس سے واضح ہوتا ہے کہ گزیٹیر کو تاریخ کا ایک ذریعہ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ 1877ء کے الہ آباد گزیٹیر کی جلد اوّل صفحہ 7 پر لکھا گیا ہے کہ بابری مسجد کے سیاہ پتھر کے ستون بدھشٹ ہیں۔ میرے خیال میں یہ پتھر ان ستونوں سے زیادہ بدھ مت کے قریب لگتے ہیں جو میں نے بنارس اور دیگر مقامات پر دیکھے ہیں۔ پی کارنیگی۔ 1905ء کے گزیٹیر میں اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں ہے۔ 1960ء کے گزیٹیر میں بالکل علحدہ تذکرہ ہے۔ ان پتھروں کو ''کسوٹی'' بتایا گیا ہے۔ جس پر ہندوؤں کے نقوش ہیں۔ (کسوٹی ایک قسم کے سیاہ پتھر کو کہا جاتا ہے)۔

گزیٹیر مرتب کرنے والوں کی غیر ذمہ دارانہ روش کی ایک اور مثال دیکھئے۔ کسوٹی پتھروں کو سونے کی پرکھ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مورخین کی ایک ٹیم نے جب بابری مسجد کے ستونوں پر (اصلی اور نقلی) سونا پرکھا، تو پتہ چلا کہ وہ کسوٹی نہیں ہے۔

چنانچہ گزیٹیر کو تاریخ کا ایک کمزور ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ مورخین کے مرتب کردہ نہیں ہوتے بلکہ سرکاری عہدیداروں کے مرتب کردہ ہوتے ہیں۔ ہندو بنیاد پرستوں کے پاس اس وقت 1928ء کے گزیٹیر کے سوا کوئی دوسرا وسیلہ نہیں ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکیں کہ بابر نے مندر ڈھا کر مسجد تعمیر کی تھی۔ مورخین نے ان کے دیگر تمام نظریات کو کامیابی کے ساتھ جھٹلا دیا ہے۔ ان کتابوں میں سب سے معروف کتاب ''بابر ایک سیکولر شہنشاہ'' ہے جسے مسٹر سریندر کور اور مسٹر تاپن سنیال نے لکھا ہے۔ یہ کتاب 1987ء میں شائع ہوئی ہے۔ اڑیسہ کے گورنر مسٹر بی این پانڈے نے اس پر پیش لفظ لکھا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسٹر بدولہ کی اس بات میں بھی بھرپور صداقت نہیں ہے کہ مورخین کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ بابر نے اجودھیا کا دورہ ہی نہیں کیا۔ مگر اس نے اجودھیا سے کئی کلومیٹر دور

قیام کیا تھا۔ کسی مورخ نے ــــ نہ ہندو اور نہ مسلم، نہ مغربی نہ ہندوستانی نے ــــ جنہوں نے بابر کی سوانح حیات لکھی ہے، کہیں یہ لکھا ہو کہ بابر نے اجودھیا کا دورہ کیا اور اس نے مندر منہدم کیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بابر نے کئی مندروں کو عطیہ جات دیئے ہیں۔ جن میں جنم استھان مندر بھی شامل ہے، جو بابری مسجد کے شمال میں واقع ہے۔ مسٹر رام کرشنا ترپاٹھی نے ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جس میں ان مندرں کے نام بتائے گئے ہیں جنہیں بابر نے عطیہ جات دیئے تھے۔ کئی مندروں میں بابر کے عطیہ جات کی دستاویزات بھی محفوظ رکھے گئے ہیں۔ جن میں مندروں کے لئے زمین عطیہ کی گئی ہے۔ دستاویزات پر بابر کی مہر لگی ہوئی ہے۔ کئی ثابت شدہ حقائق کی روشنی میں مسٹر سید شہاب الدین کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خطرے میں ہیں"۔

(بشکریہ: روزنامہ سالار، بنگلور 8/اکتوبر 1987)



# اجودھیا تنازعہ: سوچنے کی باتیں

از: سیّد محمد اقبال
ریڈر شعبہ انگریزی، مرزا غالب کالج، گیا (بہار)

ایک کتابچہ کی شکل میں زیر نظر مضمون 1990 کے قریب ہندی میں شائع کیا گیا تھا تا کہ ملک کے ہندو بھائیوں کو حقیقت بتائی جائے۔ تکرار سے گریز کرتے ہوئے کتابچے کے بعض حصے کو حذف کر کے ہندی کتابچے کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے تا کہ تعمیری انداز سے سوچنے والے مسلمانوں کی کوششوں کا اندازہ کیا جا سکے۔ (مرتب)

## قدیم تاریخ پر ایک نظر

اجودھیا اودھ کا گھر تھا جہاں ہندو مسلمان ساتھ رہتے چلے آ رہے تھے۔ بھارت میں مسلمانوں کی آمد ساتویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ سمندر کے راستے اور کچھ خشک راستوں سے آئے۔ درمیان میں دور کے ممالک کے حکمرانوں نے حملے کئے اور لوٹ مچا کر واپس چلے گئے۔ 16 ویں صدی میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے دہلی پر چڑھائی کی۔ وہ لوٹ مچانے کی نیت سے نہیں آیا تھا بلکہ مغل سلطنت کو قائم کرنا چاہتا تھا۔ تاریخ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ بابر ایک دوراندیش حکمراں تھا۔ سابق صدر جمہوریہ آں جہانی راجندر پرساد نے اپنی کتاب "India Divided" میں بابر کی وہ وصیت نقل کی ہے جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی تھی:

''اے بیٹے! ہندوستان کی حکومت مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا گہوارہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے تم کو حکومت عطا کی۔ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے دل سے مذہبی عناد کو ختم کر دو اور ہر مذہب کے مطابق فیصلہ کرو۔ بالخصوص گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی طرح تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کو جیت سکو گے۔ پھر اس ملک کے عوام شاہی احسان سے دبے رہیں گے۔ جو لوگ سرکاری قانون کی پابندی کریں ان کے مندروں اور پوجا کے مقام کو منہدم نہ کرو۔ انصاف اس طرح کرو کہ عوام بادشاہ سے اور بادشاہ عوام سے خوش ہو۔'' (India Divided, 3rd Edition, page 39)

پروفیسر سری رام سنہا کی کتاب "Moghul Empire in India" میں بھی بابر کی یہ وصیت نقل کی گئی ہے۔ پروفیسر شرما کے خیال میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بابر نے کوئی مندر توڑا ہو یا کسی ہندو کو اس لیے ستایا ہو کہ وہ ہندو تھا۔ بابری مسجد کے نام کی وجہ سے بابر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جبکہ بابر کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ نہ مندر توڑنے سے اور نہ مسجد بنانے سے۔ اجودھیا میں میر باقی نے 1528ء میں یہ مسجد بنائی اور اسے بابر کے نام سے جوڑ دیا جس کی نئی نئی حکومت قائم ہوئی تھی۔ یہی بات میر باقی نے بھی لکھی ہے۔

کیا موجودہ اجودھیا وہی ہے جہاں رام پیدا ہوئے تھے۔ یہ بات متعین نہیں ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیق سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہو پاتی ہے کہ یہاں پر کوئی مندر تھا۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے 25 دانشوروں نے، جن میں ڈاکٹر ایس. گوپال اور رومیلا تھاپر جیسے لوگ بھی شامل ہیں اپنے مشترکہ بیان میں یہ بات کہی ہے کہ نہ تو موجودہ اجودھیا سے رام کا کوئی تعلق ہے اور نہ ہی مندر توڑنے کا کوئی ثبوت ملا ہے۔

## رامائن

رام کے بارے میں ہمیں تفصیل سے بالمیکی اور تلسی داس کے رامائن میں معلوم ہوتا ہے کہ رام کی پیدائش اس جگہ نہیں ہوئی تھی۔ تلسی داس تو بابر کے پوتے اکبر کے عہد میں تھے، انہیں تو یقینی طور پر رام کے پیدائشی مقام اور اس جگہ کی مسجد کے بارے میں لکھنا چاہئے تھا۔ واضح ہو کہ ان کے عہد میں یہ تنازع پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

## بابر اور رام

کم پڑھے لکھے عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ سوال ضرور اُٹھایا جاتا ہے کہ بابر اور رام میں کون بڑا ہے۔ یہ سوال بے معنیٰ ہے کیونکہ اس موازنہ سے کسی بھی نتیجہ تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ رام کروڑوں ہندوؤں کے لیے قابل پرستش ہیں، حتی کہ مسلمان شعراء نے رام کی تعریف میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ بابر مسلمانوں کے نزدیک کوئی مذہبی شخصیت نہیں ہے۔ وہ ایک مسلمان بادشاہ تھا جس طرح بہت سے بادشاہ ہوا کرتے ہیں۔

## مسجد اور مسلمان

مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ایک اللہ کی عبادت کی جاتی ہے، سجدہ کیا جاتا ہے، 'سجدہ' نماز کا ایک اہم حصہ ہے جس میں سر زمین پر رکھ کر اللہ کی بڑائی کے الفاظ کہے جاتے ہیں۔ مسجد صرف دیواروں کا نام نہیں، سجدہ کرنے کی جگہ کا نام ہے۔ مسجد میں کوئی بت نہیں ہوتا، مسجد کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے۔ بابری مسجد یا شاہ جہانی مسجد صرف پہچان کے نام ہی ہو سکتے ہیں، دوسرے مذہبی مقام کو توڑ کر مسجد بنانا غلط ہے۔ اسلام دوسرے دھرموں کے پوجا کے مقام کو توڑنے کے لئے نہیں اکساتا۔

## تنازعہ کا سیاسی پہلو

موجودہ تنازعہ کو جس طرح گمبھیر مسئلہ بنا دیا گیا ہے اس کی پوری ذمہ داری سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے ایوانِ سیاست میں آنے کے لیے پہلے ایک پارٹی نے اس تنازعہ سے سیاسی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تو اب دوسری پارٹی الیکشن کے لیے رام کا نام لے کر جذبات کو بے لگام کر رہی ہے۔ انتخابی فائدے کے لئے لوگوں کے بیچ نفرت کی دیوار کھڑی کی جا رہی ہے۔

## دہشت گردی اور مندر

یہ بات بدھ، مہاویر اور رام کی سرزمین پر شرمناک ہے کہ زور زبردستی اور تشدد سے کسی مسئلہ کا حل نکالا جائے۔ مندر کی تعمیر کی کوشش کرنے والے ایک ادارے نے دھمکی دی تھی کہ 30 راکتوبر کو مندر تعمیر کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو خون کی ندی بہہ جائے گی، دیگر مساجد کو توڑنے کی دھمکی بھی دی گئی، 30 راکتوبر کو حکومت نے قانونی اعتبار سے یہ اجازت نہ دی تو ان لوگوں نے ملک میں سیکڑوں مقامات پر خون بہانے اور درجنوں مسجدوں کو توڑنے کا اپنا ارادہ سچ کر دکھایا ہے۔ بالخصوص اتر پردیش اور گجرات میں۔ سوال یہ ہے کہ اس خونریزی سے کیا حاصل ہوگا؟ یہ نقصان کس کا ہے؟ یقینی طور پر ملک کا نقصان ہے۔ ملک کی دیگر مساجد پر غصہ اتار کر کیا ملے گا۔ مسجد تو اللہ کی عبادت کا مرکز ہے۔ اس سے دشمنی کر کے کیا حاصل ہوگا؟ یہاں رہنے والے کروڑوں مسلمان اس ملک کے شہری ہیں، یہ ملک بھی دیگر شہریوں کی طرح مسلمانوں کا ہے۔ بھارت کی تعمیر میں، اس کے دفاع میں، اس کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔

## مسلمان کیا چاہتے ہیں؟

مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندو بھائی اپنی خواہش کے مطابق مندر بنائیں، شری رام کے نام سے مندر بنائیں اور رام کے آدرشوں کا پالن کریں۔ صرف مسجد کو توڑ کر مندر بنانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ جہاں تک اجودھیا کی اس مسجد کا سوال ہے، اگر اس کا کچھ بھی ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ رام کا جنم ٹھیک یہیں پر ہوا تھا تو مسلمان یہ جگہ خود ہی سونپ دیں گے۔ یا پھر یہی ثابت ہو جائے کہ مسجد مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے تب بھی وہ بابری مسجد پر اپنا دعویٰ کالعدم قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا کوئی ثبوت تو پیش نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ دھمکی دی جاتی ہے کہ نشانے پر تین ہزار مسجدیں ہیں۔ یہ تو ابتداء ہے۔ لہٰذا مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ دھمکی ''منھ میں رام اور بغل میں چھری'' کے مترادف ہے۔ نہ رام جنم کا مسئلہ ہے، نہ ہی مذہبی جذبے کا اور نہ ہی رام بھگتی کا۔ بلکہ صریحاً مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔

## بین الاقوامی امیج

بھارت کے دنگوں کی خبریں جب بیرونِ ملک کے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں تو یہی بتایا جاتا ہے کہ ایک مسجد کی جگہ پر مندر بنانے کے لیے لوگ اپنی جان دے رہے ہیں۔ تب لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ابھی تک بھارت کے لوگوں میں تعلیم کا فقدان ہے؟ ہماری امیج باہر کے ملکوں میں بگڑتی رہتی ہے لیکن ہمیں اس کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔

## سوچنے کی بات

جہاں لوگ رہتے ہیں وہاں کچھ باتوں اور مسائل کی بنیاد پر جھگڑا بھی ہو سکتا ہے۔ اسے کیسے حل کیا جا سکتا ہے، یا تو مل جل کر یا پھر کسی کو پنچ (بڑا) مان کر، یا کسی عدالت کے ذریعے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ملک اور انسانیت کے مفاد میں کیا ہے، ہم اپنے جھگڑے کو کیسے حل کر سکتے ہیں۔ یہیں پر ہماری دانش مندی اور دور اندیشی کا امتحان ہے۔



# بابری مسجد: شہادت سے قبل ـــــ چند تاثرات

## فرقہ پرستی کے کارڈ نے کانگریس کے سیکولرزم کو کمزور کر دیا

یہی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی آخر کار ایک دن ہندوستان کو برباد کر کے رہے گی۔ یہ شرمناک اور تیزی سے بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی ہماری زندگی میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہم لوگ اب اس کو معیوب تک سمجھنا بھول گئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا باشعور اور دانشور طبقہ بھی اس خطرناک برائی کے نتائج کو محسوس نہیں کرتا۔ البتہ جب کبھی فرقہ پرستی کا ننگا ناچ اور ہنگامے برپا ہو جاتے ہیں تو ضرور وقتی طور پر یہ طبقہ متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس ہولناک بیماری کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے کوئی فرد مثبت قدم نہیں اُٹھاتا۔ رام جنم بھومی کا مسئلہ ہو یا پنجاب و کشمیر کے مسائل اب تو ''میدانِ جنگ'' بنتے جا رہے ہیں۔ جس میں مزید ''مذہبی جنون'' بھی شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اور سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان شرمناک حالات کی اصلاح کرنے کے بجائے ہمارے یہ نام نہاد سیاستداں پورا پورا ''سیاسی فائدہ'' حاصل کر لیتے ہیں۔ فوری طور پر سب سے زیادہ فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی اُٹھا رہی ہے۔ جس نے ملک کے بیشتر حصوں میں اپنی سیاسی پوزیشن کو محض فرقہ پرستی کی بنیاد پر کافی مضبوط کر لیا ہے۔

ہر چند کہ کانگریس بنیادی طور پر سیکولر جماعت رہی ہے۔ مگر راجیو گاندھی وغیرہ نے مسلسل کئی بار ''فرقہ پرستی کا کارڈ'' استعمال کر کے کانگریس کے سیکولرزم کو بے حد کمزور اور نمائشی بنا کر رکھ دیا ہے۔ مزید وی. پی. سنگھ نے بھی اقلیتوں کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اُٹھایا۔ جس کے نتیجے میں علیحدگی پسند عناصر اور فرقہ پرستوں کے نہ صرف ہاتھ مضبوط ہوئے ہیں بلکہ انہیں مختلف گل کھلانے اور من مانی کرنے کا بھی موقع ملا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ وی. پی. سنگھ بھی اپنا اقتدار اور حکومت برقرار رکھنے کے لیے بھارتیہ جنتا پارٹی کا سہارا لینے کے لیے مجبور تھے۔ فرقہ پرستی کارڈ نے کانگریس کے سیکولرزم کو کمزور کر دیا۔

پرتیش نندی (السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا، 26/اگست 1990)

## رام بھکتوں کی نیت صاف نہیں

بڑے بوڑھوں سے ایک بات سنتے آئے ہیں کہ ''جہاں رام وہاں اجودھیا'' یعنی رام اتنے عظیم ہیں کہ لوگوں نے اجودھیا کو ان کے پیچھے آتا ہوا مانا۔ یہ سچ ہے کہ رام کی پیدائش اجودھیا میں ہوئی لیکن رام کو اس سرزمین پر آئے ہزاروں سال گزر گئے۔ اس کے بعد مختلف دور تبدیل ہوتے رہے اور تقریباً پانچ سو سال پہلے وہاں بابر نے مسجد بنائی۔ آج اس مسجد کو توڑ کر یا ہٹا کر رام مندر بنانے کے لیے شور مچایا جا رہا ہے۔ مندر بنانے کی بات تو ٹھیک ہے لیکن کیا اس کے لیے بس مذہبی غیر جانبدارانہ حکومت مسجد توڑنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ اتنا مذہبی نہیں جتنا کہ سیاسی ہے جہاں تک مذہبی عقیدت کا تعلق ہے اگر ان رام بھکتوں کا امتحان لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی نیت صاف نہیں ہے۔ شری رام صرف مورتی کی شکل میں اجودھیا میں نہیں ہیں وہ تو ہر جگہ ہیں۔ اصل رام تو لوگوں کے دلوں میں ہیں وہ بھی مثالی اخلاق کی شکل میں۔ بلاشبہ انہیں ان لوگوں کی عقل پر رحم آ رہا ہوگا۔

**وجے جڑ دھاری گڑھوال**۔ (نو بھارت ٹائمز، نئی دہلی 3/نومبر 1990ء)

## خدا کے ایک گھر کو مسمار کرنا رام کی مریادا کے خلاف ہے

خدا پوری دنیا کے لئے ہے۔ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لئے ہے۔ اگر رام ایک چھوٹے سے خدا نہیں ہیں تو مسلمان اور ان کی عبادت گاہیں ان کے نزدیک عزیز ہوں گی اور وہ کبھی بھی ایک خدا کے گھر کو مسمار کرنے کی حمایت نہیں کر سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودی عبادت خانہ کے حوالہ سے جوزف سے کہا تھا کہ انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خدا کے گھر میں ہیں۔ پھر رام کس طرح مریادا پرشوتم ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ رام جنم بھومی/بابری مسجد کے مسئلے پر جھگڑا کر رہے ہیں وہ مذہب کے صحیح راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ مسجد اور مندر ایک دوسرے سے متصل ہو سکتے ہیں جیسا کہ وارانسی اور متھرا میں ہے۔ رام نے خود ایک مندر شیو کے لئے تعمیر کیا تھا۔ ''رب'' رب العالمین ہے رب المسلمین نہیں ہے۔ پھر یہ بے معنی محاذ آرائی ہندوستان کے دو بیٹوں کو ایک دوسرے سے کیوں جدا کر رہی ہے۔

جبکہ دونوں کی زبان رسم ورواج، روایات اور طرزِ زندگی ایک ہی ہے۔

اکشائے سی بنسل، غازی آباد (انڈین اکسپریس، نئی دہلی 8راگست 1990ء)

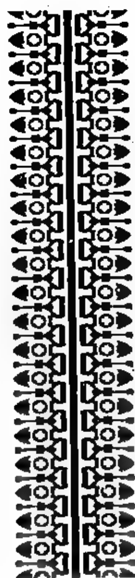
## کیا رام مندر بنتے ہی ملک کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے؟

''رام مندر کی تعمیر اور رتھ یاترا کشمیر، پنجاب، آسام اور ریزرویشن مخالف تحریک جیسے مسائل سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ یہ مسائل ہر ہندوستانی کے لیے باعث تشویش ہیں۔ رام مندر، جو صدیوں سے تو تعمیر نہیں ہو سکا۔ اب اچانک اس قدر اہم اور لازمی بن گیا ہے کہ قومی نوعیت کے تمام مسائل ایک طرف ڈال دیئے گئے ہیں۔ خواہ کتنی ہی جانیں جائیں، سرکاری املاک کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ غریبی اور بے روزگاری بڑھ رہی ہے تو بڑھے۔ لوگ خود کو جلا رہے ہیں تو جلائیں، لیکن رام مندر ضرور بننا چاہئے۔ گویا اس مندر کے تعمیر ہوتے ہی ملک کے تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ آج ہمیں مزید مندروں، مسجدوں، گوردواروں، چرچوں کی ضرورت نہیں بلکہ مزید اسکولوں، کالجوں، ہسپتالوں اور بے گھروں کے لئے مکانات کی ضرورت ہے۔ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جن سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں، ضرورت مند لوگوں کو روٹی ملے اور جن سے ملک مزید خوش حال ہو سکے۔'' کیا رام مندر ہی سے ملک کے تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے''۔

ڈی.آر.چوہان

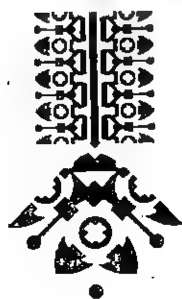
(انڈین اکسپریس، 5راکتوبر 1990ء کا ایک مراسلہ)








# شہید بابری مسجد: قانونی پہلو





"اجودھیا کا سانحہ ایک طوفان ہے جو گزر جائے گا۔
لیکن اس کی وجہ سے سپریم کورٹ کے وقار اور عزت
میں کمی نہیں آنے دی جائے گی۔"

— سپریم کورٹ

# بابری مسجد حقّیت کا زیر سماعت مقدمہ

از: ایڈووکیٹ ظفریاب جیلانی
کنوینر بابری مسجد ایکشن کمیٹی

1885ء میں مہنت رگھوبر داس نے سب جج فیض آبادی کی عدالت میں اس بات کا دعویٰ دائر کیا تھا کہ بابری مسجد کے پورب میں اس کے بیرونی صحن میں واقع 21+17 کے چبوترے پر ان کو پوجا کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ لیکن گرمی، سردی اور برسات کے موسم میں ان کو کافی دقت ہوتی ہے لہٰذا اس چبوترے (جس کو رام چبوترہ بھی کہاجاتا ہے) پر مندر تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جائے اس دعوے میں انہوں نے اپنے آپ کو جنم استھان چبوترے کا مہنت بتایا تھا اور دعوے کے ساتھ ہی جونقشہ نظری داخل کیا تھا اس میں چبوترے کے پچھم مسجد دکھائی گئی تھی۔ اس دعوے میں حکومت کی جانب سے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو فریق بنایا گیا تھا۔ لیکن بعد میں محمد اصغر نے اپنے آپ کو مسجد کے متولی کی حیثیت سے فریق بنوا لیا تھا۔ اس دعوے میں عدالت نے موقع کا معائنہ بھی کروایا تھا جس میں کمشنر کی رپورٹ کے ساتھ ایک نقشہ بھی داخل ہوا جس میں بابری مسجد کو صاف طور سے دکھایا گیا تھا۔ تمام شواہد وکاغذات کی بنیاد پر سب جج فیض آباد پنڈت ہری کشن نے دعوے کو یہ کہہ کر خارج کر دیا تھا کہ اگر مندر بنانے کی اجازت دی جائے گی تو اس میں گھنٹہ گھڑیال بجایا جائے گا اور مسجد میں اذان ہوگی جس سے خون خرابے کا اندیشہ ہے۔ یہ دعویٰ 19/جنوری 1885ء کو داخل کیا گیا تھا اور اس میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مئی 1883ء میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے مندر بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سب جج فیض آباد پنڈت ہری کشن کا فیصلہ 24/فروری 1885ء کو دیا گیا جس کے خلاف مہنت رگھوبر داس نے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کی عدالت میں اپیل داخل کی لیکن ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے بھی اپیل خارج کر دی۔

26/مارچ 1886ء کے ڈسٹرکٹ جج کے اس فیصلہ کے خلاف مہنت رگھوبر داس نے ہائی کورٹ (جیوڈیشنل کمشنر آف اودھ) کی عدالت میں اپیل دوئم (II Appeal) داخل کی لیکن وہ II Appeal بھی یکم/نومبر 1886ء کو خارج ہوگئی۔

1886ء سے 1934 تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ لیکن 1934ء میں اجودھیا سے قریب واقع شاہ جہاں پور گاؤں میں گاؤ کشی کے مسئلہ پر ایک فرقہ وارانہ فساد ہو گیا جس کا فائدہ اُٹھا کر اجودھیا کے کچھ بیراگیوں نے بابری مسجد کی ایک دیوار اور ایک گنبد کو بھی نقصان پہنچایا۔ اس فساد سے مسلمانوں کو ان کے جانی و مالی نقصان کی ادائیگی کے لئے حکومت نے اجودھیا کے ہندوؤں پر تعزیراتی ٹیکس عائد کیا اور سرکاری خرچہ پر مسجد کی مرمت کروائی گئی۔ مسجد کی مرمت پر ہونے والے اخراجات کی ادائیگی ضلع افسران کے ذریعہ ایک مسلم کانٹریکٹر کو دی گئی۔ یو. پی. مسلم وقف ایکٹ 1936ء کے نفاذ کے بعد وقف کمشنر نے صوبے کی دیگر وقف جائدادوں کے ساتھ فیض آباد اور اجودھیا کی وقف جائدادوں کا بھی سروے کروایا۔

20/فروری 1944ء کے سرکاری گزٹ میں بابری مسجد کو ایک سنی وقف دکھایا گیا۔ بابری مسجد کو سنی وقف بتائے جانے کے خلاف شیعہ وقف بورڈ نے سول جج فیض آباد کی عدالت میں ایک دعویٰ دائر کر کے اس کو شیعہ وقف ڈکلیر کرانے کی مانگ کی۔ لیکن سول جج فیض آباد نے اپنے 23/مارچ 1946ء کے فیصلہ میں یہ کہتے ہوئے دعوی خارج کر دیا کہ مسجد کا اندراج بطور سنی وقف قائم رہے گا اگر چہ اس کا استعمال شیعہ فرقے کے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔

جولائی 1949ء سے ستمبر 1949ء کے درمیان صوبائی حکومت نے کمشنر فیض آباد کی معرفت ڈپٹی کمشنر فیض آباد سے اس تجویز کی بابت رپورٹیں طلب کیں کہ اگر مسجد سے ملحقہ اراضی پر مندر تعمیر کروا دیا جائے تو لوگوں کا کیا ردعمل ہوگا۔

اس وقت کے ڈپٹی کمشنر فیض آباد کے کے. نیر کو: غالباً حکومت کی تجویز سے اتفاق نہیں تھا اور اسی لئے کچھ مقامی بیراگیوں اور دیگر شر پسند عناصر کی پشت پناہی میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ کچھ لوگوں نے 22-23/دسمبر 1949ء کی رات میں سیڑھی لگا کر مسجد کے اندرونی حصہ میں داخل ہو کر بیچ کے گنبد کے نیچے مورتی رکھ دی اور اجودھیا میں یہ شور کر دیا کہ مسجد میں رام للا پرکٹ ہو گئے ہیں۔ رات میں عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے اندرونی صحن کے باہر کی دیوار میں لگے دروازوں میں مسلمانوں نے تالا ڈال دیا تھا جس کو 23/دسمبر کو بھی ڈالے رکھا گیا اور جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے پہنچے تو وہاں موجود ہندوؤں کی بھیڑ کے مدِ نظر افسران نے مسلمانوں کو یہ سمجھا کر واپس کر دیا کہ اس دن وہ کسی دوسری مسجد میں اپنی نماز ادا کر لیں اور بہت جلد صورت حال پر قابو پا لیا جائے

گا۔ چنانچہ 23/دسمبر 1949ء کو بابری مسجد میں جمعہ کی نماز نہ ادا کر کے دوسری مسجد میں نماز ادا کی گئی لیکن آئندہ جمعہ سے قبل یعنی 29/دسمبر 1949ء کو مسجد کو قرق کر دیا گیا اور دونوں فریقوں کو مسجد کے اندر جانے سے روک دیا گیا۔

5/جنوری 1950ء کو مجسٹریٹ کے ذریعہ مقرر کردہ سپردگار (Receiver) نے قرق شدہ جائداد کے انتظام کی بابت ایک اسکیم منظور کروا کر اس کے مطابق انتظام شروع کر دیا۔

اس درمیان چیف سکریٹری حکومت اتر پردیش نے دسمبر 1949ء کے آخری ہفتہ میں کئی مرتبہ کمشنر فیض آباد کی معرفت ڈپٹی کمشنر فیض آباد کے کے. نیر پر زور ڈالا کہ وہ مسجد سے مورتی ہٹوا دیں۔ کیونکہ مورتی رکھے جانے سے حکومت کافی بدنام ہو رہی ہے۔ لیکن ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اس وقت کے چیف سکریٹری بھگوان سہائے کو 27 اور 29 دسمبر کو بھیجے گئے اپنے جواب میں مسجد سے مورتیاں ہٹوانے کو ایک خطرناک قدم قرار دیا اور ایسا کرنے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ ان خطوط میں ڈپٹی کمشنر نے یہ بھی تجویز کیا کہ بہتر ہوگا کہ فریقین دیوانی عدالت سے اپنا حق طے کروالیں۔ ڈپٹی کمشنر کے. کے. نیر کی شہ پر ایک شخص گوپال سنگھ وشارد کے ذریعہ 16/جنوری 1950ء کو دیوانی عدالت فیض آباد میں یہ دعویٰ دائر کروادیا کہ حکومت اتر پردیش و اس کے افسران کو حکم امتناعی کے ذریعہ منا کر دیا جائے کہ وہ عمارت نزاعی سے مورتیاں نہ ہٹوائیں اور ان کو پوجا اور درشن کرنے سے نہ روکیں۔ اس دعویٰ میں 16/جنوری 1950ء کو یک طرفہ طور پر جاری ہونے والے حکم امتناعی کے خلاف ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کونسل کی درخواست پر 19/جنوری 1950ء کو یہ تبدیلی کی گئی کہ جس طرح پوجا ہو رہی تھی (یعنی پجاریوں کے ذریعہ) اسی طرح پوجا کو جاری رکھا جائے اور مورتیوں کو نہ ہٹایا جائے۔ یہ حکم امتناعی سول جج کی عدالت میں 3/مارچ 1951ء کو Confirm ہوا اور اس کے خلاف دائر اپیل میں ہائی کورٹ کی ڈویژن بنچ نے 1955ء میں اپنے فیصلہ میں کہا کہ مقدمہ کا جلد فیصلہ کر دیا جائے۔

گوپال سنگھ وشارد کے مقدمہ کا نمبر 2/1950 میں دفعہ 80 ضابطہ دیوانی کا نوٹس نہ ہونے کی وجہ سے قانونی نقص تھا لہٰذا اسی طرح کا دوسرا دعویٰ رام چندر پرم ہنس داس کی طرف سے دائر کیا گیا جو مقدمہ نمبر 25/1950 کے طور پر درج ہوا۔ ان مقدمات میں حکومت اتر پردیش و ڈپٹی کمشنر فیض آباد یو این اوگرا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ کی طرف سے بیان تحریری داخل کرتے ہوئے کہا گیا کہ جائداد متنازعہ بابری مسجد کے طور پر جانی جاتی ہے اور بہت لمبے عرصہ سے مسلمان اس میں عبادت

کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور اس کا استعمال کبھی رام چندر جی کے مندر پر نہیں کیا گیا۔ ان جوابی دعوؤں میں یہ بھی کہا گیا کہ 23-22 دسمبر 1949ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی چوری سے اور غلط طریقے سے مسجد کے اندر رکھ دی گئی تھی۔

1950ء میں ایک تیسرا دعویٰ نرموہی اکھاڑہ کی طرف سے دائر ہوا جو سوٹ نمبر 26/1959 کے طور پر درج ہوا اور دسمبر 1961ء میں سنی وقف بورڈ اور 9 دیگر مسلمانوں کی طرف سے ایک چوتھا دعویٰ دائر کیا ہوا جو سوٹ نمبر 12/1961ء کے طور پر درج ہوا۔ اور اسی دعوے کو بعد میں عدالت نے لیڈنگ سوٹ قرار دیتے ہوئے باقی دعوؤں کو اس سے منسلک کر دیا۔

1964ء تک مقدمات کی سماعت متفرق امور کے فیصلوں کے بعد زبانی شہادت کی اسٹیج تک آ گئی لیکن 1965ء میں بابو پریہ دت رام کے انتقال کے بعد 1987ء تک یہ مقدمات رسیور کے تقرر کے مسئلہ پر ہی ٹلتے رہے۔ اور مقدمات کی فائلیں اس بابت ہائی کورٹ میں دائر اپیل کے سلسلہ میں ہائی کورٹ میں پڑی رہیں۔

1983ء میں کچھ ہندو تنظیموں نے ایک رام جنم بھومی یگیہ سمیتی کے نام سے مسجد کا تالا کھلوانے کے لئے تیاری شروع کی اور سیتا مڑھی سے اجودھیا تک ایک رتھ یاترا نکالی جو 1984ء میں اجودھیا سے ہوکر دہلی جا رہی تھی لیکن اسی دوران مسز اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے اس یاترا کو ملتوی کر دیا گیا۔ اور پھر 1985ء میں تالا کھلوانے کی تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔ جس میں اعلان کیا گیا کہ مارچ 1986ء میں لاکھوں ہندو اجودھیا پہنچ کر تالا توڑ دیں گے۔ اس وقت کے وزیر اندرونی سلامتی مسٹر ارن نہرو نے پہلے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ کی معرفت سنی وقف بورڈ کے چیئرمین جناب فرحت علی صاحب پر زور ڈال کر مقدمات کو واپس کرانے کی کوشش کی لیکن جب وہ اس کام کے لئے آمادہ نہ ہوئے تو اجودھیا کے ایک وکیل اومیش چند پانڈے کے ذریعہ صدر منصف فیض آباد کی عدالت میں ایک درخواست دلوا کر یہ ہدایت چاہی کہ عدالت مدّ عا علیہ کو ہدایت کرے کہ وہ پوجا اور درشن میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اس وقت کے منصف جناب ہری شنکر دوبے نے اس درخواست پر یہ آرڈر دیا کہ چونکہ متعلقہ فائلیں ہائی کورٹ میں طلب کی ہوئی ہیں لہٰذا فائل کے بغیر اس درخواست پر آرڈر ممکن نہیں ہے۔

30 /جنوری 1986ء کو اس آرڈر کے خلاف اومیش چندر پانڈے نے ضلع جج کی عدالت میں

اپیل دائر کر دی اگر چہ وہ کسی بھی مقدمے میں فریق نہیں تھے اس وقت کے ضلع جج فیض آباد شری کے. ایم. پانڈے نے مذکورہ اپیل پر 31/جنوری 1986ء کو یہ حکم دیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد ایس. ایس. پی فیض آباد کو پہلی فروری کے لئے طلب کر لیا جائے۔ اس طرح پہلی فروری کو جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی فیض آباد کے بیانات ضلع جج فیض آباد کی عدالت میں ہو رہے تھے تو مقدمے سے تعلق رکھنے والے کچھ مسلم فریقین وکلاء کو بھی اس کی خبر لگی اور فوری طور پر محمد ہاشم انصاری و محمد فاروق کی طرف سے مشتاق احمد صدیقی ایڈوکیٹ و محی الدین صدیقی ایڈوکیٹ نے ضلع جج کی عدالت میں درخواست دے کر فریق بننے کی خواہش ظاہر کی تا کہ وہ اپیل کی مخالفت کر سکیں۔ ضلع جج نے ان کی درخواستوں پر سوا چار بجے تک سنوائی کی اور چار بج کر چالیس منٹ پر ان کی درخواستوں کو خارج کرتے ہوئے اپیل کو منظور کر لیا اور اپنے فیصلے میں حکومت اتر پردیش و ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد وغیرہ کو یہ ہدایت دی کہ وہ فوری طور پر تالا کھول کر درشن و پوجا پر لگی پابندی ہٹا لیں۔ اس حکم کا فوری طور پر ضلع افسران کے ذریعہ موقع پر نفاذ کرا دیا گیا۔ اور مسجد میں لگے تالے توڑ کر پوجا اور درشن کی عام اجازت دے دی گئی جس کے لئے بھی سبھی انتظامات پہلے سے کیے جا چکے تھے یعنی پولیس اور پی. اے. سی کا معقول بندوبست اور آل انڈیا ریڈیو و دوردرشن کی ٹیموں کا موقع پر موجود رہنے کا انتظام پہلے سے ہو چکا تھا چنانچہ یکم فروری 1986ء کی شام پورے ملک و بیرونِ ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ بابری مسجد میں رکھی ہوئی مورتیوں کی پوجا و درشن کی عام اجازت دے دی گئی ہے۔

## مقدمے کے اصل فریق

پہلا مقدمہ یعنی سوٹ نمبر 2/1950 جو گوپال سنگھ وشارد نے داخل کیا تھا اس میں گوپال سنگھ وشارد کے مرنے کے بعد 1986ء میں راجیند ر سنگھ نے اپنے آپ کو گوپال سنگھ وشارد کا لڑکا بتا کر مدعی بنایا۔ اس میں پانچ مسلم فریق تھے جن میں سبھی کا انتقال ہو چکا ہے۔ لہٰذا سنی وقف بورڈ نے اپنے کو درخواست دے کر مدعی علیہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اتر پردیش سرکار، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، ایس. پی فیض آباد اور نرموہی اکھاڑا مدعی علیہم ہیں۔

دوسرا دعویٰ سوٹ نمبر 25/1950 پرم ہنس رام چندر داس نے داخل کیا تھا، جو انہوں نے 1990ء

میں واپس لے لیا۔ تیسرا دعویٰ سوٹ نمبر 26/1959 نرموہی اکھاڑا نے اپنے مہنت کے ذریعہ داخل کیا اس میں رسیور کے علاوہ سرکار اتر پردیش، ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ فیض آباد، ایس. پی. فیض آباد کے ساتھ تین مسلم فریق تھے جن کا انتقال ہوگیا اور صرف ایک مسلم فریق یعنی حاجی پھیکو کی جگہ ان کے لڑکے حاجی محبوب اور حاجی عبدالاحد مدعیٰ علیہ بنے ہیں اور محمد فاروق بھی ایک فریق ہیں۔ ان کے علاوہ سنی وقف بورڈ اور امیش چند پانڈے نے اپنے کو اس مقدمے میں مدعیٰ علیہم بنایا ہے۔

چوتھا مقدمہ سنی وقف بورڈ 9 دیگر مسلمانوں نے دائر کیا تھا جس میں اصل مدعیان میں صرف محمد ہاشم اور محمود احمد حیات ہیں، دیگر مدعیان کے انتقال کے بعد مولوی محمد قاسم کی جگہ حافظ محمد صدیق بہ حیثیت جنرل سکریٹری جمعیۃ العلماء ہند اتر پردیش بنے ہیں۔ اور شہاب الدین صاحب کی جگہ ضیاء الدین، وکیل الدین صاحب کی جگہ مولانا محفوظ الرحمٰن اور ظہور احمد صاحب کی جگہ فاروق احمد مدعیان ہیں۔ مدعیٰ علیہم میں پرم ہنس رام چندر داس، نرموہی اکھاڑا، اسٹیٹ آف یو. پی.، کلکٹر آف فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ فیض آباد، ایس. پی فیض آباد، پریسیڈینٹ آل انڈیا ہندو مہا سبھا، پریسیڈینٹ آریہ مہا پردیشک سبھا، پریسیڈینٹ آل انڈیا سناتن دھرم سبھا، رام دیال سرن، رمیش چندر ترپاٹھی، مہنت گنگا داس، مدن موہن گپتا و امیش چندر پانڈے مدعیٰ علیہم ہیں۔

پانچواں مقدمہ بھگوان شری رام وراجمان کے نام سے جسٹس دیوکی نندن اگروال صاحب نے دائر کیا تھا، جن کے انتقال کے بعد ان کی جگہ پر ڈاکٹر ٹھاکر پرساد ورما بطور Next Friend مدعی نمبر نمبر 3 کے قائم مقام ہوئے ہیں۔ اور مدعیٰ علیہم میں راجندر سنگھ، پرم ہنس رام چندر داس، نرموہی اکھاڑا، سنی وقف بورڈ، محمد ہاشم، محمود احمد، اسٹیٹ آف یو. پی.، کلکٹر آف فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ فیض آباد، ایس. ایس. پی فیض آباد، پریسیڈینٹ ہندو مہا سبھا، پریسیڈینٹ سناتن دھرم سبھا، دھرم داس، پنڈرک مسرا، رام دیال سرن، رمیش چندر ترپاٹھی، امیش چندر پانڈے، رام جنم بھومی نیاس بذریعہ شری اشوک سنگھل، شیعہ سینٹرل بورڈ آف وقف و حاجی محمد صدیق مدعیٰ علیہم ہیں۔

### بنیادی اسٹینڈ

ان دعوؤں میں مسلمانوں کا بنیادی موقف یہ ہے کہ بابری مسجد ایک تاریخی مسجد ہے جو بابر کے زمانے میں بنائی گئی تھی اور اس وقت سے مسلمان اس میں نماز ادا کرتے چلے آرہے تھے۔

اس مسجد کو 29 / دسمبر 1949ء کو قرق کر لیا گیا تھا کیونکہ 23 / دسمبر 1949ء کی رات اس میں زبردستی مورتیاں رکھ دی گئیں تھیں، لہٰذا عدالت مسلمانوں کے حق میں استقرار حق کی ڈگری دے کر مسجد کو مسلمانوں کے قبضہ میں واپس کر دے اور مورتیوں وغیرہ کو ہٹا کر مسجد پر مسلمانوں کا قبضہ کرائے۔

ان مقدمات میں جو تنقیحات بنائی گئی ہیں ان میں اہم تنقیحات درج ذیل ہیں:

① کیا عمارت بطور مسجد دکھائی گئی ہے کہ وہ واقعتا ایک مسجد ہے۔ جس کو بابر یا میر باقی نے تعمیر کیا تھا اور کیا یہ عمارت کسی ہندو مندر کو گرا کر بنائی گئی ہے۔ ایک ذیلی ایشو یہ بھی ہے کہ کیا زمانہ قدیم سے مسلمان اس میں نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں۔

② کیا مدعیان مقدمہ کی جائداد پر 1949ء تک قبضہ میں رہے ہیں۔

③ کیا مقدمہ میعاد کے اندر داخل ہوا ہے۔

④ کیا ہندوؤں نے قبضہ مخالفانہ کی بنیاد پر اپنے حقوق مکمل کر لیے ہیں۔

ان ہی تنقیحات سے تعلق رکھنے والی کچھ ذیلی تنقیحات بھی ہیں جن میں ایک تنقیح یہ بھی ہے کہ کیا جائداد متنازعہ شری رام چندر جی کی جنم بھومی ہے؟ اور کیا ہندو ہمیشہ سے یہاں پوجا کرتے چلے آرہے ہیں۔

مسلمانوں کے قبضے کے بارے میں بھی یہ تنقیح بنی ہے کہ کیا مدعیان نے قبضہ مخالفانہ کی بنیاد پر اپنے حقوق مکمل کر لیے ہیں؟ کیا مسلمان 1528ء سے اس جائداد پر قابض چلے آرہے ہیں۔

کچھ تنقیحات اس قسم کی بھی ہیں کہ کیا عمارت ہندوؤں کے مقامات پوجا وغیرہ سے گھری ہوئی ہے اور کیا عمارت میں کچھ کھمبوں پر ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کی تصویریں ہیں؟ اور کیا اس وجہ سے یہ عمارت مسجد نہیں ہو سکتی؟

کل 28 تنقیحات سنی وقف بورڈ کے دعوے میں بنائی گئی ہیں جن میں سے کچھ تنقیحات کی ذیلی تنقیحات بھی ہیں۔ اس میں ایک تنقیح یہ ہے کہ کیا عمارت کے گر جانے کے بعد بھی مسجد قائم رہ سکتی ہے؟

# مقدمے کے گواهان

## مدعی کے گواہان

| | نام | کب پیش ہوئے | گواہی کے صفحات |
|---|---|---|---|
| 1. | محمد ہاشم | 24/7/1996 سے 29/8/1996 تک | 197 صفحات |
| 2. | حاجی محبوب احمد | 17/9/1996 سے 7/10/1996 تک | 121 صفحات |
| 3. | فاروق احمد | 7/10/1996 سے 17/10/1996 تک | 117 صفحات |
| 4. | محمد یٰسین | 17/10/1996 سے 5/11/1996 تک | 79 صفحات |
| 5. | حافظ عبدالرحمٰن | 5/11/1996 سے 28/11/1996 تک | 64 صفحات |
| 6. | محمد یونس صدیقی ایڈوکیٹ | 28/11/1996 سے 21/4/1996 تک | 87 صفحات |
| 7. | حشمت اللہ انصاری | 5/12/1996 سے 25/1/1997 تک | 96 صفحات |
| 8. | عبدالعزیز | 20/1/1997 سے 28/1/1997 تک | 82 صفحات (2+82) |
| 9. | سید اخلاق احمد | 18/2/1997 سے 28/2/1997 تک | 132 صفحات (2+132) |
| 10. | مولانا محمد ادریس | 28/2/1997ء سے 30/4/1997ء تک | 115 صفحات |
| 11. | مولانا برہان الدین | 16/9/1997 سے 21/11/1997 تک | 92 صفحات |
| 12. | رام شنکر اپادھیائے | 20/1/1998 سے 20/4/1998 تک | 64 صفحات |
| 13. | ڈاکٹر سریش چندر مشرا | 12/7/1998 سے 20/11/1998 تک | 288 صفحات |
| 14. | جلیل احمد | 16/2/1999 سے 18/3/1999 تک | 99 صفحات |
| 15. | ڈاکٹر سشیل سریواستو سابق پروفیسر بڑودہ یونیورسٹی، حالیہ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی | 15/4/1999 سے 20/12/1999 تک | 313 صفحات |
| 16. | پروفیسر سورج بھان | 20/2/2000 سے 10/8/2000 تک | 201 صفحات |
| 17. | ظفر علی صدیقی | 20/10/2000 سے 8/1/2001 تک | 78 صفحات |
| 18. | پروفیسر سوئیرا جیسوال | 19/2/2001 سے 4/5/2001 تک | 163 صفحات |
| 19. | مولانا عتیق احمد | 19/5/2001 سے 10/7/2001 تک | 88 صفحات (3+81) |
| 20. | پروفیسر شیریں موسوی | 24/7/2001 سے 20/11/2001 تک | 147 صفحات (135+12) |
| 21. | ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی | 22/11/2001 سے 9/1/2002 تک | 98 صفحات |
| 22. | مولانا محمد خالد ندوی | 9/1/2002 سے 15/1/2002 تک | 48 صفحات |
| 23. | محمد قاسم انصاری | 16/1/2002 سے 6/2/2002 تک | 81 صفحات (2+79) |
| 24. | پروفیسر دھنیشور منڈل (11 بار کراس) | 25/2/2002 سے 5/3/2002 تک | 95 صفحات (8+87) |
| 25. | چودھری سبط محمد نقوی | 5/3/2002 سے 2/4/2002 تک | 52 صفحات |
| 26. | مولانا سید کلب جواد | 2/4/2002 سے 17/5/2002 تک | 98 صفحات (6+92) |
| 27. | پروفیسر شیریں رتناگر | 8/4/2002 سے 12/4/2002 تک | 103 صفحات |

(103 = 14+1+13+29+3+2/1 9+1/2 14) (1+1/14+1/12+14+1/4 1+4/3) چھ بار کراس

28. ڈاکٹر سیتارام رائے 22/4/2002 سے 14/5/2002 تک گیارہ دن 147 صفحات (7+140)

(147 = 17+17+8+54+44+7) بار کراس

## ہندوؤں کے گواہان

1. مہنت شری رام چندر داس 22/12/1999 سے 20/1/2002ء (11 دن) 151 صفحات

(151 = 20+51+46+14) (1+2/1 3+2/1 5+1)

2. دیوکی نندن اگروال 16/6/2001 سے 25/2/2002 تک (17 دن) 202 صفحات

(9+3+5) 46+56+70 = 202 صفحات

3. ڈاکٹر ایس پی گپتا، اجودھیا اور رام جنم بھومی کے ایک مصنف 28/6/2001 سے 14/6/2002 تک (لگاتار 11 دن)

(1-10+2/1+2/11) 135+10+21 =146 (نصف دن 6/10 اور نصف دن 6/14) (آرکیالولوجسٹ کو آتھر بک آن اجودھیا اینڈ رام جنم بھومی) 146 صفحات

4. شری ہری ہر پرساد تیواری — پوجا اور درشن کے گواہ
5. شری رامناتھ مشرا عرف بناری پانڈے — پوجا اور درشن کے گواہ
6. بھوسلہ پرساد ترپاٹھی — پوجا اور درشن کے گواہ
7. رام سورت تیواری — پوجا اور درشن کے گواہ
8. اشوک چندر چاتیا — آر ایس ایس کے ترجمان پانچ جنیہ کے رپورٹر
9. ڈاکٹر ٹھاکر پرساد ورما — تاریخ داں
10. ڈاکٹر کے. وی. رمیش — ماہر کتبات
11. ڈاکٹر ستیش چندر متل — پروفیسر آف ماڈرن ہسٹری

# بابری مسجد مقدمات اوران کی موجودہ حیثیت

از: مشتاق احمد (علیگ)

بابری مسجد کے تعلق سے اس وقت چار طرح کے مقدمات مختلف عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ ① الہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ میں ملکیت کے مقدمات ② سپریم کورٹ میں فوجداری کے مقدمات ③ سپریم کورٹ میں ہی توہین عدالت کے مقدمات اور ④ لبراہن کمیشن۔

ملکیت کے مقدمات لکھنؤ ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ میں زیر سماعت ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے گواہی مکمل ہو چکی ہے اور اب دوسرے فریق یعنی رام للا کی طرف سے گواہی چل رہی ہے۔ لبراہن کمیشن دہلی کے وگیان بھون میں جسٹس منموہن سنگھ لبراہن کی سربراہی میں چل رہا ہے۔ یہ کمیشن 1993ء میں قائم کیا گیا تھا۔ شروع میں کچھ سالوں تک یہ لکھنؤ میں چلا اس کے بعد اس کا صدر دفتر وگیان بھون میں منتقل ہو گیا۔ یہ کمیشن بابری مسجد مسماری کی وجوہات اور کون کون سے لوگ یا تنظیمیں ذمہ دار ہیں، جاننے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحقیقاتی حوالے مندرجہ ذیل ہیں:۔ (الف) ان حالات کی جانچ جن کے نتیجے میں بابری مسجد رام جنم بھومی ڈھانچہ مسمار ہوا (ب) ان افراد یا تنظیموں کی نشاندہی جو اس مسماری کے ذمہ دار تھے۔ (ج) حکومت یا حکومتی عملہ کا ہاتھ اور (د) میڈیا کے لوگوں پر حملے اوران کے سامان اور پیسوں کی چوری کے بارے میں جانچ کرنا۔

لبراہن کمیشن میں ڈیڑھ سو سے زائد لوگوں کی گواہی ہو چکی ہے۔ جن اہم لوگوں کی گواہی ہو چکی ہے ان میں سماج وادی پارٹی کے سربراہ جناب ملائم سنگھ یادو، مشہور گاندھیائی مس نرملا دیش پانڈے، (جو اپنا جتھا لے کر 6 دسمبر 1992ء کو بابری مسجد بچانے گئی تھیں اور جو مسماری کی عینی شاہد بھی ہیں)، اس وقت کے ہوم سکریٹری مسٹر مادھو گوڈ بولے، سابق وزیر اعظم وی. پی. سنگھ، چندر شیکھر، مغربی بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ جناب جیوتی باسو، مسٹر مرلی منوہر جوشی، مس اوما بھارتی، مسٹر لال کرشن اڈوانی، آر. ایس. ایس کے سربراہ مسٹر کے. ایس. سدرشن، بی. بی. سی کے مارک ٹولی اور ستیش جیکب وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں یہ بات قابل قبول ذکر ہے کہ 1993ء سے لے کر آج تک مرکزی حکومت کا تعاون کمیشن کو حاصل نہ ہوا۔ چاہے وہ کانگریس کا دور ہو یا جنتا دل کا یا موجودہ بی. جے. پی کا۔ مرکزی حکومت اور خاص طور سے سی. بی. آئی نے کمیشن کو اہم کاغذات اور 6 دسمبر کی

ویڈیو گرافی کو دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اب تک جتنے لوگوں کی گواہی ہوئی وہ فریقین کے گواہ نہیں تھے بلکہ کمیشن نے ازروئے خود طلب کئے تھے۔

6 دسمبر 1992ء کو مسجد کی مسماری کے سلسلے میں توہین عدالت کا مقدمہ سپریم کورٹ میں زیرالتوا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حکم امتناعی کے باوجود مسجد مسمار کر دی گئی۔ اس لئے جناب مرلی منوہر جوشی، مس اوما بھارتی، مسٹر ایل۔ کے۔ ایڈوانی، مسٹر کلیان سنگھ اور اُس وقت کے حکومت اتر پردیش کے کچھ اعلیٰ افسروں کے خلاف سپریم کورٹ میں توہین عدالت کے مقدمات قائم ہوئے۔

9 سال ہو گئے لیکن یہ مقدمات یوں ہی پڑے ہوئے ہیں۔ کتنی بار جسٹس سے درخواست کی گئی کہ ان مقدمات کی سنوائی جلد کر لی جائے لیکن مایوسی ہاتھ آئی۔ اگر چہ اس مدت میں بے شمار توہین عدالت کے مقدمات کا نمٹارہ ترجیحی بنیاد پر کیا گیا۔ جس میں یہ مقدمات قابل ذکر ہیں۔ ① کرناٹک کے آئی۔ اے۔ ایس افسر یا سور پوپلے جنہیں توہینِ عدالت کا مرتکب پا کر ایک ماہ کی سزا سنائی گئی۔ ② مسٹر وی سی مشرا جو بار کونسل کے صدر تھے ③ ارن دھتی رائے کے خلاف توہین عدالت کا معاملہ اور ④ حال ہی میں کرناٹک کے چیف منسٹر مسٹر ایس۔ ایم۔ سری کرشنا کے خلاف۔

اب ایک اور مقدمے کا تفصیلی ذکر بہت ضروری ہے اور یہ مقدمہ بھی سپریم کورٹ میں ہے۔ بابری مسجد مسماری کے سلسلے میں 49 لوگوں کے خلاف فوجداری کے مقدمات قائم ہیں۔ جن میں اہم نام یہ ہیں: مسٹر ایل۔ کے۔ ایڈوانی، مسٹر کلیان سنگھ، مسٹر مرلی منوہر جوشی، مس اوما بھارتی، مس سادھوی رتمبھرا، مسٹر کلیان سنگھ، مسٹر بال ٹھاکرے، مسٹر ونے کٹیار، اچاریہ گری راج کشور، اچاریہ دھرمیندر، اسی وقت کے ڈی۔ ایم۔ آر۔ این سریواستوا اور اس وقت کے ایس پی مسٹر ڈی بی رائے وغیرہ۔ فوجداری کے ان مقدمات کی تفتیش سی۔ بی۔ آئی نے کی اور لکھنؤ کی بی۔ بی۔ آئی کی خصوصی عدالت میں فرد جرم داخل کی۔ اسپیشل جج مسٹر جے۔ پی۔ سریواستو نے فرد جرم کو قابل کارروائی سمجھ کر سبھی 49 ملزموں کے خلاف سمن جاری کر دئے۔ قابل ذکر ہے اب صرف 48 ملزمان رہ گئے ہیں۔ کیونکہ ایک ملزمہ مسز وجے راجے سندھیا کا انتقال ہو چکا ہے۔ کچھ ملزمان کی طرف سے اسپیشل جج کے اس حکم کے خلاف لکھنؤ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ وہاں کئی سالوں تک یہ اپیل چلتی رہی اور آخر میں ایک معمولی تکنیکی بنیاد پر لکھنؤ ہائی کورٹ کے جسٹس جگدیش بھلاّ نے 12 فروری 2001ء کو اپیل منظور کرتے ہوئے یہ کہا کہ ملزمان کے خلاف فوجداری کا مقدمہ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے

کہ جن لوگوں کو تکنیکی بنیاد پر غیر قانونی طریقے سے بری کیا گیا وہ لوگ بی۔ جے۔ پی، آر۔ ایس۔ ایس۔ اور شیوسینا وغیرہ کے اہم لوگ ہیں۔

لکھنؤ ہائی کورٹ میں اس مقدمہ میں صرف دو فریق تھے۔ سی۔ بی۔ آئی اور حکومت اتر پردیش، اس وقت کے وزیر اعلیٰ مسٹر راج ناتھ سنگھ نے دوبارہ نوٹیفکیشن جاری کرنے یا سپریم کورٹ میں اپیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سی۔ بی۔ آئی بھی خاموش رہی۔ جن اہم ملزمان کو بری کیا گیا تھا ان کے خلاف مقدمہ دوبارہ چلانے کے لئے صرف دو ہی طریقے تھے یا تو دوبارہ نوٹیفکیشن جاری کیا جائے یا سپریم کورٹ میں جسٹس بھلا کے فیصلے کے خلاف اپیل کی جائے۔ سپریم کورٹ کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہی اپیل کر سکتا ہے جو ہائی کورٹ میں فریق رہا ہو۔ ہائی کورٹ میں فریق صرف حکومت اتر پردیش اور سی۔ بی۔ آئی تھی اور یہ دونوں سپریم کورٹ میں اپیل کرنے سے انکار کر چکے تھے۔ ایسی صورت میں ایک ہی غیر معمولی راستہ تھا کہ کوئی تیسرا فریق سپریم کورٹ میں اپیل کرے۔ اس سلسلے میں سپریم کورٹ کا اصول یہ ہے کہ اگر سپریم کورٹ چاہے اور مناسب سمجھے تو ایک تیسرے فریق کو بھی سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ اس اصول کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک اپیل راقم نے فائل کی۔ دوسری اپیل اسلم بھورے کی طرف سے فائل ہوئی اور تیسری اپیل جناب کلدیپ نیر، سوامی اگنی ویش، ممبئی کی مس ٹیشا سنیل داد وغیرہ کی طرف سے دائر کی گئی۔ ان ساری اپیلوں پر سپریم کورٹ نے نوٹس جاری کر دیے ہیں۔ مس مایاوتی کی حکومت نے نیا نوٹیفکیشن جاری کرنے کے سلسلے میں غور وغوض کرنے کے لئے آٹھ گھنٹے کی مہلت سپریم کورٹ سے مانگی تھی۔ آٹھ گھنٹے گذر جانے کے بعد حکومت اتر پردیش کی طرف سے ایک حلف نامہ سپریم کورٹ میں داخل کیا گیا جس میں نیا نوٹیفکیشن جاری کرنے سے معذوری ظاہر کی گئی ہے۔ سینئر ایڈوکیٹ مسٹر او پی شرما اور راقم نے حکومت اتر پردیش کے حلف نامہ کا جواب داخل کیا۔ سپریم کورٹ میں سماعت کے دوران یہ انکشاف کیا گیا کہ یو۔ پی ہائی کورٹ نے ان ملزمان کے خلاف سنوائی کے لیے رائے بریلی مجسٹریٹ کی عدالت میں ایک بنچ قائم کی ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومت یو۔ پی۔ کی اس درخواست کو قبول کر کے ان ملزمان کے خلاف رائے بریلی کی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم جاری کیا۔ ملزمان کی پوری کوشش تھی کہ سپریم کورٹ میں یہ اپیل خارج ہو جائے کیونکہ اگر فوجداری کے مقدمات دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں تو اگلے عام چناؤ میں پرچہ نامزدگی بھرنے کے وقت مناسب خانہ میں ان کو

یہ لکھنا پڑے گا کہ ان کے خلاف تعزیراتِ ہند کے فلاں فلاں دفعات کے تحت مقدمات قائم ہیں۔ آج سچائی، حق، جمہوریت اور انصاف کے علم بردار ہندو بھائی ہمارا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ عام مسلمانوں کو چاہئے کہ فون کے ذریعے یا خط کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کریں اور مقدمے کی پیروی میں دلچسپی لیں، بابری مسجد کے ملزموں کو ضرور سزا ملے گی۔

## زیر سماعت مقدمات اور ان کی نوعیت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ 6؍دسمبر 1992 کی مسماری کے سلسلے میں توہین عدالت کا اصل مقدمہ ابھی سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ 6؍دسمبر 1992ء کو اتوار کا دن تھا۔ دو بجے دن میں بی. بی.سی کے ذریعے جناب محمد اسلم کو معلوم ہوا کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی لیکن تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔ انہوں نے فوراً ایک درخواست چیف جسٹس کے گھر پر دی اور چیف جسٹس کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس اور جسٹس جی. این. رے پر مشتمل بنچ کی ایک خصوصی بیٹھک ہوئی۔ اٹارنی جنرل کی درخواست پر اس بیٹھک کو ساڑھے آٹھ بجے شام کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

ساڑے آٹھ بجے خصوصی بیٹھک ہوئی سارے فریقین کے وکلاء موجود تھے۔ کلیان سنگھ اور حکومت اتر پردیش کے سینئر وکیل جناب کے کے وینوگوپال حاضر ہوئے اور کہا کہ "میں شرم سے اپنا سر جھکاتا ہوں"۔ "I have my head in shame"

اس وقت تک کلیان سنگھ استعفیٰ دے چکے تھے اور صدارتی راج قائم ہو چکا تھا۔ فاضل ججوں نے افسوس کا آرڈر پاس کیا اور لکھا کہ "نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے اور حساس معاملہ میں ایک آئینی حکومت اپنے فرائض انجام نہ دے سکی۔" IA No. 14 IN C.P. No. 91/1992

توہین عدالت کا یہ مقدمہ جناب محمد اسلم عرف بھورے نے آٹھ افراد کے خلاف دائر کیا ہے جن کے نام ہیں: ❶ مسٹر ایم. ایم. جوشی، ❷ مسٹر ایل. کے. اڈوانی، ❸ مسٹر اشوک سنگھل، ❹ مسٹر ونے کٹیار، ❺ اچاریہ گری راج کشور، ❻ مسٹر موریشور ساوے، ❼ سادھوی رتمبرا اور ❽ مس اوما بھارتی۔ بتاریخ 4؍فروری 1994ء کو سپریم کورٹ نے ان سب کے نام نوٹس جاری کر دیئے۔ نوٹس سب پر لاگو ہو چکا ہے۔ پانچ افراد کی طرف سے جوابی حلف نامہ بھی داخل ہو چکے ہیں۔ جوابی حلف نامے سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ اپنے دفاع میں جو دلیلیں پیش کی گئیں ہیں، وہ نہایت کمزور، ناقابل اعتبار اور پھسپھسی ہیں۔

IA No. 7 IN C.P. No. 97/1992

سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ اور چھ افسران کے نام نوٹس خود سے جاری کئے ہیں۔ان چھ افسروں کے نام ہیں: ❶ مسٹر یو.بی. تیواری، ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ❷ مسٹر آر.این. شریواستوا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ، فیض آباد، ❸ مسٹر پربھات کمار، پرنسپل سکریٹری، حکومت اتر پردیش، ❹ مسٹر گویش نندن، جوائنٹ سکریٹری حکومت اتر پردیش، ❺ مسٹر آلوک سنہا، ٹورزم سکریٹری حکومت اتر پردیش ❻ مسٹر شیکھر اگروال، اسپیشل سکریٹری حکومت اتر پردیش۔

ان سب پر 6/دسمبر کی مسماری کے سلسلے میں وجہ بتاؤ نوٹس جاری ہوئے ہیں کہ کیوں نہیں ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جائے۔

سی.آئی.اے (C.I.A.) میں عدالت سے یہ بھی استدعا کی گئی ہے کہ بابری مسجد کی اسی جگہ تعمیر کے لئے حکم صادر فرمایا جائے۔

18/1993 توہین عدالت کے سلسلے میں محمد اسلم عرف بھورے صاحب نے ❶ وزیر اعظم جناب پی.وی. نرسمہا راؤ، ❷ ہوم منسٹر ایس. پی. چوہان، ❸ ایم.کے. جیکب، ❹ مسٹر رام لال راہی ❺ مسٹر راجیش پائلٹ ❻ مسٹر پی ایم سعید ❼ چیف سکریٹری ٹی.ایس. آر سبرامنیم اور ❽ جناب ارجن سنگھ کو فریق بنایا ہے۔ان لوگوں پر یہ الزام ہیکہ مسماری ان کی ملی بھگت سے ہوئی۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اپنے فرائض منصبی سے غافل رہے۔صدارتی راج قائم ہو جانے کے بعد ریاست کا نظم و نسق مرکزی حکومت کے ہاتھ میں آیا اور عارضی مندر بنانے کی مہلت جان بوجھ کر دی گئی وغیرہ۔

توہین عدالت کے سارے مقدمات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور محمد اسلم بھورے والے مقدمہ کو لیڈنگ مقدمہ قرار دیا گیا ہے۔یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریفرینس کے ساتھ محمد اسلم کے اس رٹ پٹیشن کا بھی فیصلہ ہوا جس میں انہوں نے اجودھیا حصول اراضی ایکٹ کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا تھا۔ دراصل یہ محمد اسلم کے رٹ کا ہی نتیجہ تھا کہ سپریم کورٹ نے ایکٹ کی اس دفعہ کو غیر آئینی قرار دے دیا جس کی رو سے بابری مسجد کے متعلق ملکیت کے سارے مقدمات کو سوخت (Abate) کر دیا گیا تھا وہ از سر نو زندہ ہو گئے۔

## سپریم کورٹ کے لئے چیلنج

توہین عدالت کے مقدمات سپریم کورٹ کے لئے ایک زبردست چیلنج ہیں۔ دراصل انہیں

مقدمات کے فیصلوں پر فسطائی طاقتوں کے مستقبل کے لائحہ عمل کا دارومدار ہے۔ خود سپریم کورٹ نے لکھا ہے کہ بابری مسجد پر حملہ صرف مسجد پر حملہ نہیں تھا بلکہ قانون کی بالادستی اور آئین پر حملہ تھا۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد پورے ہندوستان میں فساد پھوٹ پڑا۔ پرامن احتجاج کرتے ہوئے مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئیں، انہیں ٹاڈا میں بند کر دیا گیا۔ کروڑوں روپے کی املاک کا نقصان ہوا۔ بیرون ملک میں ہندوستان کی جگ ہنسائی ہوئی۔ جن لوگوں نے مسجد کو شہید کیا ان کا جرم قابل معافی نہیں۔ اگر ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ہوا تو مستقبل میں قانون کی بالادستی اور آئین ہند کا خدا حافظ۔ قانون کی معقولیت پر تعداد اور اکثریت کا غلبہ ہوگا۔ سپریم کورٹ نے ریفرنس کے فیصلے میں لکھا ہے:

> ''اجودھیا کا سانحہ ایک طوفان ہے جو گزر جائے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے سپریم کورٹ کے وقار اور عزت میں کمی نہیں آنے دی جائے گی۔''

ایسا طوفان پھر نہ آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ بابری مسجد کے مجرموں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ جن لوگوں نے اصل ڈھانے کا کام کیا ان سے بھی بڑے مجرم اور قصوروار وہ لیڈر ہیں جنہوں نے مسماری کے لئے انہیں اکسایا اور اپنی جذباتی تقریروں سے انہیں پاگل کر دیا۔ ان سارے لیڈران پر توہین عدالت کا مقدمہ زیر سماعت ہے۔

## پاکستانی اور نیپالی سپریم کورٹ

پاکستانی سپریم کورٹ نے نواز شریف حکومت کے صدر اسحاق خان کے ذریعہ برخاست کیے جانے کے فیصلے کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے انہیں بحال کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس پر عمل ہوا اور نواز شریف کی حکومت پھر بحال ہوگئی۔ اسی طرح کی جرأت کا مظاہرہ نیپالی سپریم کورٹ نے کیا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستانی سپریم کورٹ بھی بابری مسجد کے مجرموں کو ایسی سبق آموز اور سخت سزا دے کہ مستقبل میں کوئی بھی سیاسی لیڈر عدالت کی حکم عدولی اور توہین کرنے کی ہمت نہ کر سکے اور سیاسی فائدے کے لئے عبادت گاہ کی طرف نظر اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔

## بنارس کی گیان واپی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ

1992ء سے ہی بنارس کی گیان واپی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ پر خطرات کے بادل منڈلا رہے

تھے۔فسطائی طاقتیں اعلانیہ کہہ رہی تھیں کہ بنارس کی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ بھی ان کے نشانہ پر ہے۔محمد اسلم عرف بھورے نے جن کی ایک معمولی سی دوکان ہے، اس کے سلسلہ میں تین رٹ پٹیشن دائر کئے جن میں سپریم کورٹ نے مسجد اور عیدگاہ کی حفاظت کے لئے بہت موزوں اور مناسب حکم صادر فرمایا۔ رٹ پٹیشن نمبر 611 بابت 1992ء میں سپریم کورٹ نے مورخہ 24/اکتوبر 1993ء کو ایک آرڈر پاس کیا جس میں مرکزی حکومت اور یو۔پی کی صوبائی حکومت کو عبادت گاہ تحفظ ایکٹ کے تحت مسجد اور عیدگاہ کی حفاظت کے لئے ہدایت دی۔ رٹ پٹیشن نمبر 148 بابت 1995ء میں سپریم کورٹ نے ایک آرڈر پاس کیا جس میں آرڈر بتاریخ 24/اکتوبر 1993ء کی توثیق کی۔ رٹ پٹیشن نمبر 148 بابت 1995 فروری 1995 میں دائر کیا گیا۔ جب شیوراتری اور عید کے تہوار میں صرف چھ دنوں کا فرق تھا۔ رٹ پٹیشن نمبر 541 بابت 1995ء اس وقت دائر کیا گیا جب وی۔ایچ۔پی اور بی۔جے۔پی وغیرہ کے کاسیوکوں نے 17/اگست 1995ء کو متھرا میں کرشن جنم استھان کے قریب مہایاجنا کا اعلان کیا۔ سپریم کورٹ نے 17/اگست 1995ء کو یک طرفہ حکم نامہ جاری کیا جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بنارس کی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ کے تحفظ کے لئے ہدایت کی اور محمد اسلم عرف بھورے، مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کو کہا کہ وہ جب بھی مسجد یا عیدگاہ کے سلسلے میں خطرہ محسوس کریں سپریم کورٹ سے رجوع کر سکتے ہیں

بنارس کی مسجد اور متھرا کی عیدگاہ کے سلسلے میں سپریم کورٹ نے جتنے آرڈر پاس کیے ہیں ان کی پاسداری اور احترام اس بات پر منحصر ہوگا کہ بابری مسجد کے سیاسی مجرموں کے تئیں سپریم کورٹ توہین عدالت کے مقدمات میں کیسا رویہ اختیار کرتا ہے۔

## سپریم کورٹ کی اپنی نظیر

جے باسودیون (آئی۔اے۔ایس) کو توہین عدالت کا مجرم قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے لکھا ہے:

''قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ عدالت کی حکم عدولی کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو عوام پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ اگر عدالت کے حکم کا مذاق اُڑایا جائے اور اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو عوام کا اعتماد عدلیہ پر سے اُٹھ جائے گا۔ اور لوگ

اپنے تنازعات کے فیصلے کے لئے وقت، پیسے اور توانائی صرف کرنے سے گریز کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے سڑکوں پر پیسے اور طاقت کی بنیاد پر فیصلہ کریں گے۔ طاقتور کی جیت ہوگی اور غریب اور کمزور کی ہار۔ قانون کی حکمرانی اور سماجی انصاف کے لیے یہ عظیم قاتل ثابت ہوگا۔

عدالت کے احترام کو نافذ کرنے کے لئے سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ اور مسٹر وجے واسو دیون کے توہین عدالت کے مقدمات میں بہت ہی سخت اور سنہرے قانونی اصول مرتب کیے ہیں۔ اقوام عالم کی نگاہیں سپریم کورٹ پر لگی ہوئی ہیں کہ سپریم کورٹ بے یار و مددگار بابری مسجد کو مسمار کرنے اور کرانے والے سیاسی مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔

(افکار ملی، نئی دہلی، بابری مسجد نمبر)



# لبراہن کمیشن: برائے تحقیق اسباب انہدام بابری مسجد

از: حکیم ظل الرحمٰن، رکن پرسنل لاء بورڈ

## 11/جون 1993 سے اب تک کا سفر اور اس کی بنیاد

مثل مشہور ہے کہ آنسو پونچھنے کے لئے بھی ایک رومال اور ایک پونچھنے والے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ حادثے کی فراموشی کا عمل آسانی سے ہو سکے اور فریقین کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول ہو جائے اور یہاں تو یہ عمل اب عام ہو چلا ہے کہ ؎

روز جلتے رہے آشیاں     روز تحقیق ہوتی رہی

بابری مسجد، خدا کا گھر، بندوں کی عبادت گاہ، عجز و نیاز کا مسکن، خدا سے بے خوف لوگوں کے ذریعہ شہید کر دی گئی۔ 6/دسمبر 1992ء وہ منحوس دن ہے جس دن شیطان کے بندے اپنے اس عمل پر خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ دن ہندو مذہب کے عقیدت مندوں کی جو اہنسا پرمودھرم کے ماننے والے ہیں کے لئے تکلیف کا دن تھا۔ ہندو مذہب کی تشدد پسندی کا یہ مظاہرہ سراسر ہندو مذہب کی تعلیمات کے منافی تھا۔ مگر ؎

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت     نہیں کام آتی دلیل اور حجت

یہ سب حکومت ہند کے ذمہ داران، حکومت اتر پردیش کی ایماء اور منصوبے کے تحت ہوا اور اس نے ہندو مذہب کی روایات کو پامال کر دیا۔

حالات پر مرہم رکھنے کے لیے اور اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لئے مرکزی حکومت نے ایک کمیشن تحقیقات کے نام پر قائم کر دیا گیا اور جسٹس لبراہن جو آندھرا ہائی کورٹ کے جسٹس تھے اور پھر چیف جسٹس بنائے گئے کے سر پر یہ تاج رکھ دیا گیا۔ جسٹس لبراہن کی اپنی ہائی کورٹ کی مستقل مصروفیات بھی برقرار رہیں، نتیجہ میں ہر ماہ میں دو دن یہ نشست ہوتی تھی۔

اس کمیشن کے قیام کا نوٹیفکیشن 11/جون 1993ء کو پی.وی. نرسمہا راؤ وزیر اعظم ہند کے دور حکومت میں جاری ہوا۔ حکومت اگر نیک نیت ہوتی تو وہ کسی بھی ریٹائرڈ ہائی کورٹ کے جج کو کمیشن کا چیئرمین بنا سکتی تھی۔ تاکہ تحقیقات مسلسل اور جلد ہو سکے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جسٹس لبراہن کے اپنے

معمولات، فرائض بدستور برقرار رہے اور ابتداءً کمیشن کی نشست لکھنؤ میں ہوتی تھی تو ان کو حیدر آباد سے لکھنؤ آنا پڑتا تھا۔ اور وہ بھی صرف ایک دن کی کارروائی کی خاطر۔

## تحقیقات کے Issues

① رام جنم بھومی ربابری مسجد احاطہ میں 6ردسمبر 1992ء کے ڈھانچے کا انہدام کس طرح عمل میں آیا۔

② چیف منسٹر اراکین وزارت، سرکاری افسران یو. پی و دیگر انفرادی حضرات، تنظیموں اور انجینئر کا رام جنم بھومی بابری مسجد کے ڈھانچے کے انہدام میں کیا رول رہا۔

③ ان حفاظتی خامیوں کی نشاندہی جن کی وجہ سے حکومت اتر پردیش کو انتظامات کے سلسلے میں دی گئی ہدایت کے باوجود رام جنم بھومی ربابری مسجد احاطہ اور فیض آباد کے واقعات 6ردسمبر 1992ء کو ظہور پذیر ہوئے۔

④ 6ردسمبر 1992ء کو میڈیا اور اخبارات کے نمائندوں پر ہوئے حملے کے حقائق اور سیاق وسباق جو رام جنم بھومی یا بابری مسجد احاطہ میں ظہور پذیر ہوئے۔

⑤ اس مسئلہ کے متعلق کوئی بھی دوسرا عنوان جس کا ذکر انکوائری میں ضروری سمجھا جائے۔

کمیشن کے قیام کے خلاف ایک رٹ پٹیشن کی بنا پر دو سال تک کمیشن کی کاروائی معطل رہی۔ پہلے اسکی کاروائی لکھنؤ میں ہوتی رہی اور اب تقریباً تین سال سے وگیان بھون دہلی میں ہوتی ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ اس کا فریق ہے۔

کمیشن نے ابتدائی نوٹس میں حکم دیا کہ جو حضرات انکوائری کے مندرجہ بالا موضوعات سے متعلق واقفیت رکھتے ہوں اپنے حلفی بیانات کمیشن کو پیش کریں۔ اگر یہ حلف نامے انگریزی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ہوں تو ان کا مصدقہ انگریزی ترجمہ بھی شامل ہونا چاہئے۔

اس ضمن میں 6ردسمبر 1992ء کو موصولہ ڈیوٹی پر موجود افسران کے حوالوں کی تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً سو سے زائد گزیٹڈ افسران ڈیوٹی پر تھے جن میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ مخصوص نظریات کے لوگوں کو مختلف جگہوں سے بلا کر ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ اور خود اپنے ضلع فیض آباد کے ذمہ داران کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

پولیس افسران گزیٹڈ رینک کے 65 تھے۔

فیض آباد کے صرف چار افسران وہ بھی نیچے کے ڈی.ایس. پی درجہ کے ورنہ غازی آباد اور بہار تک سے بلائے گئے افسران میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔

دیگر گزیٹیڈ افسران 33۔

دہلی تک سے بلائے گئے افسران میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ پبلک حلف نامے، جن کی کاپیاں دفتر بورڈ میں موجود ہیں۔

سوامی سچانند (بی.جے.پی)، اشوک سنگھل (بی.جے.پی)، کلراج مشرا (بی.جے.پی)، مہنت چندر داس (بی.جے.پی) کمار منگلم منسٹر حکومت ہند، ارجن سنگھ سابق منسٹر کانگریس، جتیندر ناتھ کیسوانی ایڈوکیٹ، پنڈت مکھناتھ شکل مجاہد آزادی، موریشور ساورے شیو سینا، ملائم سنگھ سابق چیف منسٹر یو پی۔

## مسلمان حضرات جن کے حلف نامے داخل ہوئے

محمد اسلم بھورے اجودھیا، محمد یونس صدیقی ایڈوکیٹ اجودھیا، محمد ہاشم اجودھیا، محمد ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ، عبدالحکیم صاحب، مبین اللہ صاحب، شیخ جمن، محمد شیرانی، محمد قاسم انصاری، ڈاکٹر محمد اسمٰعیل فاروقی، غلام محمود بنات والا، سید شہاب الدین، دوران کاروائی ایک مفصل حلف نامہ اس خاکسار نے بھی داخل کیا۔

## دیگر شہادتیں

اب تک تقریباً ایک سو تاریخوں پر شہادتیں قلم بند ہو چکی ہیں، ان میں چند شہادتیں بہت اہم ہیں۔ ① شری پربھات کمار جو اس وقت یو.پی. میں چیف سکریٹری تھے۔ پھر وزیر اعظم کے دفتر میں سکریٹری رہے اور اب جھارکھنڈ کے گورنر ہیں۔

دوسری شہادت شری ترپاٹھی کی ہے جو اس وقت ڈائریکٹر جنرل پولیس یو.پی. تھے۔ تیسری شہادت مسز نرملا دیش پانڈے کی، چوتھی شہادت مسٹر سنجے کاؤ ایڈیٹر اسٹیٹسمین دہلی۔ اور پانچویں شہادت مسز روچرا گپتا جرنلسٹ یو.این.آئی کی ہے۔ سب سے اہم شہادت مسٹر ونئے کٹیار کی ہے

جنہوں نے اقبال کیا ہے کہ رام جی نے حکم دیا تھا اس لیے ہم نے مسجد توڑ دی۔

مسٹر پربھات کمار صاحب نے اس حادثہ کی تمام تر ذمہ داری چیف منسٹر مسٹر کلیان سنگھ پر ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اجودھیا کے معاملہ میں تمام اختیارات چیف منسٹر مسٹر کلیان سنگھ نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ہم لوگوں سے رابطہ کے لیے وہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ ہم نے صبح ہی ان کو بتایا کہ مجمع کی کثرت پر بغیر فائرنگ کے کنٹرول نہیں ہو سکتا مگر فائرنگ کی اجازت سے انکار کر دیا گیا۔ ساڑھے بارہ بجے جب اطلاع ملی کہ ایک گنبد شہید کر دیا گیا ہے اور فائرنگ کے بغیر کنٹرول کرنا ناممکن ہے تب بھی انہوں نے فائرنگ کی اجازت نہیں دی۔ شام پانچ بجے جب ہم نیان کو اطلاع دی کہ پوری مسجد شہید کر دی گئی اور مجمع دس لاکھ سے اوپر ہے بغیر فائرنگ کے مجمع کو منتشر کرنا ممکن نہیں ہے تب بھی فائرنگ کی اجازت نہیں ملی۔ سینٹرل ریزرو فورسیز کو تقریباً چھ کلومیٹر دور رکھا گیا تھا اور لوگوں نے ان کے راستے مسدود کر رکھے تھے۔ ہم وزیر اعلیٰ اور دوسرے متعلقہ وزراء کو پل پل کی خبر دے رہے تھے مگر ان کا اصرار تھا کہ بغیر فائرنگ کے ہی کنٹرول کیا جائے۔ اصل میں ان کے اس بیان کا پس منظر کلیان سنگھ کا بی۔ جے۔ پی۔ سے علیحدہ ہونا ہے ورنہ یو۔ پی کا چیف سکریٹری ایڈمنسٹریشن کا بھی مختار ہوتا ہے اور پربھات کمار صاحب خود بھی فائرنگ کی اجازت دے سکتے تھے۔

دوسرے اہم گواہ ترپاٹھی ہیں جو اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور اس وقت یو۔ پی۔ میں ڈائریکٹر جنرل پولیس تھے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ ہم لوگوں نے جو حفاظتی تدابیر تحریر کی تھیں ان کو منظوری نہیں ملی پھر بھی پولیس نے بابری مسجد کے چاروں طرف سپاہیوں کی تین صفیں قائم کی تھیں اور صرف ایک ہی جگہ سے آمد و رفت کا راستہ چھوڑا تھا۔ اور ان کی اطلاع کے مطابق پہلا جتھہ زیادہ سے زیادہ دو سو افراد کا تھا۔ جو احاطہ میں داخل ہوا پولیس نے دیدہ و دانستہ طور پر ان کو نہیں روکا اور جب ایک جتھہ داخل ہو گیا تو اس نے پولیس کے نظام کو تتر بتر کر دیا اور پھر تمام مجمع اندر داخل ہو گیا۔ ہم لوگ چیف منسٹر کلیان سنگھ، لال جی ٹنڈن، برہم دت دویدی، راجند کمار گپتا جو منسٹر صاحبان اجودھیا مسئلہ کے ذمہ دار تھے سے برابر رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ پیرا ملٹری کی 25 کمپنیاں ترپاٹھی صاحب کی سفارش پر اجودھیا بھیجی گئی تھیں مگر ان کا استعمال ذمہ داران ضلع نے نہیں کیا اور ان کو شہر سے بہت دور رکھا۔ اس سے پہلے تو کلیان سنگھ کسی مرکزی فورس کو منگانے کے سخت مخالف تھے۔

ان حضرات کے علاوہ مشہور گواہوں میں اوما بھارتی، لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، نرسمہا راؤ، جیوتی باسو سابق وزیر اعلیٰ بنگال، ارجن سنگھ، آر.ایس.ایس کے چیف سدرشن، ونے کٹیار، (بجرنگ دل) موریشور ساوے (شیوسینا) گری راج کشور (وی.ایچ.پی) وی پی سنگھ، شریمتی نرملا دیش پانڈے، سنجے کاؤ ایڈیٹر اسٹیٹسمین شامل ہیں۔

کلیان سنگھ باوجود مختلف احکامات کے حاضر نہیں ہوئے اور ہائی کورٹ میں استثنیٰ حاضری کی درخواست دے دی۔

اوما بھارتی کا بیان تو عجیب وغریب ہے کہ وہ تو اس وقت سرجو ندی کے کنارے تھیں۔

لال کرشن اڈوانی کا بیان ہے کہ حادثہ ان کی زندگی کا المناک ترین حادثہ ہے۔ ہم تو گفت و شنید کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل چاہتے تھے، مرلی منوہر جوشی نے بھی اسی قسم کا بیان دیا کہ وہ تو ورکرس کو روک رہے تھے۔

مجموعی طور پر سنگھ پریوار کے بیانات انتہائی محتاط، مرتب اور اس انداز کے ہیں کہ انتظامات میں کوئی کمی نہیں تھی مگر مجمع خلاف توقع کنٹرول سے باہر ہوگیا۔ مسلمانوں کے طرز عمل اور حکومت ہند کی پالیسی کی وجہ سے مسئلہ الجھتا گیا اور وہ وقت آ گیا کہ کارسیوک کسی قیمت پر بغیر کچھ حاصل کئے لوٹنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ گواہوں کے مطابق فائرنگ اگر کی جاتی تو ہزاروں لوگ دب کر بھگدڑ میں مر جاتے اور بی.جے.پی کسی طرح بھی تشدد کی حامی نہیں تھی اور اس معاملہ کا اصل فیصلہ دھرم سنسد کرتی تھی۔

البتہ ونئے کٹیار کا بیان بہت ہی جذباتی تھا۔ مسلمان یہاں شرنارتھی بن کر آئے تھے، شرنارتھی بن کر رہیں، ان کو شہریت نہیں ملنی چاہئے، اور وہ دوسرے درجہ کے شہری ہونے کی حیثیت قبول کریں۔ سب سے اہم بات جو کہی گئی وہ یہ تھی کہ رام جی نے حکم دیا تھا اس لئے ہم نے مسجد ڈھادی اور متھرا اور بنارس بھی ہمارے ایجنڈے میں شامل ہیں ہم ان کو بھی مسلمانوں سے آزاد کرا کر چھوڑیں گے۔

دوسری عجیب بات یہ ہوئی کہ نرسمہا راؤ نے جو بیان کمیشن کے روبرو دیا وہ یہ تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر صدر راج نافذ نہیں کر سکے اور یہ کہ انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ مسجد اپنی سابقہ جگہ پر ہی

بنی چاہئے ان کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی مسجد بنی چاہئے وہ کسی دوسری جگہ پر بھی ہو سکتی ہے۔ جب ان سے جرح میں معلوم کیا گیا کہ کسی دوسری جگہ مسجد بنانے کے لئے تو سنگھ پریوار تیار تھا پھر آپ کو بیان دینے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ نرسمہاراؤ کا یہ بیان اس سے مختلف ہے جو بابری مسجد کی شہادت کے بعد اخبارات کو دیا گیا تھا اور بہ حیثیت وزیر اعظم انہوں نے 15/اگست 1993ء کو لال قلعہ سے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ مسجد کا انہدام غلط ہے اور مسجد کو اپنی جگہ تعمیر ہونا چاہئے اور یہی اس وقت کانگریس کا موقف تھا۔ اس لئے کہ کسی دوسری جگہ مسجد تعمیر کے لیے مسلمان تیار ہی نہیں تھے اس کے لئے تو سنگھ پریوار حسب دلخواہ جگہ دینے کو تیار ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ مسجد کی منتقلی کا ہی نہیں ہے بلکہ مسجد کو بت خانہ میں تبدیل کرنے کا ہے جس کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ مسجد خدا کی ملکیت ہوتی ہے وقف جائداد ہوتی ہے اسے کسی دوسرے مصرف میں خود مسلمان بھی نہیں لا سکتے۔

## حقیقت واقعہ

یہ امر واقعات اور شہادتوں سے ثابت ہے کہ نرسمہاراؤ کو بابری مسجد کی شہادت کی اطلاع بارہ بجے دوپہر مل چکی تھی۔ نرملا دیش پانڈے نے یہ اطلاع فون پر سب سے پہلے دی تھی جب کہ اس وقت صرف ایک ہی گنبد گرایا گیا تھا۔ مزید براں اسی دن پانچ بجے شام کو صدر راج نافذ قائم ہو گیا لیکن اس کے باوجود چبوترہ تعمیر ہو گیا اور اس پر رام للہ کی مورتی رکھ دی گئی یہ سب تو نرسمہا راؤ کی کانگریس حکومت میں ہوا۔

وی. پی. سنگھ نے اپنے دور میں ایک پلان دیا تھا جس کو وشو ہندو پریشد اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی دونوں نے مسترد کر دیا تھا۔ بقول مولانا پاریکھ صاحب کہ وہ پلان یہ تھا کہ درمیانی گنبد میں ہندو پوجا کرتے رہیں اور بقیہ دو گنبدوں میں مسلمان نماز پڑھتے رہیں۔ یہ پلان اگر قبول ہو جاتا تو پھر یہ مسئلہ ہندوستان کی مبینہ تین ہزار سے زائد مساجد کے لئے نظیر بن جاتا۔

آر. ایس. ایس کے چیف مسٹر سدرشن نے بتایا ہے کہ انہدام کا حادثہ نرسمہاراؤ کے طرز عمل سے پیش آیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نرسمہاراؤ نے ہی انہدامی دستے ارسال کیے تھے۔ ایک کانگریسی رہنما نے جو مہاراشٹر سے متعلق ہیں نے ان کو بتایا تھا کہ 6/دسمبر 1992ء کے مسجد کے انہدام میں نرسمہا

راؤ کی کچن کیبنٹ ملوث تھی۔

شہادتوں کی روشنی میں یہ امر واضح تھا کہ اڈوانی صاحب اجودھیا حادثہ کے وقت منچ پر نعرے لگوا رہے تھے۔ انہدام پر انہوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ لوگوں کو مٹھائی کی جگہ چینی تقسیم کی لیکن انہوں نے جو بیان کمیشن میں دیا وہ یہ تھا کہ ان کو اس انہدام سے بہت سخت تکلیف پہنچی اور یہ دن ان کی زندگی کا المناک دن تھا۔ اجودھیا تحریک میں بی۔جے۔پی اس مسئلہ میں تشدد نہیں چاہتی تھی۔ یہ انہدام قطعاً غیر قانونی تھا۔ طاقت سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ قرون وسطیٰ میں اگر کچھ غلطیاں ہوئی ہیں تو ان کو دوبارہ ایسی ہی غلطیاں کر کے درست نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اجودھیا کا مسئلہ چالیس سال سے نامعلوم فائلوں میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت کی کانگریس سرکار جو راجیو گاندھی کی سرکار تھی نے رام جنم بھومی کا تالا کھلوا کر اور رام مندر کا شیلانیاس کرا کر اسے اپنی سیاست کا عملی حصہ بنایا جس کی وجہ سے بی۔جے۔پی بھی اسے اپنی سیاست کا حصہ بناتے پر مجبور ہوئی اور اسے اپنا سیاسی رنگ دیا۔ دروازہ کھلا تو سیاست کا دروازہ بھی کھلا۔

اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر سنجے کاؤ جو موقعۂ واردات پر موجود تھے اور ان کی پٹائی بھی ہوئی تھی اور کیمرے بھی چھینے گئے تھے نے حادثہ کی تفصیلات اور چشم دید واقعات بیان کیے کہ کس طرح پولیس کا تعاون کارسیوکوں کو حاصل تھا۔

مشہور گاندھیائی شخصیت شریمتی نرملا دیش پانڈے جو حادثہ سے ایک ہفتہ قبل سے اجودھیا میں تھیں اور کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح تنازعہ ختم ہو جائے۔ وہ حادثہ کے وقت مسجد کے پیچھے والے حصے میں تھیں اگرچہ وہ منچ پر موجود حضرات کو نہیں دیکھ سکتی تھی مگر ان کی تقریریں اور آوازیں بدستور سن رہی تھیں۔ بارہ بجے منچ سے اعلان ہوا کہ تمام وہ حضرات جو گنبد پر چڑھے ہوئے ہیں اور جو گنبد کے اندر ہیں باہر آ جائیں گنبد گرنے والا ہے۔ ان حضرات کو چوٹ لگ سکتی ہے۔ فوراً تمام لوگ گنبد پر سے اتر آئے اور جو اندر تھے وہ بھی باہر آ گئے اور چند منٹ بعد ہی گنبد نیچے آ گرا۔ انہوں نے اپنے بیان میں اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور اوما بھارتی کی حرکات کی تفصیل بتائیں اور بتایا کہ بارہ بجے دوپہر پہلا گنبد گرا دیا گیا تھا۔ یہ انہدام منصوبہ بند اور کسی قابل انجینئر کے پلان کے تحت تھا۔ خود ان کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کی تفصیل انہوں نے بتائی اور کہا کہ ان کے اپنے بچنے کی امید ختم ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب ہندو مذہب کے منافی ہے۔ جب پہلا گنبد گرا تو فوراً انہوں نے نرسمہا

راؤ کو فون پر خبر دی تھی۔ مسجد کا انہدام منصوبہ بند تھا کیونکہ مسجد اوپر سے نہیں گری بلکہ پہلے اس کے دونوں جانب کی دیواریں گری تھیں۔

ایک دوسری صحافی روچرا گپتا بھی موقعہ پر موجود تھیں۔ انہوں نے انہدام اور صحافیوں کے ساتھ سلوک کی تفصیل بتائی۔ یہ یو این آئی کی نمائندہ صحافی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انہدام پر سب لوگ خوشیاں منا رہے تھے۔ ایل کے اڈوانی نے اسے تاریخی کارنامہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے گالی کی زبان میں کہا تھا کہ سرکار تو گرنے ہی والی ہے سسری مسجد ہی کو کیوں بچائیں۔ وجے راجے سندھیا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ مسٹر اڈوانی نے سب کو خوشی میں مبارکباد کے طور پر چینی تقسیم کی اور روچرا گپتا کو بھی انہوں نے چینی پیش کی تھی۔

مسز روچرا گپتا نے بتایا کہ کارسیوکوں اور وشو ہندو پریشد کے کارکنان نے 5 دسمبر 1992ء کو صحافیوں کو لے جاکر کارسیوا کی جگہیں دکھائی تھیں اور بتایا کہ اڑیسہ سے ایک انجینئر آیا ہے جو کارسیوکوں کو بتائے گا کہ کہاں اور کس طرح اور مسجد کے کس حصہ پر ضرب لگائی جائے جس سے گنبد گر جائے۔ اچاریہ دھرمیندر نے اڈوانی سے مشورہ کر کے بتایا کہ فوٹو گرافروں کو تصویریں نہ لینے دی جائیں۔ جب ان کو مارا گیا تو انہوں نے پولیس سے مدد مانگی تھی تو پولیس نے ان کو کوئی مدد نہیں دی۔

مرلی منوہر جوشی نے اگلی تاریخ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ بی۔ جے۔ پی۔ بابری مسجد کے انہدام کے حق میں نہیں تھی وہ تو اس تنازعہ کو خوش اسلوبی سے حل کرنا چاہتی تھی اس مسئلہ کو عدلیہ کے سپرد کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ عقائد کے معاملات عدلیہ کی حدود سے باہر ہوتے ہیں۔

ونے کٹیار کا بیان ایک طرح سے بہت دلچسپ اور غیر معقولیت کی انتہا پر مبنی ہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ مسلمان یہاں شرنارتھی کی طرح آئے تھے اور شرنارتھی بن کر رہیں وہ اس ملک کے مالک نہیں ہو سکتے۔ کاشی اور متھرا بجرنگ دل کے ایجنڈے میں ہے۔

وشو ہندو پریشد کے صدر شری وشنو ہری ڈالمیا نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے کہ منہدم شدہ ڈھانچہ مسجد تھی ہی نہیں وہ تو بابر کی فتح کی نشانی تھی اور 1936 سے اس میں نماز نہیں ہو رہی تھی وہ ایک متروکہ عمارت تھی انہوں نے مزید کہا کہ مسجد کا انہدام کوئی غیر اسلامی فعل نہیں ہے اور اپنے ایک تحریری بیان میں مسجدوں کی منتقلی کی چند مثالیں سعودیہ انڈونیشیا وغیرہ کی پیش کیں۔ انہوں نے ایک خاص بات یہ بھی کہی کہ اسلام میں صرف تین مسجدوں کو خصوصی حیثیت ہے۔ خانہ کعبہ، مسجد نبویؐ، اور

مسجد اقصیٰ اور بقیہ مساجد کو کوئی خصوصی درجہ حاصل نہیں ہے اور ہندوستان میں تو ان کی حیثیت ایک جائداد کی ہے اور جب کوئی جائداد قبضہ مخالفانہ میں چلی جاتی ہے تو وہ اس کے استعمال کا حق دار بن جاتا ہے۔

## خفیہ میٹنگ

فیض آباد کے سابق سینئر سپر نٹنڈنٹ اور موجودہ ہندو مہا سبھا کے کارگزار صدر ڈی. پی. رائے نے بتایا کہ بابری مسجد کے تعلق سے بی. جے. پی. کی قیادت کے منصوبے کا علم اٹل بہاری باجپئی کو تھا اور باجپئی نے مسجد کے انہدام سے قبل 5/دسمبر 1992ء لکھنؤ میں بی. جے. پی. کی خفیہ میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ یہ میٹنگ کلیان سنگھ کے مکان پر ہوئی تھی اور شام میں ہوئی تھی۔ اور ایل. کے. اڈوانی، مرلی منوہر جوشی نے بھی اس میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ بہ حیثیت پولیس افسران تمام چیزوں سے باخبر رہنا ہوتا تھا اس وجہ سے ہم اس میٹنگ میں سے بھی باخبر رہے ہمیں فون اور وائرلیس پر پل پل کی خبریں مل رہی تھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ شام کو باجپئی، اڈوانی، مرلی منوہر جوشی صاحبان لکھنؤ پہنچنے والے ہیں۔ مسٹر باجپئی اسی رات کو لکھنؤ میل سے دہلی واپس چلے گئے تھے اور یہ دونوں حضرات اجودھیا نصف شب میں پہنچ گئے تھے۔ باجپئی صاحب اس وقت اپوزیشن میں لیڈر تھے۔ باجپئی صاحب کا یہ دعویٰ کہ اجودھیا پر بات چیت چل رہی ہے بالکل غلط بیانی ہے وہ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ بات چیت کس کس کے درمیان ہو رہی ہے۔

اچاریہ گری راج کشور نے کمیشن کے سامنے بیان دیا کہ 6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کے انہدام سے 450 سالہ پرانا کلنک دھل گیا کیونکہ یہ عمارت پوری ہندو قوم کے لئے ذلت اور رسوائی کا باعث تھی۔

وی. پی. سنگھ نے اگلی تاریخ پر بتایا کہ کانگریس حکومت نے متنازعہ علاقہ میں شلانیاس کرا کر سب سے بڑی غلطی کی۔ شلانیاس سے قبل یہ تنازعہ صرف ہوا اور فائلوں میں تھا مگر جوں ہی مندر کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھا گیا تنازعہ کو ایک مقام مل گیا اور اس کی جڑیں زمین میں اترنے لگیں۔

وی. پی. سنگھ نے بتایا کہ اجودھیا تنازعہ کا حل جو باہمی طور پر قابل قبول ہو نکالنے کے لئے انہوں نے وشو ہندو پریشد کو متنازعہ اراضی کے باہر رام مندر کی تعمیر کے لئے ستر ایکڑ زمین دینے کی

پیش کش کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر بعد میں عدالتی فیصلہ پریشد کے حق میں آجائے تو وہ مندر کی توسیع کر سکتے ہیں مگر اس پیش کش کو مسترد کر دیا گیا۔

وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری گری راج کشور نے ایک بار پھر کمیشن کے سامنے پیش ہو کر کہا کہ 6/دسمبر 1992ء کا واقعہ سنہرے الفاظ میں لکھا جانا چاہئے۔ کیونکہ ہندوؤں نے اس روز بابری مسجد کو منہدم کر کے اپنے جنونی مسلمان بھائیوں کو اجتماعی طور پر ان کی اوقات دکھا دی۔ ہندوؤں میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے انفرادی واقعات تو ہمیشہ نظر آتے تھے مگر یہ پہلا موقع تھا کہ 6/دسمبر 1992ء کو ہندوؤں نے اجتماعی طور پر ان کی اوقات دکھا دی۔ اس سے ہندوؤں کو اپنی عزت نفس اور خودداری کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا اور ہندوؤں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بزدل نہیں ہیں، اس انہدام سے ہندوؤں کی خود اعتمادی میں زبردست اضافہ ہوا ہے اور اس سے اپنے جنونی مسلم بھائیوں کو لگام دینے میں کامیابی ملی ہے جو ہمیشہ اپنی شرائط منوایا کرتے تھے اب کم از کم یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

(افکارِ ملی، نئی دہلی، بابری مسجد نمبر)



# بابری مسجد اور ملحقہ جائداد اوقاف سے متعلق حقائق

از: خلیق احمد خاں، فیض آباد

> بابری مسجد سے متعلق ہمارا دعویٰ وشو ہندو پریشد کے پروپیگنڈے کے برعکس محض 80x40 کے پلاٹ پر ہی نہیں ہے۔ عدالتی ریکارڈز، نزول ریکارڈز اور محصولات ریکارڈز پر مبنی ہمارا دعویٰ بابری مسجد کے ساتھ ساتھ مزید چار قناتی مسجدوں، تین قبرستانوں اور ایک مشہور درگاہ خواجہ ہتّی کے مزار کی بابت بھی ہے ان تمام کا مجموعی رقبہ 15.75 ایکڑ ہے۔

## چند حقائق

- آئین ہند کے آرٹیکل 142 کے مطابق کسی جائداد پر 12 سال بعد قبضہ مخالفانہ کا استحقاق حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہی تلاش کی جانی چاہئے۔
- مسلمانوں کی جانب سے بابری مسجد کا مقدمہ بابری مسجد سے بے دخلی کے بعد مقررہ ومصرحہ 12 سالہ مدت گزارنے سے محض چار دنوں قبل قائم کیا گیا۔
- بالکل عین وقت پر مذکورہ بالا مقدمہ (نمبر 12 سن 1961) سنّی سینٹرل بورڈ آف وقف وغیرہم بنام گوپال سنگھ وشارد وغیرہ 18/دسمبر 1961ء کو داخل کیا گیا۔ اسی مقدمہ کو مسلم فرقہ کی جانب سے نمائندہ مقدمہ کی حیثیت حاصل ہے۔
- حق ملکیت کے اس مقدمے میں پہلی درخواست یہ ہے کہ عدالت مجاز، نقشہ منسلکہ کے مطابق متنازع جائداد کو بابری مسجد قرار دے۔ درخواست میں مزید یہ ہے کہ متنازعہ فیہ جائداد سے بتوں اور پوجا کے دیگر لوازمات کو ہٹا کر مدعی کو قبضہ واختیار دلایا جائے۔

## سرکاری مداخلت

زائرین کو سہولیات فراہم کرنے کے نام پر اتر پردیش کی ریاستی حکومت نے 1991ء میں 2.7744 ایکڑ اراضی ایکوائر کر لی تھی۔ یہ اراضی پلاٹ نمبر 172 ,171 ,160 ,159 پر مشتمل تھی۔ ان پلاٹوں میں یوں تو اندرون صحن اور بابری مسجد شامل نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے ملحقہ اراضی بشمول ملحقہ

قبرستان اور تمام جائداد اوقاف کا احاطہ کر لیا ہے۔ اراضی مذکورہ کو تحویل میں لینے کے بعد ریاستی حکومت نے وشو ہندو پریشد کے سادھوؤں کی سانٹھ گانٹھ میں ایکوائرڈ اراضی کے اندر بنے ہوئے مندروں کو منہدم کر کے بابری مسجد کے عین سامنے ایک پختہ چبوترہ بنوادیا۔

الہ آباد ہائی کورٹ نے 11/دسمبر 1992ء کو ایکوائرڈ اراضی کو غیر قانونی اور کالعدم قرار دے دیا۔

چبوترہ بنانے کی پاداش میں سپریم کورٹ نے یو. پی. کے وزیر اعلیٰ کو ان کی ذاتی نیز سرکاری حیثیت میں ہتک عدالت کے لئے موجب گرفت قرار دیا۔

6/دسمبر 1992ء کو ہندو بنیاد پرستوں نے بابری مسجد شہید کر ڈالی۔ انہدام مسجد کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ مرکزی حکومت نے 7/جنوری 1993ء کو تقریباً 67 ایکڑ اراضی تحویل میں لے لی جس میں متنازعہ فیہ اراضی کے علاوہ بابری مسجد کے اطراف کی غیر متنازعہ اراضی بھی شامل ہے۔

تحویل شدہ اراضی کو حالت بدستور (Status Quo) میں رکھنے میں مندرجہ ذیل عوامل معاون ہیں:

1. اجودھیا میں چند اراضی کو بحق سرکار تحویل میں لینے کے لئے بنایا گیا اجودھیا ایکٹ 1993ء (نمبر 33 آف 1993ء)
2. ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی وغیرہم مدعیان بنام حکومت ہند وغیرہم مدعا علیہم میں 24/اکتوبر 1994ء کو سپریم کورٹ کے ذریعہ دیا ہوا وہ حکم جس میں حالت موجودہ کو بدستور (Status Quo) رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (Air 1995 SC 605)

سپریم کورٹ کے متذکرہ بالا فیصلے کے پیرا 52 اور 53 کے مطابق عدالت میں مقدمہ کے زیر سماعت رہنے تک غیر متنازعہ فیہ اراضی کسی کو بھی نہیں دی جا سکتیں۔ چنانچہ مقدمہ کے حتمی فیصلے تک فریقین کے مابین کسی قسم کی مصالحت یا گفت وشنید بارآور نہیں ہو سکتیں۔

الہ آباد ہائی کورٹ کو اب بابری مسجد سے متعلق ہندو فریقین کے ذریعہ دائر کردہ چار مقدمات اور سنی مرکزی وقف بورڈ کے ذریعہ دائر کردہ ایک نمائندہ مقدمہ کی سنوائی کرنی ہے۔

زیر نظر مضمون میں جس امر کی صراحت کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ بابری مسجد مقدمہ میں ہمارا دعویٰ صرف 80x40 کے ایک پلاٹ پر ہی موقوف نہیں ہے جیسا کہ وشو ہندو پریشد کا پروپیگنڈا ہے

اور عام برادران وطن جس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ عدالتی ریکارڈز، نزول ریکارڈز اور محصولات کے ریکارڈز کے مطابق بابری مسجد کے علاوہ چار اور مسجدیں (قناتی و دیگر)، 12 قبرستان اور اہم درگاہ خواجہ ہتی کے مزار جن کا مجموعی رقبہ 5.75 ایکڑ ہوتا ہے تحویل شدہ اراضی میں شامل ہیں۔

درحقیقت سنی مرکزی وقف بورڈ، کوٹ رام چند گاؤں، پرگنہ حویلی اودھ، تحصیل صدر، ضلع فیض آباد میں واقع 23 نزول پلاٹوں پر دعویدار ہے جن کے نمبر درج ذیل ہیں:

238, 579, 580, 581, 582, 583, 584, 585, 586, 587, 588, 590,
593, 594, 595, 603, 606, 607, 610, 620, 621, 628

مذکورہ بالا نزول پلاٹ مندرجہ بالا ذیل 12 ریونیو پلاٹوں پر پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ ریونیو پلاٹ رقبے کے اعتبار سے نزول پلاٹوں سے قدرے بڑے ہوتے ہیں۔

147, 159, 160, 162, 168, 169, 170, 172, 194, 197, 198, 199

ریکارڈز کے مطابق:

- بابری مسجد پلاٹ نمبر 583 پر واقع ہے۔
- چار دیگر مساجد بشمول مشہور قناتی مسجد پلاٹ نمبر 580, 590, 593, اور 595 پر واقع ہے۔
- اوقاف سے متعلق 13 مسلم قبرستان نزول پلاٹ نمبر 580, 581, 585, 588, 590, 593, 594, 595, 606, 607, 610, 619 اور 620 پر واقع ہے۔
- مذکورہ بالا مسجدوں اور قبرستانوں کے علاوہ وقف بورڈ سے متعلق 'وقف عہد شاہی' پلاٹ نمبر 586، (جہاں شلا نیاس کیا گیا تھا) پر اور خواجہ ہتی کا مزار پلاٹ، نمبر 628 پر واقع ہیں۔ سرکار نے اس علاقہ کا نام بدل کر 'کبیر کا ٹیلہ' کر دیا ہے۔

نوٹ: 15 راگست 1947ء کو ہندوستان کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ 23 ردسمبر 1949ء کو پنڈت رام دیو دوبے، تھانیدار، تھانہ اجودھیا، ضلع فیض آباد نے دفعات 449/29/142 تعزیرات ہند کے تحت مسمیان ابھے رام داس، رام شکل داس، سدرشن داس اور 50/60 افراد کے خلاف ایک ایف آئی آر اس بابت درج کرائی کہ ملزمان نے مسجد کا تالا توڑ کر اس میں شری رام چندر جی کا ایک بت نصب کر دیا۔ دفعہ 145 ضابطہ فوجداری کے تحت کارروائی میں مسجد

تحویل میں لی گئی اور ایک ریسیور مقرر کر دیا گیا۔

## ہندو فریقین کے دائر کردہ مقدمات

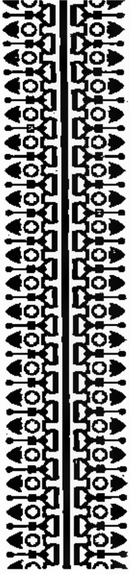
❶ شری گوپال سنگھ وشارد بنام ظہور احمد، سرکار و ضلع انتظامیہ، مقدمہ نمبر 2، سن 1950ء مورخہ 16/ جنوری 1950۔

❷ رام چندر داس پرم ہنس بنام ظہور احمد، سرکار ضلع انتظامیہ، مقدمہ نمبر 25 سن 1950ء، مورخہ 5/دسمبر 1950۔

❸ نرموہی اکھاڑا بنام ریسیور سرکار و ضلع انتظامیہ۔ مقدمہ نمبر 26 سن 1959ء مورخہ 5/دسمبر 1959۔

❹ دیوکی نندن بنام سنی سینٹر وقف بورڈ، مقدمہ نمبر 236 سن 1989۔





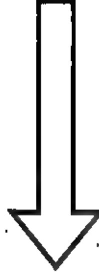





# بابری مسجد-اجودھیا تنازعہ
# تاریخ کے آئینے میں

**Chronology of the Events in Ayodhya**

1528ء to 31 December 2003



"متنازعہ اراضی کے قریب ایک پہاڑی مقام رام کتھا کُنج میں 500 تربیت یافتہ کارسیوکوں نے ریہرسل کیا۔ اس ریہرسل میں یہ بھی شامل تھا کہ کس طرح مسجد کے گنبد پر چڑھائی کرنا ہے اور گنبد کو زمین بوس کر دینا ہے۔"

—— 5/دسمبر 1992ء

# بابری مسجد: تعمیر سے تخریب تک

## تاریخی واقعات 1528ء تا 6/دسمبر 1992ء

1528ء: سلطنت مغلیہ کے بانی شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے ایک سپہ سالار میر باقی اصفہانی نے اجودھیا میں بابری مسجد تعمیر کرائی جس کے تاریخی سال کا نام ''بود خیر باقی'' (935ھ) ہے۔

1855ء: ہندو اور مسلمان دونوں کے درمیان سخت جھگڑا ہوا، ہندوؤں نے ہنومان گڑھی پر قبضہ کر لیا لیکن مسلمانوں نے اس کے بدلے بابری مسجد پر قبضہ برقرار رکھا۔

1857ء: مذکورہ جگہ سے متعلق ایک تنازع اُٹھ کھڑا ہوا لیکن راجہ دیو بخش سنگھ اور مولوی امیر علی کی مصالحتی کوشش سے مسئلہ یہ طے پایا کہ مسجد اور چبوترے کے مابین ایک دیوار کھڑی کر لی جائے۔

1858ء: ایک ہندو نے بابری مسجد کے محراب و منبر کو نقصان پہنچایا۔ 15/دسمبر کو ایک مقدمہ درج کرایا گیا۔

1860ء: بابری مسجد کا باضابطہ رجسٹریشن کرایا گیا اور مسجد کے خطیب میر رجب علی کی طرف سے اسی سال نومبر میں ایک درخواست دائر کی گئی۔

1877ء: برطانوی حکومت کی نگرانی میں فیض آباد کا جو گزیٹیر لکھا گیا اس میں فتنہ کو پورے طور پر ہوا دی گئی۔ اور یہ تحریر لکھی گئی کہ بابر کے دور میں رام جنم بھومی کو توڑ کر بابری مسجد بنائی گئی۔

1883ء: رام جنم استھان کے نام پر راتوں رات چبوترہ بنا دیا گیا لیکن ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے چبوترے پر مندر کی تعمیر کی درخواست مسترد کر دی۔

19/جنوری 1885ء: مہنت رگھوبیر داس نے فیض آباد کے جج کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کیا کہ پجاریوں کی سہولت کے لیے رام جنم استھان پر ایک مندر تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔

24/دسمبر 1885ء: سب جج فیض آباد پنڈت ہری کشن نے اس مقدمہ کو خارج کر دیا۔

1934ء: کچھ شر پسند عناصر نے بابری مسجد کو نقصان پہنچایا لیکن حکومت نے اس کی تعمیر اپنے مصارف سے کرائی۔

1936ء: یو.پی.مسلم ایکٹ کے تحت بابری مسجد سنی وقف بورڈ کے ماتحت رجسٹرڈ کرائی گئی۔

26/فروری 1944ء: کمشنر اوقاف کی رپورٹ گورنمنٹ گزٹ میں بھی اسے سنی وقف درج کیا گیا۔

13/نومبر 1949ء: کو چبوترہ بنا دیا گیا اور بابری مسجد کے آس پاس چند قبریں تھیں ان کو کھود ڈالا گیا۔

22-23/دسمبر 1949ء: کی درمیانی شب میں ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام نے اپنے چیلوں کے ساتھ بابری مسجد میں گھس کر مورتیاں رکھ دیں۔ جس کے خلاف ایک ہندو کانسٹیبل ماتو پرشاد نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔ سٹی مجسٹریٹ کرشن کمار نائر نے مسجد اور اس سے متصل قبرستان کو قرق کرلیا اور ریسیور مقرر کر کے مسجد میں تالا لگوا دیا۔

16/جنوری 1950ء: یو.پی.حکومت کے فیصلے کے خلاف عدالت میں اپیل دائر کی گئی۔

24/اپریل 1950ء: کو فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے.این.اوگرا نے فیض آباد کے سول جج کی عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کیا جس کے پیراگراف 14 میں یہ بیانات دئے۔ ''یہ جائداد نزاعی بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے مسجد کے طور پر مسلمان استعمال کرتے ہیں، مسلمان اس میں نماز پڑھتے ہیں، اس کا رام چندر مندر کی طرح کبھی استعمال نہیں کیا گیا''۔

1961ء: یو.پی.سنی وقف بورڈ نے مذکورہ اراضی پر حق ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے مسجد سے مورتی ہٹوانے کے لیے عدالت میں اپیل دائر کی۔

20/مارچ 1974ء: ریسیور کی حیثیت سے پنڈت مشرا کے تقرر کو ہائی کورٹ نے مسترد کر دیا اور معاملے کو سول جج کو لوٹاتے ہوئے یہ ہدایت دی کہ اس منصب کے لیے کسی معقول شخص کا انتخاب کیا جائے۔

18/مارچ 1975ء: سول جج نے شری مدن موہن دوبے کو ریسیور مقرر کیا۔

9/مئی 1975ء: الہ آباد ہائی کورٹ نے شری دوبے کا تقرر ملتوی کرتے ہوئے یہ ہدایت دی کہ مسٹر کے.کے.رام بہ حیثیت ریسیور اپنے فرائض انجام دیتے رہیں۔

1984ء: دہلی میں ہندوؤں کی ایک میٹنگ میں تالا کھلوانے کا بھی مطالبہ کیا گیا اور اسی سال

اکتوبر کی ابتداء سے لے کر دو سال تک اتر پردیش میں رتھ یاترائیں نکالی گئیں۔

1رفروری 1986ء: عام پوجا کے لیے یو.ایس. پانڈے کی عرضداشت اور ضلع مجسٹریٹ ٹی.کے. پانڈے کی سفارش پر ڈسٹرکٹ جج کے.ایم. پانڈے نے مسلم فریق کی رائے جانے بغیر ہندوؤں کو عام پوجا کی اجازت دی، اس عدالتی حکم کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی اور مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دی گئی۔ عوامی رائے کو کانگریس کی حمایت میں بدلنے کے لیے اس پوری کارروائی کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ راجیو گاندھی نے کانگریس کے لیے ہندوؤں کی حمایت دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایسا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اس واقعہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تنازع بڑھا۔ قانونی عمل سے مسجد واپس لینے کے لیے بابری مسجد ایکشن کمیٹی (BMAC) قائم ہوئی اور اس طرح قانونی لڑائی نے شدت اختیار کی۔

14رفروری 1986ء: بابری مسجد کا تالا ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اور صرف پوجا کے لئے کھولے جانے پر پورے ملک میں مسلمانوں نے یومِ سیاہ منایا۔

20رفروری 1986ء: مسلم پرسنل لاء کانفرنس کی طرف سے 313 علماء کرام نے بابری مسجد کی بازیابی کے لیے گرفتاری دی۔

11رنومبر 1986ء: بی.جے.پی اور وی.ایچ.پی نے مل کر مسلمانوں کی وقف اراضی پر مندر کے لیے شلانیاس کیا۔ خونی رتھ یاترا نکال کر مسلم مخالف جذبات بھڑکائے گئے اور نفرت پیدا کی گئی۔ جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے جن میں 2000 لوگ ہلاک ہوئے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے عدالتی فیصلہ ماننے کا اعلان کیا۔

21-22ردسمبر 1986ء: دہلی میں بابری مسجد کانفرس منعقد ہوئی اور بابری مسجد موومنٹ کوآرڈینیشن کمیٹی (BMMCC) نے 26رجنوری 1987ء کی تقریبات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

24رجنوری 1987ء: بابری مسجد موومنٹ کوآرڈینیشن کمیٹی (BMMCC) کے کنوینر سید شہاب الدین نے صدر جمہوریہ ہند آر.وینکٹ رمن اور مختلف قومی پارٹیوں کے قائدین کی درخوست پر 26رجنوری تقریبات کے بائیکاٹ کی اپیل واپس لے لی۔

1/فروری 1987ء: پورے ملک میں یومِ بابری مسجد بند منایا گیا۔

27/فروری 1987ء: کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کے راجیہ سبھا ممبر گرو داس گپتا نے راجیہ سبھا میں Ancient Monuments and Archaelogical Sites and Remains Act میں ترمیم کے لیے ایک پرائیوٹ بل پیش کیا، تاکہ بابری مسجد کو ایک قومی آثارِ قدیمہ کی حیثیت حاصل ہو جائے اور مسئلہ حل ہو جائے۔

20/مارچ 1987ء: مسلمانانِ ہند نے دہلی کے بوٹ کلب میدان میں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر بابری مسجد کی بازیابی اور حفاظت کرنے کا مطالبہ کیا۔

22-23/مئی 1987ء: میرٹھ میں زبردست فساد ہوا۔

30/جولائی 1987ء: ریسیور کی حیثیت سے مدن موہن کے تقرر کو جسٹس کملیشور ناتھ نے حتمی طور پر رد کرتے ہوئے کسی مناسب شخص کو اس منصب پر فائز کرنے کے لیے زیریں عدالت کو ہدایات دیں۔

14/اکتوبر 1988ء: بابری مسجد ایکشن کمیٹی (BMAC) کی طرف سے اجودھیا مارچ کا اعلان ہوا مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔

1/فروری 1989ء: الہ آباد میں ہندو راہنماؤں کی ایک میٹنگ میں 9/نومبر 1989ء کو مندر کا سنگ بنیاد رکھنے کی بات طے کی گئی۔

1/مئی 1989ء: VHP نے 25 کروڑ روپئے کی لاگت سے بابری مسجد کی جگہ ایک رام مندر تعمیر کرنے کا اعلان کیا۔

8/مئی 1989ء: پارلیمنٹ میں مرکزی وزیر داخلہ بوٹا سنگھ نے یہ اعلان کیا کہ اجودھیا تنازعہ الہ آباد ہائی کورٹ کی ایک سہ رکنی بینچ کے ذریعہ حل کیا جائے گا۔

12/مئی 1989ء: کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سکریٹری سی. راجیشور راؤ کو وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے رضا کاروں نے بابری مسجد میں جانے سے اس لیے روک دی کیونکہ ان کے ہمراہ چند مسلم کامریڈ بھی تھے۔

جون/1989ء: بھارتیہ جنتا پارٹی کی قومی مجلس عاملہ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ متنازعہ عمارت

ہندوؤں کے حوالے کی جائے۔

15/جولائی 1989ء: جسٹس یو.بی. شریواستو اور جسٹس سید حیدر عباس رضا پر مشتمل ایک ڈویژن بینچ نے بابری مسجد/ رام جنم بھومی کو بہ سرعت حل کرنے کے لیے فیض آباد ڈسٹرکٹ کورٹ میں زیر سماعت پانچ مقدمات کو لکھنؤ بینچ میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ واضح ہو کہ مقدموں میں سرعت لانے کی درخواست ریاستی حکومت نے دی تھی۔ معزز ججوں نے چیف جسٹس سے اسپیشل بینچ کے لئے تیسرے جج کے تقرر کی درخواست کی۔

17/جولائی 1989: اسپیشل بینچ کے ذریعہ حق ملکیت کا مقدمہ طے کئے جانے کے فیصلے کو مسلم قائدین نے سراہا اور انہوں نے عدالتی فیصلے کو قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ جبکہ ہندوؤں کی عسکری تنظیموں نے عدالت کے فیصلے کو نہ ماننے کے اپنے موقف کو پھر دہرایا۔

21/جولائی 1989ء: ہائی کورٹ کے کارگزار چیف جسٹس مسٹر کے.سی. اگروال نے اسپیشل بینچ کے لئے خود کو نامزد کیا۔

ستمبر 1989ء: ہندوؤں نے بدایوں میں ٹرین روک کر حملہ کیا اور 200 سے زائد مسلمان شہید کر دیئے گئے۔

اکتوبر 1989ء: بھاگلپور (بہار) میں ہولناک فساد ہوا۔

8/نومبر 1989ء: وزیر اعظم راجیو گاندھی کے زمانے میں رام جنم بھومی کا شیلانیاس، بابری مسجد کے قریب متنازعہ جگہ پر کیا گیا۔ وزیر داخلہ بوٹا سنگھ لکھنؤ آئے اور سرکاری ایڈووکیٹ جنرل شانتی سوروپ بھٹناگر کے مشورے کے مطابق یہ دعوی کیا کہ شیلانیاس کی جگہ متنازعہ فیہ علاقے سے باہر ہے۔

9/نومبر 1989ء: مجوزہ مندر کا شیلانیاس نو بج کر آٹھ منٹ پر کیا گیا۔

10/جنوری 1990ء: اسپیشل بینچ نے ایک سروے کمیشن مقرر کیا۔

6/فروری 1990ء: وزیر اعظم وی. پی. سنگھ نے مکتی یگیہ سمیتی کو بات چیت کے لئے دعوت دی۔

25/ستمبر 1990ء: بی. جے. پی. صدر لال کرشن اڈوانی کی سومناتھ، اجودھیا رتھ یاترا شروع ہوئی۔

19/اکتوبر 1990ء: صدر جمہوریہ آر. وینکٹ رمن نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ اس جگہ (2.77 ایکڑ) کو ایکوائر کرلیا گیا جس میں بابری مسجد واقع ہے۔

23/اکتوبر 1990ء: جب اڈوانی کی رتھ یاترا سمستی پور (بہار) پہنچی تو بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرشاد یادو کے حکم سے اڈوانی کو گرفتار کرلیا گیا۔

24/اکتوبر 1990ء: اہل ہنود نے بھارت بند کا اعلان کیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے راشٹریہ مورچہ حکومت سے حمایت واپس لے لی۔

30/اکتوبر 1990ء: یو. پی. میں ملائم سنگھ کی حکومت کے دوران کارسیوکوں کو بابری مسجد تک پہنچنے سے روکنے کے لئے گولیاں چلائی گئیں۔

3/دسمبر 1990ء: مسلم پرسنل لاء بورڈ بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے مذہبی مسلم رہنماؤں کا اجلاس کیا۔

6/دسمبر 1990ء: اجودھیا میں کارسیوکوں کا بھی جلسہ ہوا اور بڑی تعداد میں لوگ اکٹھا ہوئے۔

7/دسمبر 1990ء: الہ آباد میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کانفرس کی میٹنگ میں بابری مسجد کی بازیابی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ متنازعہ اراضی پرشیلانیاس پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

ستمبر 1991ء: پی. وی. نرسمہا راؤ کی حکومت نے جائے عبادت سے متعلق ایک بل پیش کیا کہ تمام عبادت خانوں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور 15/اگست 1947ء کو ان کی جو حیثیت تھی وہ برقرار رہے گی لیکن بابری مسجد کو اس بل سے الگ رکھا گیا۔

5/اکتوبر 1991ء: سپریم کروٹ نے متنازعہ زمین پر مستقل تعمیرات کے خلاف حکم امتناعی جاری کردیا۔

7/اکتوبر 1991ء: اتر پردیش کی بی. جے. پی حکومت نے وقف کی مسجد سے متصل متنازعہ 2.77 ایکڑ اراضی کو ایکوائر کرکے تعمیر کا کام شروع کردیا۔ وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے کام رکوانے سے متعلق سپریم کورٹ کے حکم کو نظر انداز کیا۔

6/جنوری 1992ء: بنارس میں وشو ہندو پریشد (VHP) کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل نے بابری مسجد کی جگہ مندر تعمیر کرنے کا اعلان کیا۔

8/فروری 1992ء: یو. پی. حکومت نے قبضہ شدہ زمین پر گھیرابندی کرانی شروع کردی۔

21/مارچ 1992ء: اتر پردیش کی بی۔ جے۔ پی حکومت نے رام کتھا پارک کے قریب 42 ایکڑ زمین وشو ہندو پریشد کے حوالے کر دی۔

22/مارچ 1992ء: ساکشی گوپال مندر اور سُمترا بھون وغیرہ گروائے گئے۔

23/مارچ 1992ء: رام کتھا پارک کی تعمیر کی وجہ سے ایوان میں کافی ہنگامہ ہوا اور وزیر داخلہ ایس۔ بی۔ چوہان نے کلیان سنگھ حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان کی حکومت نے اس جگہ کی سابقہ حیثیت کو بحال نہیں رکھا تو مرکزی حکومت یو۔ پی۔ میں صدر راج نافذ کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گی۔ مگر یہ دھمکی صرف کاغذ پر برقرار رہی۔

7/اپریل 1992ء: جنتا دل کے صدر ایس۔ آر۔ بومئی کی قیادت میں 25 افراد پر مشتمل ایک جماعتی وفد نے اجودھیا کا دورہ کیا۔ وہاں جانچ پڑتال کی اس کے بعد وزیر داخلہ ایس۔ بی۔ چوہان کو یہ رپورٹ پیش کی کہ عدالت کی کھلی نافرمانی کی جا رہی ہے۔

9/مئی 1992ء: اس وفد نے وزیر داخلہ کو اجودھیا کی رپورٹ پیش کی۔

23/جون 1992ء: قومی یکجہتی کونسل کی میٹنگ میں بابری مسجد کے انہدام کے خطرے کا اظہار کیا۔

8/جولائی 1992ء: وشو ہندو پریشد نے مندر کی تعمیر نو کا اعلان کیا۔

9/جولائی 1992ء: پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں زبردست ہنگامہ، باقاعدہ تعمیر کا کام شروع کرانے پر ہوا۔ کارسیوا کا آغاز کر دیا گیا۔

12/جولائی 1992ء: سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ اگر متنازعہ اراضی پر کوئی تعمیر کی گئی تو گرا دی جائے گی۔

17/جولائی 1992ء: عدالتی حکم ماننے اور تعمیراتی کام روکنے سے کارسیوکوں نے انکار کر دیا۔

21/جولائی 1992ء: الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ نے تحویل شدہ 2.77 ایکڑ اراضی میں کسی بھی قسم کے تعمیراتی کام پر پابندی لگا دی۔

23/جولائی 1992ء: وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مسئلہ حل کرنے کی غرض سے تعمیر کا کام رکوانے کے لئے سادھوؤں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ یو۔ پی۔ کے وزیر اعلیٰ نے مسجد کے تحفظ اور صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کا یقین دلایا۔

25/جولائی 1992ء: وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے یقین دہانی کرائی کہ 4 ماہ میں اس تنازعہ کا حل نکالنے کی پوری کوشش کی جائے گی، نو تعمیرات کا کام روک دیا گیا۔

15/اگست 1992ء: وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے لال قلعہ دہلی سے اعلان کیا کہ بابری مسجد کو نقصان پہنچائے بغیر ہم رام مندر کی تعمیر کے حق میں ہیں۔

3/اکتوبر 1992ء: وشو ہندو پریشد اور بابری مسجد ایکشن کمیٹی میں مذاکرات کا دوبارہ آغاز ہوا۔

وشو ہندو پریشد کے دھرم سنسد نے 6/دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں کارسیوا کرنے کا اعلان کیا۔

8/نومبر 1992ء: بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے درمیان بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

23/نومبر 1992ء: قومی یک جہتی کونسل نے قرار داد پاس کر کے وزیر اعظم کو ہر ضروری قدم قانون کے وقار و بالادستی کے لئے اُٹھانے کا اختیار دے دیا۔

27/نومبر 1992ء: اجودھیا میں مرکزی فورس بھیجی گئی۔

28/نومبر 1992ء: سپریم کورٹ نے یو. پی. سرکار کی اس یقین دہانی کو تسلیم کر لیا کہ متنازعہ جگہ پر کوئی تعمیراتی کام نہیں ہوگا۔

28/نومبر 1992ء: اسی دن بی. جے. پی. کے لیڈر ایل. کے. اڈوانی نے زور دیا کہ سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود مندر کی تعمیر کا کام جاری رہے گا۔

29/نومبر 1992ء: سپریم کورٹ کی ہدایت پر مراد آباد کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اجودھیا میں مشاہد (Observer) مقرر کیا گیا۔

4/دسمبر 1992ء: تقریباً دو لاکھ کارسیوک اجودھیا پہنچ گئے۔

5/دسمبر 1992ء: (11 A.M.) سنتوں اور مہنتوں کے مارگ درشک منڈل نے منصوبہ بند کارسیوا کے لیے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

(12.30 P.M.) متنازعہ اراضی کے نزدیک عوامی جلسہ میں دو کارسیوکوں کو بلایا گیا کہ وہ بتائیں کہ گذشتہ دو ماہ سے ان کو کس طرح کی تربیت (Training) دی جا رہی ہے۔ جلسہ کے اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ کارسیوکوں (Volunteers) کے سربراہ واقف ہیں

کہ کون تربیت یافتہ افراد ہیں اور ان کو کس کام کے لیے تربیت دی گئی ہے۔

(2 P.M.) VHP کے Spokesperson شنکر اگنی ہوتری نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ کارسیوک منصوبہ کے مطابق سب سے پہلے جولائی میں تعمیر کئے گئے رام چبوترہ کی صفائی کریں گے اور ضروری محسوس ہوا تو مزید تعمیر کا کام ہوگا۔

(2:30 to 5:30 P.M.) متنازعہ اراضی کے قریب ایک پہاڑی مقام رام کتھا کنج میں 500 تربیت یافتہ کارسیوکوں نے ریہرسل کیا۔ اس ریہرسل میں یہ بھی شامل تھا کہ کس طرح مسجد کے گنبد پر چڑھائی کرنا ہے اور گنبد کو زمین بوس کر دینا ہے۔

(5 P.M.) VHP کے جنرل سیکریٹری اشوک سنگھل نے کارسیوکوں کے کیمپ کا دورہ کیا اور ان سے ملاقات کر کے مخصوص ہدایات دیں۔

(7 P.M.) بی۔جے۔پی کے لیڈر ایل۔کے۔ایڈوانی کو لکھنؤ میں ہدایت کی گئی کہ وہ 5/دسمبر کی شب میں یا 6/دسمبر کو ہر حال میں اجودھیا پہنچ جائیں۔

(11 P.M.) اڈوانی فیض آباد پہنچ گئے اور اجودھیا کے لئے کوچ کیا۔ اجودھیا میں اڈوانی نے اشوک سنگھل کے علاوہ دیگر لیڈروں سے رابطہ قائم کیا۔

6/دسمبر 1992: (8 A.M.) ونئے کٹیار کی رہائش گاہ پر ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں شیو سینا پارلیمنٹری پارٹی کے سربراہ موریشور ساوے، بجرنگ دل کے سربراہ اور ایم۔پی۔ ونئے کٹیار اور اوڈوانی کی شرکت ہوئی۔

(8:15 A.M.) 2.774 ایکڑ اراضی کی نشاندہی کے لیے لگائے گئے لوہے کے پول کو R.S.S. کے رضا کاروں نے آگے بڑھا دیا تاکہ متنازعہ اراضی تنگ ہو جائے۔

(9 A.M.) R.S.S. کے مذید رضا کار 2.774 ایکڑ اراضی پر پہنچ گئے اور PAC کے تعاون سے ایک حفاظتی گھیرا بنا دیا تاکہ دوسرے لوگ اندر داخل نہ ہو سکیں۔

(10.15) اڈوانی اور بی۔جے۔پی کے صدر مرلی منوہر جوشی اجودھیا سائٹ پر پہنچ گئے۔ اس وقت تمام کارسیوکوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ اور کم سے کم 20 منٹ کے لیے حفاظتی گھیرا ختم کرنے کی مانگ کی تاکہ وہ بابری مسجد تک پہنچ سکیں۔ اس کوشش میں بہت سے کارسیوک

گھیرا توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم RSS کے رضا کاروں نے چند کارسیوکوں کو روکنے کی کوشش کی۔

(10.30 to 11.30 A.M.) سیکڑوں کارسیوک پولیس کے گھیرے کو توڑنے میں کامیاب ہوئے، اور بابری مسجد کی طرف کوچ کر گئے۔

(11.35 A.M) سنتوں اور مہنتوں کی پوجا 2.774 ایکڑ اراضی پر شروع ہو گئی۔

(11.35 to 11.50 A.M.) ہزاروں کارسیوک حفاظتی گھیرا توڑ کر 2.774 ایکڑ متنازعہ اراضی میں داخل ہو گئے اور اسی وقت CRPF پر بھی کارسیوکوں نے حملہ کر دیا اور شدید پتھراؤ کیا۔

(11.50 A.M.) پہلا کارسیوک بابری مسجد کے داہنی گنبد پر چڑھ گیا۔ اور جے شری رام کی آواز سے فضا مشتعل ہو گئی۔

(11.51 A.M.) بہت سے کارسیوک بابری مسجد کے گنبدوں پر چڑھ گئے اور CRPF پر شدید پتھراؤ ہونے لگا۔

(11.55 A.M.) ہزاروں کارسیوکوں نے بابری مسجد پر حملہ کر دیا۔ اس کی ریلنگ کو توڑ دیا اور ہر طرف سے بابری مسجد کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

(12.10 P.M.) اوما بھارتی کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ بابری مسجد سے تمام کارسیوک اُتر جائیں لیکن کسی نے پروانہ کی۔

(1.30 P.M.) فیض آباد سے ریپڈ ایکشن فورس (RAF) کی چار بٹالین نے اجودھیا کے لئے کوچ کیا۔ اگر چہ جگہ جگہ سڑکوں پر کارسیوکوں نے مزاحمت کی لیکن RAF ساکیت ڈگری کالج تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جو متنازعہ جگہ سے مشکل سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

(2 P.M.) فیض آباد ضلع مجسٹریٹ رابندر ناتھ سری واستو کی طرف سے RAF بٹالین کے کمانڈر کو وائرلیس پیغام موصول ہوا کہ صورت حال قابو میں ہے۔ لہٰذا مزید مرکزی فورسز کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کمانڈروں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ فی الفور فیض آباد لوٹ آئیں تاکہ محفوظ رہ سکیں۔ بٹالین فیض آباد کے لیے کوچ کر گئی۔

(2.55 P.M.) بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہو رہی تھی اور مسجد کا بایاں

گنبد گرادیا گیا۔

(3.05 P.M.) دایاں گنبد بھی منہدم کر دیا گیا۔

(3.15 P.M.) اڈوانی نے لاؤڈ اسپیکر کی آواز سنی کہ کارسیوک اپنے ساتھیوں کو جلد سے جلد کاروائی ختم کرنے کے لئے مشتعل کر رہے تھے اور متنبہ کر رہے تھے کہ کام فی الفور انجام پذیر کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مرکزی فورس پہنچ کر ان کی اس انہدامی کاروائی پر اثر انداز ہو جائے۔

(4.50 P.M.) بابری مسجد کا مرکزی گنبد بھی زمین بوس کر دیا گیا۔

(6.10 P.M.) بابری مسجد کی علامت بھی برقرار نہ تھی سوائے ملبہ کے۔ بابری مسجد مکمل طور پر شہید ہو چکی تھی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

(6.35 P.M.) بابری مسجد کے انہدام کے دوران رام للا کی مورتی مسجد کے اندر سے ہٹالی گئی تھی۔ اب مورتی پھر سے مسجد کے اندر اس جگہ کھڑی کر دی گئی جہاں پر اس سے قبل رکھی گئی تھی۔

(7 to 11 P.M.) سات بجے شام سے گیارہ بجے شب کے درمیان مسجد کی عمارت کے تمام ملبے کو صاف کر دیا گیا اور ہر طرف پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ دریں اثنا مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں پر حملے بھی جاری رکھے گئے۔

(1 A.M.) رات کو ایک بجے رام کی مورتی کو صحیح ڈھنگ سے مسجد کے مقام پر نصب کیا گیا اور اس کے چاروں اطراف میں زعفرانی رنگ کے کپڑے تان دئے گئے۔ یہ کام اشوک سنگھل، ونئے کٹیار، اچاریہ دھرمیندر اور اچاریہ رام دیو کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔

6/دسمبر 1992: پہلی دو FIR بابری مسجد انہدام کے دن ''رام جنم بھومی پولس تھانے'' میں درج کی گئی۔ ایک FIR نہتے کارسیوکوں اور FIR 198 لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، اشوک سنگھل، اور چار دیگر افراد کے خلاف تھی۔ بابری مسجد شہادت کے بعد کلیان سنگھ کی حکومت برخاست اور یو۔ پی۔ میں صدر راج نافذ۔

❖ ❖ ❖

## شہید بابری مسجد 7/دسمبر 1992ء تا 2003

7/دسمبر 1992: پورے ملک میں قتل و غارت گری، لوٹ مار، خون خرابہ کا ایسا طوفان برپا ہوا جس کی نظیر اس سے پہلے ملک کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ اربوں روپے کی املاک تباہ ہو گئیں۔ ہزاروں مسلمانوں کی جانیں گئیں، سیکڑوں مکانات، کارخانے، دکانیں نذرِ آتش کر دی گئیں۔ فسادات کا سلسلہ 20/جنوری 1993 تک جاری رہا۔

اجودھا میں ایک سو سے زائد مسلمانوں کے مکانات اور دکانیں نذرِ آتش کی گئیں۔ 150 مسلمان ''رام جنم بھومی پولیس چوکی'' میں پناہ گزیں اور دن بھر کھانا پانی کے بغیر بھوکے پیاسے رہے۔ صبح میں پانچ فٹ دیوار کی تعمیر بابری مسجد کے اطراف میں مکمل کی گئی۔ سنگھل نے تمام کارسیوکوں کو مزید تباہی سے روکا اور اعلان کیا کہ خاموشی سے اجودھیا سے نکل جائیں۔ اسی دن شام کو تمام کارسیوک اسپیشل ٹرینوں کے ذریعہ اجودھیا سے باہر چلے گئے۔

اسی دن RSS کے سرسنگھ چالک بالا صاحب دیورس نے ڈھانچہ (بابری مسجد) گرائے جانے کو افسوس ناک قرار دیا۔ اڈوانی حزبِ اختلاف کی لیڈر شپ سے مستعفی ہو گئے۔

8/دسمبر 1992: پیراملٹری فورسیز کے چار بٹالین کو متنازعہ اراضی کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس وقت بھی کارسیوا جاری تھی۔ اس دن شام سوا چار بجے کارسیوا مکمل ہو گئی اور سیکورٹی فورسز نے پورے کمپلکس کو اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ دن بھر اسپیشل ٹرین کے ذریعہ کارسیوکوں کو اجودھیا سے باہر جانے کا نظم رکھا گیا۔

رات میں ساڑھے گیارہ بجے اشوک سنگھل اور ونئے کٹیار کو چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ کے حکم سے گرفتار کر کے آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔

10/دسمبر 1992: آر.ایس.ایس.، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، جماعت اسلامی ہند، اور اسلامی سیوک سنگھ (I.S.S.) پر مرکزی حکومت نے پابندی عائد کر دی۔

16/دسمبر 1992: ❖ راجستھان، مدھیہ پردیش اور ہماچل پردیش کی بی.جے.پی حکومت برخواست۔
❖ مرکزی وزارت داخلہ کے ایک آرڈر کے تحت شہید بابری مسجد کے انہدام کی

تفتیش کے لئے لبراہن کمیشن قائم کیا گیا۔

16/دسمبر 1992: ٭ اتر پردیش میں للت پور کے ماتا ٹیلہ میں خصوصی عدالت قائم کی گئی۔
٭ جہاں FIR-198 کے تحت اڈوانی اور دیگر سات افراد کا مقدمہ للت پور کی خصوصی عدالت کو سونپ دیا گیا۔

7/جنوری 1993: مرکزی حکومت نے بابری مسجد سمیت اس سے متصل 67 ایکڑ اراضی اپنی تحویل میں لے لی۔

27/فروری 1993: سی.بی-سی.آئی.ڈی. نے للت پور کی خصوصی عدالت میں FIR-198 میں ایک چارج شیٹ داخل کر کے اڈوانی و دیگر افراد پر دفع 147, 149 (153A، 153B، اور 505 کے علاوہ) کے تحت چارج لگائے گئے۔

## اڈوانی کے خلاف چارج شیٹ (FIR-198)

دفعہ 153 A: مختلف گروہوں کے درمیان مذہبی جھگڑے کو بڑھاوا دینا۔

دفعہ 153B: قومی اتحاد کے خلاف بیان۔ دفعہ 147: دنگا، فساد

دفعہ 149: غیر قانونی میٹنگ، اجتماعی جرم کے لئے ہر شخص قصوروار

دفعہ 505: بیانوں سے لوگوں کو گمراہ کرنا۔

## کارسیوکوں کے خلاف چارج شیٹ (FIR-197)

دفعہ 395: ڈکیتی دفعہ 397: قتل اور شدید زخم پہنچانے کی کوشش کے ساتھ ڈاکا۔

دفعہ 332: سرکاری اہل کاروں کو اپنا فرض نبھانے سے جان بوجھ کر روکنے کی کوشش۔

دفعہ 337: دوسروں کے تحفظ کو خطرے میں ڈال کر نقصان پہنچانا۔

دفعہ 338: دوسروں کے تحفظ کو خطرے میں ڈال کر شدید نقصان پہنچانا۔

6/جون 1993: اتر پردیش سرکار نے FIR-198 کو للت پور سے رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں منتقل کر دیا۔

6/اگست 1993: سپریم کورٹ نے متنازعہ مقام کو جوں کا توں برقرار رکھنے کی ہدایت دی۔

25/اگست 1993: اڈوانی کے معاملے میں سی. بی. آئی نے سی. بی-سی. آئی. ڈی. کی جگہ لی۔

اتر پردیش سرکار نے سی. بی. آئی کو 198-F کی جانچ کی منظوری دی، اسی کے ساتھ CBI کو میڈیا سے منسلک صحافیوں پر حملے کی 47 دیگر FIR کی جانچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حالت میں بھی CBI نے سازش کا الزام عائد نہیں کیا۔

26/اگست 1993: مرکزی حکومت نے CBI کو FIR-198 کی تفتیش کی منظوری دی اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے صحافیوں پر حملے کی 47 دیگر FIR کی تفتیش کی ہدایت کی۔

8/ستمبر 1993: اتر پردیش حکومت نے الہ آباد ہائی کورٹ سے مشورے کے بعد لکھنؤ میں خصوصی عدالت قائم کی۔

10/ستمبر 1993: CBI نے رائے بریلی کی عدالت سے FIR-198 کی تفتیش کی اجازت مانگی جس کی منظوری مل گئی۔

5/اکتوبر 1993: CBI نے پہلی مرتبہ سبھی ملزموں کے خلاف سازش کا معاملہ 120-B لگایا۔ اس نے سبھی 47 معاملوں میں ایک جوائنٹ چارج شیٹ داخل کیا۔

8/اکتوبر 1993: لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں 198/92 میں دیگر ملزمان کو شامل کرانے کے لیے نیا نوٹیفیکیشن جاری کیا۔ اس نوٹیفیکیشن کو بعد میں ہائی کورٹ نے تکنیکی طور پر غلط قرار دیا جس سے اڈوانی کو بچنے کا راستہ مل گیا۔

24/اکتوبر 1994: سپریم کورٹ نے تحویل میں لی گئی 67.703 ایکڑ اراضی کے لیے مرکزی حکومت کو ریسیور مقرر کیا۔

9/ستمبر 1997: خصوصی جج نے CBI سے 47 ملزمان کے خلاف چارج شیٹ داخل کرنے کو کہا۔ ان میں سے 33 ملزمان نے ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ میں از سر نو غور کرنے کی اپیل دائر کی۔ اڈوانی نے کوئی بھی اپیل دائر نہیں کی۔

21/مارچ 1998: الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ نے خصوصی جج جے. پی. شری واستو کو سبھی ملزمین کے خلاف الزام متعین کرنے کی ہدایت دی۔

24/اگست 1998: رام جنم بھومی ٹرسٹ کے صدر پرم ہنس چندر داس نے کہا کہ وہ بابری مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر شروع کرنے کے لیے کسی بھی سیاسی پارٹی یا حکومت سے ہری جھنڈی کے منتظر نہیں۔ پرم ہنس نے کہا کہ مندر کے لیے 54 ستونوں اور فرش کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اب صرف کندہ کاری اور نقش کاری کے مکمل ہونے کا انتظار ہے۔

25/اگست 1999: رام جنم بھومی ٹرسٹ نے پتھروں کو تراشنے کے لیے ورک شاپ کھولا۔

7/دسمبر 1999: وزیر اعظم باجپئی نے لوک سبھا میں مرکزی وزیر داخلہ سمیت تین مرکزی وزراء کے استعفیٰ کے مطالبے کو نامنظور کر دیا۔

21/جون 2000: لبراہن کمیشن نے بابری مسجد کی شہادت کے لیے سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو خاص طور پر ذمہ دار ٹھہرایا۔

3/اکتوبر 2000: کلیان سنگھ نے زیر التوا معاملوں کی منتقلی کے لیے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی۔

6/دسمبر 2000: وزیر اعظم واجپئی نے اجودھیا میں مندر کی تعمیر کو قومی جذبات کا اظہار بتایا۔

12/فروری 2001: ہائی کورٹ نے 33 ملزمان کی اپیل کو قبول کر لیا۔ اور 8/اکتوبر 1993ء کی تکنیکی طور پر غلط نوٹیفکیشن کی بنیاد پر اڈوانی سمیت 8 ملزمان کے خلاف مقدمہ واپس لیا۔

4/مئی 2001: لکھنؤ کی خصوصی عدالت کے جج نے (اڈوانی اور سات دیگر افراد سمیت) 21 ملزمان کے خلاف سنوائی روک کر ایک حکم جاری کیا، بعد میں غلطی کی تصحیح کر لی گئی۔

❖ وجے راج سندھیا کی موت کے سبب اور ایک دیگر ملزم کے اسٹے آرڈر لینے کے بعد عدالت نے 49 میں سے 26 ملزمان کے خلاف چارج شیٹ داخل کرنے کا حکم صادر کیا۔

❖ CBI کی لکھنؤ میں واقع خصوصی عدالت کے جج ایس. کے. شکلا نے کلیان سنگھ سمیت 13 دیگر ملزمان کے خلاف مقدمہ واپس لیا۔ جبکہ سی. بی. آئی نے مشترکہ چارج شیٹ کو دو حصوں میں منقسم کیا۔

جون 2001: CBI نے 4/مئی 2001 کو لکھنؤ کی خصوصی عدالت کے حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست داخل کی۔

24/جولائی 2001: محمد اسلم بھورے نے 12/فروری کے ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں ایک عرضی دائر کی۔

20/اگست 2001: سپریم کورٹ نے اتر پردیش حکومت اور سی. بی. آئی کو محمد اسلم بھورے کی اپیل کے خلاف جوابی حلف نامہ دائر کرنے کو کہا۔

17/اکتوبر 2001: عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وشو ہندو پریشد کے کئی لیڈر متنازعہ مقام تک گئے۔

19/نومبر 2001: صحافی کلدیپ نیر اور دیگر چار افراد نے 21 ملزمان کے خلاف سنوائی روکنے کے خلاف سپریم کورٹ میں عرضی دائر کی۔

10/مارچ 2002: مسئلہ کے حل کے لئے مسلم پرسنل لاء بورڈ نے کانچی کے شنکر آچاریہ کا فارمولہ رد کر دیا۔

11/مارچ 2002: غیر متنازعہ اراضی پر علامتی پوجا کے مسئلہ پر سپریم کورٹ کے فیصلے کو نافذ کرنے کی وزیر اعظم نے یقین دہانی کرائی۔

13/مارچ 2002: متنازعہ اراضی پر کسی بھی قسم کی پوجا کی اجازت دینے سے سپریم کورٹ نے انکار کیا۔

14/مارچ 2002: رام جنم بھومی نیاس کے صدر پرم ہنس رام چندر داس نے بابری مسجد احاطہ میں کسی بھی قیمت پر شلا پوجن کرنے کا دعویٰ کیا۔

15/مارچ 2002: پرم ہنس رام چندر داس نے رام ٹیکری پر مرکز کے نمائندہ کو شلا دان کیا۔

29/جولائی 2002: سپریم کورٹ نے نوٹیفکیشن معاملے میں جواب دینے کے لیے اتر پردیش حکومت کو 8 ہفتوں کا وقت دیا۔

17/ستمبر 2002: یو. پی. کی وزیر اعلیٰ مایاوتی نے نیا نوٹیفکیشن جاری کرنے کو ضروری نہیں سمجھا، اڈوانی سمیت تمام ملزمین کو راحت۔ مایاوتی سرکار نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ

داخل کرنے کو کہا کہ FIR 198/92 رائے بریلی میں واقع سی. بی آئی کی عدالت میں اُٹھایا جا سکتا ہے۔

22رستمبر 2002: مایاوتی کا نئے نوٹیفیکیشن سے انکار۔ کہا کہ رائے بریلی کی عدالت ہی سنوائی کی اہل ہے۔

29رنومبر 2002: سپریم کورٹ نے کہا کہ FIR-198 پر سنوائی رائے بریلی کی عدالت میں ہوگی اور مایاوتی کی دلیل کو درست قرار دیا۔

22رجنوری 2003: لبراہن کمیشن نے گواہی درج کرنے کا کام مکمل کیا۔

5رفروری 2003: مرکزی حکومت نے سپریم کورٹ میں عرضی دی کہ ایکوائر شدہ اراضی پر مذہبی رسومات ادا کرنے کی پابندی ختم کی جائے۔

5رمارچ 2003: الہ آباد ہائی کورٹ نے متنازعہ مقام کی اصلیت جاننے کے لئے بابری مسجد کے نیچے کھدائی کا حکم دیا۔

12رمارچ 2003: محکمہ آثار قدیمہ (A.S.I.) کے ذریعہ کھدائی کا کام شروع کیا گیا۔

12رمئی 2003: مرکزی حکومت نے لبراہن کمیشن کے سامنے دعویٰ کیا کہ اجودھیا میں واقع (متنازعہ) مقام ہی شری رام کی جائے پیدائش ہے۔

13رمئی 2003: خصوصی عدالت نے بابری مسجد انہدام مقدمے کی تفتیش سے متعلق رپورٹ اور دستاویزات 31رمئی کو عدالت میں پیش کرنے کی ہدایت دی۔ عدالت نے اڈوانی سمیت 8 ملزمین کو ذاتی پیشی سے بھی مستثنیٰ قرار دیا۔

31رمئی 2003: سی. بی. آئی. نے اڈوانی اور سات دیگر افراد کے خلاف ضمنی چارج شیٹ داخل کی۔

1راگست 2003: وزیر اعظم واجپئی نے کہا کہ پرم ہنس رام چندر داس کی آخری خواہش پوری کی جائے گی۔

3راگست 2003: واجپئی نے کہا کہ اجودھیا معاملے میں حکومت اپنے موقف پر قائم ہے۔ ہم رام مندر کی تعمیر سب کے تعاون اور اشتراک سے چاہتے ہیں۔

22/اگست 2003: محکمہ آثارِ قدیمہ نے عدالت میں کھدائی کی رپورٹ سونپی۔

28/اگست 2003: مایاوتی نے کہا کہ بابری مسجد مقدمات ختم کرنے کا ان پر شدید دباؤ تھا۔

29/اگست 2003: ملائم سنگھ یادو نے کہا کہ اجودھیا مقدمہ میں سرکار قانون کے تحت کاروائی کرے گی۔

1/ستمبر 2003: سپریم کورٹ نے رائے بریلی عدالت میں جاری بابری مسجد انہدام مقدمہ کی سماعت پر روک لگانے سے انکار کردیا۔

3/ستمبر 2003: رائے بریلی میں سی.بی.آئی. کی خصوصی عدالت نے اڈوانی اور سات دیگر افراد کے خلاف الزام طے کرنے سے متعلق اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔

12/ستمبر 2003: رائے بریلی کی عدالت نے کہا کہ بابری مسجد انہدام کے مقدمہ میں فرد جرم طے کرنے کا فیصلہ 19/ستمبر کو سنایا جائے گا۔

19/ستمبر 2003: رائے بریلی کی عدالت نے اڈوانی کو بری کر دیا لیکن 7 لیڈروں (مرلی منوہر جوشی، اشوک سنگھل، اوما بھارتی، سادھوی رتمبھرا، گری راج کشور، وشنو ہری ڈالمیا اور ونئے کٹیار) کے خلاف فرد جرم طے کرنے کے لیے سی.بی.آئی کو ہدایت کی۔

15/اکتوبر 2003: اتر پردیش کی سابقہ بھاجپا حکومت کے مقرر کردہ اسٹینڈنگ کونسل آر.ایس. ترپاٹھی جو بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں ریاستی حکومت کی جانب سے پیروی کرتے تھے کو ریاستی ایڈووکیٹ جنرل ویریندر بھاٹیہ نے یہاں سے ہٹایا۔ ان کی جگہ اسٹینڈنگ کونسل ایس.پی. سریواستو کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔



# ترتیب

بابری مسجد: شہادت سے قبل ـــ شہادت کے بعد

## باب: 6 وشو ہندو پریشد (VHP) کے عزائم



## باب: 7 شہید بابری مسجد: موجودہ صورت حال

باب: 8 موجودہ حالات میں

مسلمانانِ ہند کے لیے راہِ عمل 

باب: 9 دستاویزات (Documents)

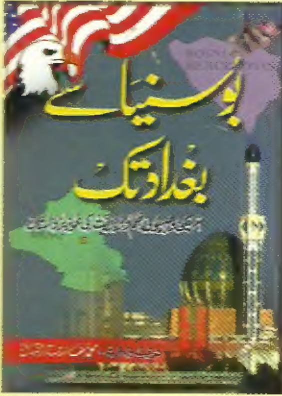
**تمت بالخیر**

## فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ کی چند تازہ مطبوعات

امریکی وصہیونی ظلم وبربریت کی خونریز داستان اور عراق کی مستند تاریخ

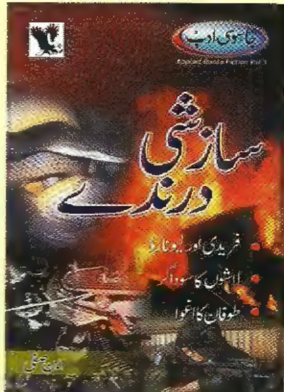



P.268 Price: Rs.67.00

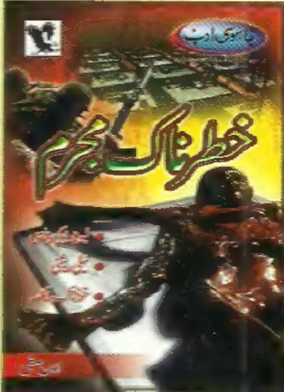



P.168 Price: Rs.45.00

- امریکہ کا حقیقی چہرہ کیا ہے؟
- صہیونیت عالم انسانیت کو کس طرح غلام بنا رہی ہے؟
- عراقی صدر صدام حسین کا اصل جرم کیا ہے؟
- موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟
- بوسنیا کے مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کیوں اور کس طرح کی گئی؟




P.224 H.bound Rs.56.00




P.240 H.bound Rs.60.00

عظیم مصنف ـــ معیاری تحریر ـــ باوقار انداز

ابن صفی کی شاہکار تحریروں کا نادر انتخاب

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

Rs.100/- **FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.**

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi - 2
Phones : 3289786, 3289159 Fax : 3279998 Res.: 3262486
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Websites : faridexport.com, faridbook.com

Designed by : A. FAHAD